نیلا موسم



سعدیہ امل کاشف

نا تجربہ کار رائٹر کو ''نیلا موسم'' لکھنے کا حوصلہ دیا اور میں شکر گزار ہوں اپنے قارئین کی جنہوں نے میرے ہر افسانے اور ہر کہانی کو گہرائی تک پڑھا اور سراہا۔ اپنی پہلی کتاب ''خواب دریچے'' میں مَیں نے کوئی پیش لفظ نہیں لکھا تھا، میں خاموش تھی لیکن آج میں بول پڑی ہوں۔ کیونکہ پہلی کتاب سے مجھے جو محبت اور جو عزت میرے قارئین نے دی، اس نے مجھے بہت حوصلہ اور اعتماد دیا......اور اسی حوصلے اور اعتماد نے مجھ سے ''نیلا موسم'' لکھوایا۔

میں دُور دُور تک بھی دیکھوں تو مجھے اس سوال کا جواب نہیں ملتا کہ میرے اندر لکھنے کا بیج کس نے اور کب بویا تھا......؟ مجھے پتہ ہی نہ لگا کہ یہ بیج کب ایک گھنا اور سایہ دار شجر بن گیا اور اس نے مجھے چھاؤں اور پناہ دینی شروع کی۔ میرے والد نے لکھا، شاعری کی، میرے ماموں نے لکھا، میری پھپھو افسانہ نگار رہیں لیکن میں سمجھتی ہوں کہ لکھنے کے یہ جراثیم صرف موروثی نہیں ہوتے۔ وقت کے جھکڑ، حالات کی آندھیاں، رویوں میں بدلاؤ اور زندگی کے طوفان لکھنا سکھاتے ہیں۔ رائٹر وہ بنتا ہے جو حالات کی کنڈیشننگ کی بھٹی میں پگھلتا اور ڈھلتا ہے، حالات سے پچھاڑ کھاتا اور پھر بھی شکست تسلیم کرنے کی بجائے ہمت سے اٹھ کے اپنے سچ کا علم بلند کرتا ہے۔

ہم صبح پرستوں کی یہ ریت پرانی ہے
ہاتھوں میں قلم رکھنا، یا ہاتھ قلم رکھنا

مجھے میرے والد نے کھلونا تھمانے کی بجائے کتاب تھمائی...... مجھے میری دادی نے سکھایا کہ چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی چیز فقط اللہ ہی کی ذات دے سکتی ہے......اور آج اپنی عمر کے اس موڑ پہ کھڑی ہو کے میں دیکھتی ہوں کہ میرا زادِ راہ اگر کوئی ہے تو وہ میرا خدا ہے، یا میری کتاب...... میں نے دوستی کی ہے تو ان دونوں سے کی ہے اور انہی دونوں نے مجھے لکھنا سکھایا، مجھے قوت دی، عزت دی اور کامرانی دی۔

میں جو لکھتی ہوں وہ میں خود نہیں لکھتی، کوئی مجھ سے لکھواتا ہے...... وہ بعض اوقات میرے اندر اس وقت بھی بیدار ہو جاتا ہے جب میں لکھنا نہیں چاہتی لیکن وہ مجھ سے لکھوا لیتا ہے، میں چاہ کر بھی اسے دھوکا نہیں دے سکتی کیونکہ اب وہ میری روح میں مجھ سے بھی زیادہ واضح ہے، گہرا ہے......!

''نیلا موسم'' انسان کے اندر بسنے والے جذبات کی کہانی ہے، روح کے اندر غل مچاتی محبت کی کہانی ہے، دوستوں کے دشمن بن جانے اور قدرت کی مہربانیوں کی کہانی ہے۔ ''نیلا موسم'' فطرت کی کہانی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ فطرت اور محبت کی یہ کہانی آپ کو ضرور پسند آئے گی۔

نیلا موسم...... وہ محبت ہے...... جو کٹتی ہے، گرتی ہے، مرتی ہے، جھلتی ہے، روندی جاتی ہے......
......اس کا سر ہمیشہ اُٹھا رہتا ہے۔

سعدیہ امل کاشف

محبت نیلا موسم ہے
محبت سرخ آندھی ہے
محبت ان کھلی کونپل ہے
اور یہ شوخ تتلی ہے
نظر میں خواب بوتی ہے
وفاؤں کو پروتی ہے
تخیل کے ستارے ٹانک کے بے چین رکھتی ہے
سمے سے چھین کے سانسیں بہت دیوانہ کرتی ہے
سلگتے دشت کی ریت سا دل ہے اور
یہ میٹھی سی رم جھم ہے
محبت نیلا موسم ہے!!

''تم نے کبھی محبت کی ہے؟'' عادل بھائی نے بیٹھے بیٹھے ہی اس سے پوچھا تھا اور کتابوں کو جھاڑتے ہوئے اس کے ہاتھ تھم گئے تھے۔ چہرے پر ایک پُرسکون مسکراہٹ در آئی تھی۔ آنکھوں میں اِک چمک کوندی تھی جو عادل بھائی کو اس کے سنہرے فریم والے چشمے کے باہر سے بھی نظر آ گئی تھی۔

''بولو نا......کی ہے کبھی؟'' عادل نے دہرایا۔

''استغفر اللہ۔ کیوں تم ایک پرہیزگار بندے کو ان چکروں میں پھنسانے کے درپے ہو؟ کچھ اللہ رسولؐ کا خوف ہی کر لو۔'' حافظ نے عادل کو ٹوکا۔

''ابے او ہری پگڑی! مجھے اس طرح بار بار ٹوکنے کی یا مجھ پہ اپنا دین جھاڑنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مجھے جو کہنا کرنا ہوگا، وہ میں کر لوں گا۔'' عادل کو غصہ آ گیا۔

''ایمان نہ ہو تو دین کا سبق دینے کا بھی کوئی فائدہ نہیں۔'' حافظ کی مولویانہ رگ پھڑکی۔

''ہاں، ہاں...... دین ایمان کے رکھوالے تو فقط تم مولوی ہوتے ہو نا۔ باقی تو پوری دنیا بے دین ہے، بے ایمان ہے۔'' عادل نے برجستہ کہا۔

''تو مولوی دین کے رکھوالے نہیں تو کیا تم لوگ ہو؟ کون ہیں جو سردیوں کی ٹھٹھرتی صبحوں کو اُٹھ کر مسجد میں اذان دیتے ہیں۔ کون ہیں جو قرآن و حدیث کو مفہوم دے کر عام آدمی کے لئے آگہی کے درواکرتے ہیں۔ اگر یہ مولوی نہ ہوں تو دین کی تبلیغ کا رواج ہی ختم ہو جائے۔ تم لوگوں کا یہ عالم ہے کہ کلمہ پڑھنے والی قوم ''چھیاں چھیاں'' گاتی ہے۔'' حافظ صاحب نے عادل کی سلگتی جلتی رگ پہ ہاتھ رکھا۔ وہ گانے کا بے حد شوقین تھا اور باتھ روم کی تو شامت آتی تھی اس کے گھستے ہی۔

''دیکھ مولوی! تُو باز نہیں آئے گا اپنی حرکتوں سے؟'' عادل آستین اُلٹا کے اس کی طرف آنے لگا۔ مولوی بھی اُٹھ کھڑا ہوا اور رہ گیا شائل تو وہ خاموشی سے ان کی لڑائی دیکھ رہا تھا۔

''یار عادل! کیا کر رہے ہو؟...... جانے دو نا۔'' اس نے عادل کو پکڑا۔

''حافظ بھائی! جائیں، آپ کی نماز کا وقت ہو رہا ہے۔'' شائل نے حافظ کو کہا۔

''سمجھا دو اسے شائل! یہ اس طرح اُلجھا نہ کرے۔ نیک بندوں کی بددعا بہت بری ہوتی ہے۔'' حافظ غرایا۔

''ابے او نیک بندے! دے دے جو بددعا دینی ہے...... میں انتظار کروں گا اس کے پورے ہونے کی۔ تیری نیکیاں آزمانے کی خاطر۔'' عادل نے شائل کے بازوؤں کو جھٹکا۔

''اللہ کرے تیرے جتنے بچے پیدا ہوں، ان کی بڑی بڑی داڑھیاں ہوں۔ سارے کے سارے مولوی ہوں۔'' حافظ نے بے اختیار کہا اور شائل اپنی ہنسی ضبط نہیں کر پایا اور کھلکھلا کر ہنس دیا۔ عادل بھی مسکرانے لگا اور حافظ خاموشی سے فلیٹ کا دروازہ کھول کے نکل گیا۔

''ایسا بھی کیا لطیفہ سن لیا ہے بھائی! کہ دانت اندر نہیں ہو رہے؟'' عادل نے کہا۔

''ایک تو یار! تم دونوں کی لڑائی ہوتی بڑی مزے دار ہے۔ اسے ریکارڈ کر کے ٹی وی پہ چلا دو تو کیا تفریح مل جائے گی لوگوں کو۔ مولوی بمقابلہ مائیکل جیکسن۔'' شائل نے بمشکل ہنسی روک کر کہا۔

''ٹانگ گھسانے کا شوق اسی کو ہے۔ کیا میں اتنی دلچسپ بات کر رہا تھا اور کیا اس نے موضوع شروع کر دیا۔ سالا ہری پگڑی۔'' عادل نے غصے میں کہا۔

''پوچھ، کیا پوچھ رہا تھا؟'' شائل اسے کول ڈاؤن کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''تم سے محبت کے متعلق پوچھ رہا تھا۔ کبھی کی ہے؟ کوئی تجربہ، کوئی ٹپ کچھ تو ہوگا تیرے پاس دینے کے لئے۔'' عادل پلٹ کر موضوع تک آیا۔

''مجھ سے کیا پوچھتا ہے۔ میرا تو کوئی تجربہ بھی نہیں۔ کتابیں، فلمیں بھری پڑی ہیں اس دنیا میں محبت کے موضوعات پر۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں؟'' شائل نے بات ختم کرنی چاہی۔

''جان مت چھڑاؤ یار! شاعر ہو اتنے بڑے۔ تمہیں اس آفاقی جذبے کا علم نہیں ہوگا تو اور کسے ہوگا؟'' عادل نے اسے چاروں طرف سے ٹریپ کرنے کی کوشش کی۔

''آفاقی ہے یا زمینی، فرشی ہے یا خلائی، مجھے اس کے بارے میں کوئی علم نہیں۔ کتابیں کھولو، شاعر کہتے نظر آئیں گے محبت اوس کی صورت، خواب، درد آب، ابر کی صورت، محبت کانچ کی گڑیا، محبت جنگلوں میں رقص کرتی مورنی کا تن، محبت روح کی ٹھنڈک، محبت دل، محبت جاں، وغیرہ وغیرہ۔ دوسری طرف کچھ شعراء ایسے بھی ہیں جو اسے بلا، عذابِ جاں اور آگ کا دریا کے نام سے دہراتے ہیں۔ اس سے زیادہ مجھے علم نہیں۔'' شائل نے تفصیل سنا کے اسے آمادہ کرنا چاہا۔

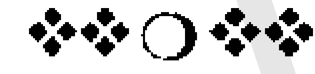
''کیا تمہیں واقعی کسی سے محبت نہیں ہوئی؟'' عادل اب بھی بدگمان تھا۔

''ہوئی تھی دو بار۔ مگر ناکام ہوگئی۔'' شائل مسکرایا۔

''کس سے ہوئی تھی؟'' عادل نے حیرت سے کہا۔

''خالدہ ریاست اور بشریٰ انصاری سے۔ تب جب کہ میں فقط نو دس سال کا تھا۔ اور ناکام اس لئے ہوگئی کہ کامیابی کا کوئی امکان ہی نہ تھا۔ یکطرفہ محبت تھی۔'' شائل کی مسکراہٹ اور گہری ہوگئی۔

"بالکل بیکار بندہ ہے تُو.......محبت کی نظمیں اور دیوان تو لکھ سکتا ہے مگر محبت کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ بھاڑ میں جاؤ۔" عادل نے سگریٹ کا پیکٹ اُٹھایا اور بالکنی کا رُخ کیا۔

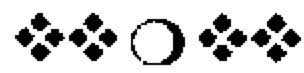


اس کی یونیورسٹی میں آرکیٹکچر کی پہلی کلاس تھی۔ یوں بھی وہ بچوں کی تیاری کی وجہ سے پہلے ہی بہت لیٹ ہو گئی تھی۔ عاشر تو پھر بڑا تھا، اپنا بیگ وغیرہ بھی بنا لیتا تھا اور کپڑے بھی پہن لیتا تھا۔ لیکن ضحیٰ ابھی صرف پانچ سال کی تھی۔ اس کی تو تمام کی تمام تیاری کروانی پڑتی۔ کپڑے پہنانے سے لے کر پونیاں باندھنے تک، بیگ بنانے سے لے کر جوتے پہنانے تک۔ اور پھر انہیں سکول چھوڑنے کے بعد وہ سیدھا یونیورسٹی آئی تھی۔

یہاں وہ بطور لیکچرار اپوائنٹ ہوئی تھی۔ اس کے پاس آرکیٹکچر کی ڈگری اور معقول تجربہ بھی تھا۔ "این سی اے" لاہور سے گریجویشن کیا تھا۔ کچھ سال پی آئی اے میں بطور انٹیریئر ڈیکوریٹر کام کر چکی تھی لیکن انتہائی ٹف شیڈول کے باعث بچے اگنور ہو رہے تھے، بچے بھی وہ جن کا آگے پیچھے کوئی نہ ہو۔ نہ دادی، نانی اور نہ باپ۔ لے دے کے فقط ماں ہی ہو۔ ایسے میں ماں کا کردار اور ایکشن میں آ جاتا ہے۔ وہ بیک وقت دادی، نانی، باپ اور باقی تمام رشتوں کو نبھانے لگ جاتی ہے فقط اپنے بچوں کو احساسِ محرومی سے بچائے رکھنے کے لئے۔

گھر میں فقط ایک عالیہ پھپھو ہی تھیں جو اس کی سگی پھپھو تھیں اور شوہر کی وفات کے بعد اپنی بھتیجی کے گھر شفٹ ہو گئی تھیں۔ ابھی ان کی بیوگی کا دکھ وہ پوری طرح بٹا بھی نہ پائی تھی کہ عامر کی روڈ ایکسیڈنٹ میں ڈیتھ ہو گئی اور عالیہ پھپھو کی اٹھائیس سالہ پیاری سی بھتیجی ماہا عامر اپنی شادی کے فقط چار سال بعد بیوہ ہو گئی۔ تین برس کی ضحیٰ اور گیارہ سال کا عاشر اس کے سامنے تھے۔ زندگی اس کے لئے کٹھن بن گئی تھی لیکن اسے ان بچوں کی خاطر زندگی کو آسان بنانا تھا۔ اپنی کٹھنائیوں کو فراموش کر کے زندہ رہنا تھا۔ ضحیٰ تو اس کی اپنی بچی تھی لیکن عاشر بھی اسے ضحیٰ سے کم عزیز نہ تھا۔ عاشر عامر کا بیٹا تھا، اس کی پہلی بیوی فاطمہ سے جس کی عاشر کی پیدائش کے وقت وفات ہو

گئی تھی اور کئی سال تنہا رہنے کے بعد عامر نے ماہا کا انتخاب کیا۔ ماہا کو اس نے ایک بزنس میٹنگ کے دوران دیکھا تھا۔ وہ اس سے اپنی فرم کی بلڈنگ ڈیزائن کروانے کے لئے ملے تھے اور ماہا کی شخصیت نے پہلی نظر میں ہی ان کے دل کو اپنا اسیر بنا لیا اور انہوں نے ماہا کو پرپوز کر دیا۔ اس کے پاس انکار کا کوئی جواز نہ تھا، سو وہ خاموشی سے عامر کی بیوی اور عاشر کی ماں بن کے آ گئی۔



"گڈ مارننگ کلاس!" اس نے کلاس میں داخل ہوتے ہی کہا اور سنہرے فریم والے چشمے سے سبھی کو دیکھا۔ کچھ لڑکے، کچھ لڑکیاں خوش گپیوں سے فارغ ہو کر اس کی جانب دیکھنے لگے۔

"میں آپ کی نئی لیکچرار ہوں، ماہا عامر۔" اس نے مختصراً اپنا تعارف کروایا۔

"آپ سر آفندی کی جگہ پر آئی ہیں میم؟" ایک گوری رنگت والی لڑکی نے پوچھا۔

"مجھے ان صاحب کے متعلق علم نہیں البتہ میں آرکیٹکچر میں گریجویشن کر چکی ہوں این سی اے سے۔ کچھ سال قومی ایئر لائن کے لئے کام کیا۔ تھوڑا سا ٹیچنگ ایکسپیرینس بھی ہے اور اب مزید ہو گا۔ پڑھائی شروع کرنے سے قبل اب آپ لوگ اپنے متعلق بتا دیں۔ آئی مین یور انٹروڈکشن۔" وہ بولی۔

پہلی نشست سے شروعات ہوئی۔

"عمارہ!" ایک بولی۔

"سہیل، سرفراز، معظم، عابد، ثانیہ، سمانہ، عتیقہ، شمائل۔" اس نام پر اُس کی نظر لمحہ بھر کو اُٹھی۔ اس نام کے بعد بھی کچھ اور نام فضا میں گونجے اور تحلیل ہوئے مگر وہ اس ایک نام پر اٹک سی گئی تھی۔

دل کے اندر دھڑکنوں کا اِک شور سنائی دینے لگا تھا۔

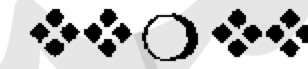
مرے ساتھی!
مری یہ روح میرے جسم سے پرواز کر جائے
تو لوٹ آنا
میرے بے خواب راتوں کے عذابوں پر

سسکتے شہر میں تم بھی
ذرا سی دیر کو رکنا
میرے بے نور ہونٹوں کی دعاؤں پر
تم اپنی سرد پیشانی کا پتھر رکھ کے رو دینا
بس اتنی بات کہہ دینا
مجھے تم سے محبت ہے

اس کے ذہن میں کئی دھماکے ہونے لگے۔ وہ کلاس میں کنسنٹریٹ نہ کر پا رہی تھی۔ آنکھوں کے سامنے وہ چہرہ آ رہا تھا اور اِک نام سماعتوں میں گونج کر شہرِ دل کے سناٹے میں شائیں شائیں کر رہا تھا۔

''میرا نام شائل مبین ہے۔ میں فرسٹ ایئر آرکیٹیکچر کا اسٹوڈنٹ ہوں۔ مجھے اپنے ڈیپارٹمنٹ کے متعلق پوچھنا تھا۔ میرا نام شائل مبین ہے۔ شائل مبین!''

یہی ایک آواز یادوں کے اندر گونج گونج کے اُسے بے قرار کر رہی تھی۔ وہ بار بار اپنی نظر کتاب پہ جماتی مگر آنکھیں بار بار اس تئیس چوبیس سالہ لڑکے کی جانب اُٹھ رہی تھیں جس کا نام بھی شائل تھا۔



''اچھی سی چائے پینے کا دل کر رہا ہے پھپھو! پلیز آپ خود بنا دیں۔ سر بھی بے حد دکھ رہا ہے۔ سلمٰی سے مت کہیۓ گا بنانے کے لئے۔''

بالوں کو کیچر میں قید کرتی ڈھیلے ڈھالے شلوار سوٹ میں وہ لاؤنج میں آئی تھی اور عالیہ پھپھو سے فرمائش کر ڈالی۔

''اتنا کام جو کرتی ہو۔ تھکو گی نہیں تو اور کیا ہو گا؟ چلو، میرا بھی دل کر رہا تھا چائے پینے کا۔ ابھی بنا کے لاتی ہوں۔'' وہ اٹھیں۔

''عاشر اور ضحیٰ کہاں ہیں پھپھو؟'' وہ بولی۔

''عاشر تو اپنے دوستوں کے ساتھ کرکٹ کھیلنے گیا ہے اور ضحیٰ ابھی سو رہی ہے۔'' انہوں نے جاتے جاتے مطلع کیا۔

''اس وقت تک سو رہی ہے؟ ابھی تو مغرب ہو رہی ہے۔''

''ارے ابھی پندرہ بیس منٹ پہلے سوئی ہے۔ ساری دوپہر ضد کر کے کارٹون دیکھے۔''

'روٹین بھی تو ٹف ہے آج کل کے بچوں کی۔ صبح اسکول، پھر قاری صاحب، پھر ٹیوشن، رات کو ہوم ورک۔ کہاں ہے انہیں سونے کا بھی وافر وقت۔' وہ سوچتی ضحیٰ کے بیڈروم تک آئی۔ معصوم سے چہرے والی اپنی بیٹی پہ اسے ٹوٹ کے پیار آیا۔ اس نے اس کے براؤن بالوں کو سنوارا، اس کے پھولے پھولے گال پر پیار کیا اور واپس لاؤنج میں آ گئی۔ ابھی میگزین اٹھایا ہی تھا کہ پھپھو چائے لے کے آ گئیں۔

''ماہا! میں تو یہ بتانا بھول گئی کہ میں پڑوس کے خالد صاحب کے گھر جا رہی تھی۔ ان کی والدہ بیمار ہیں، عیادت کے لئے جانا ہے۔ چائے میں آ کے پی لوں گی۔ تم پی لو۔ ابھی آ جاتی ہوں میں۔'' پھپھو نے کہا۔

وہ چائے کا مگ اٹھاتی باہر ٹیرس میں آ گئی۔ مغرب کے وقت کا آسمان تھا۔ نیلا نیلا، ملگجی سے آسمان پہ ستارے نظر آنے شروع ہو گئے تھے۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی یادوں کی دلدل میں پاؤں رکھنے لگ گئی تھی۔

شائل مبین اس کی پہلی محبت تھا۔ جوانی کے ترو تازہ شگفتہ دنوں کی پہلی محبت کہ جب تتلیوں کے پروں پہ گیت لکھنا اچھا لگتا ہے۔ کہ جب ستاروں کو گنتے گنتے راتوں کا گزارنا دل کو بھاتا ہے۔ جب نظمیں آپوں آپ دل کی وادی میں گونجتی محسوس ہوتی ہیں۔ انہی بہاروں جیسے دنوں کی پہلی اور ترو تازہ محبت!

دونوں کے اسٹارز مشترک تھے۔ عمر ایک تھی۔ دونوں خوبصورت تھے۔ نٹ کھٹ سے جذبے دلوں میں زندہ ہو گئے اور دونوں کی انڈر اسٹینڈنگ انتہا کو پہنچ گئی۔ کالج کے ڈرامے ہوں، ڈیبیٹ کے مقابلے ہوں، بیت بازی ہو یا پھر کوئی کھیل۔ یہ دونوں ساتھ ساتھ حصہ لیتے اور دونوں میں سے کوئی ایک تو یقیناً جیت جاتا۔ ان کا کپل ہر جگہ اکٹھا ہوتا۔ کلاس میں بھی یہ دونوں آگے آگے رہتے۔ ہر لیکچر، ہر امتحان میں نمایاں ہوتے اور اگر ماہا یا شائل الگ ہوتے تو دوسرے ان کے متعلق بھی سبھی پوچھتے کہ وہ کہاں ہے؟ اور پھر پڑھائی کے دوران ہی شائل نے اپنے گھر والوں کو کنونس کر کے ماہا کے گھر رشتے کے لئے بھیجا۔

ماہا کے لئے ان دنوں رشتوں کی کمی نہ تھی۔ اور پھر باقی رشتے شائل کے مقابلے میں اسٹرانگ تھے۔ شائل ایک متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والالڑکا تھا جس کی تعلیم کے اخراجات اس کے ماموں اٹھاتے تھے۔ والدین کی وفات کے بعد وہ اپنی بہن اور بھائی کے ساتھ ماموں کے گھر رہتا تھا۔

ابو نے صاف اور واضح الفاظ میں شائل کے رشتے کے لئے انکار کر دیا۔ انہیں اپنی بیٹی کا مستقبل کسی محفوظ ہاتھ میں دینا تھا اور شائل قطعی طور پر غیر محفوظ تھا۔

اس انکار کے بعد شائل بری طرح سے دل برداشتہ ہوگیا۔ کئی دن تو وہ ماہا سے بولا تک نہیں اور ماہا اسے مناتی رہی یہ کہہ کے کہ وہ ابھی اس رشتے کی خاطر اسٹینڈ نہیں لے سکتی۔ کیونکہ اس وقت کی تعلیم اس کے لئے ضروری ہے۔ اور اسے یقین تھا کہ ابا جی اس کی تعلیم ختم ہونے سے قبل اس کی شادی نہیں کریں گے۔ لہٰذا وہ خوفزدہ، حراساں اور پریشان ہونے کی بجائے مطمئن تھی اور اس طرح دونوں نے محبت کے نئے وعدے کیے، مستقبل کے نئے خواب بُنے اور دوبارہ سے پڑھائی کی جانب متوجہ ہوئے۔

لیکن ان وعدوں اور خوابوں کی عمر زیادہ نہ تھی۔ انہیں بہت ہی جلد ٹوٹنا پڑا۔ ایک دن شائل نے خود اسے آ کے بتایا کہ اس نے اپنے ماموں کی بیٹی فائزہ سے شادی کر لی ہے۔ ماموں نے اپنی تمام پراپرٹی اپنی اکلوتی بیٹی فائزہ کے نام کی تھی اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ کہیں غیر گھر میں جائے۔ لہٰذا شائل کو حامی بھرنی پڑی اور پھر ماموں کے احسانات تلے وہ دبا ہوا ہی تو تھا۔

ماہا کی تو دنیا ہی لٹ گئی۔ وہ لمحوں میں محبت کی بلندیوں سے پستیوں میں جا گری۔ شائل نے اس کے بعد کالج چھوڑ دیا اور اس کے ساتھ ہر رشتہ توڑ لیا۔

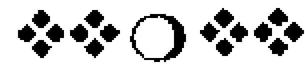
وہ فیصلہ ہی نہ کر پائی تھی کہ وہ مجبور تھا یا بے وفا۔ سفاک تھا یا بے بس۔ اس کا انتظار کرنا اس کے لئے مشکل تھا یا اس پہ یقین کرنا۔ عہد و پیاں توڑ دینا اس کے لئے آسان تھا یا اسے بھلا دینا۔ وہ ٹوٹ رہی تھی۔ ایک مہینے تک وہ اس کے لئے آنسو بہاتی رہی۔ لیکن اس کے بعد اس نے خود کو سنبھال لیا، یہ یقین دلا کر کہ اس نے وقت گزاری کے لئے محبت کا ڈرامہ رچایا تھا اور اس بات کے یقین کے بعد وہ موجودہ دنیا

کی طرف با آسانی پلٹ آئی۔

بے وفائی کسی کی ذات کو منتشر کر دیتی ہے تو کسی کی منتشر ذات کو سمیٹ لیتی ہے۔

اس نے اپنی ذات کو سمیٹ لیا۔

بڑے اچھے نمبروں میں اس نے اپنی ڈگری مکمل کی۔ باپ کی وفات کے بعد وہ تنہا رہ گئی تھی مگر اس نے کام کرنا شروع کیا، اپنی زندگی کو ایک رول ماڈل بنانا چاہا۔ اور پھر انہی دنوں میں اسے عامر عقیل ملے۔ اسے واقعی کسی مضبوط مرد کا سہارا درکار تھا۔ وہ اندر سے اس قدر ٹوٹ گئی تھی کہ کسی درخت کی گھنی چھاؤں تلے رہنا چاہتی تھی اور یہ چھاؤں اسے عامر کی صورت میں میسر آ گئی تھی۔ مگر بہت مختصر عرصے کے لئے۔ اور اب وہ ایک بار پھر اکیلی تھی۔ تن تنہا، یکتا۔



''ایکسکیوز می میم!''

کلاس کے اختتام پر وہ باہر نکل رہی تھی کہ اسے پیچھے سے کسی نے پکارا۔ اس نے مڑ کے دیکھا، وہ شائل علی تھا۔ وہی شائل علی جس کے نام نے اس دن دل میں اتھل پتھل مچا دی تھی۔ گوری دودھیا رنگت، کشادہ پیشانی، گھنگھریالے بال، چھوٹی سی آنکھوں پہ سنہری فریم والا چشمہ اور دل آویز مسکراہٹ۔

''یس۔'' وہ بھی مسکرا دی۔

''میم! آپ سے ایک بات پوچھنی تھی۔'' وہ بولا۔

''پوچھیں۔''

''ابھی آپ نے جو گراف پیٹرن بورڈ پہ بنوایا اسی کے متعلق کچھ کنفیوژن ہے۔'' شائل نے نوٹ بک نکالی۔

''ایسا کریں شائل! میں لائبریری کی طرف جا رہی ہوں۔ آپ بھی وہیں آ جائیں۔ میں پورا گراف ریپیٹ کروا دوں گی۔'' اس نے حل نکالا۔

''او کے میم!'' وہ اثبات میں سر ہلا کے مسکرا دیا اور پھر وہ لائبریری میں اس کے روبرو تھا۔ ٹیبل پہ نوٹ بک پہ اس نے پورا کا پورا گراف بنا لیا تھا اور کچھ پوائنٹس سمجھنا پا رہا تھا۔ ماہا نے اسے پندرہ منٹ تک تمام کے تمام پوائنٹس سمجھا دیئے۔

"تھینکس میم! آپ کو تکلیف دی۔ اصل میں آفندی صاحب سے بھی اسی طرح پوچھا کرتا تھا۔ انہوں نے ہی میری عادت خراب کر رکھی ہے۔ پچھلے سمسٹر میں جو پوزیشن حاصل کی ہے، اسے برقرار رکھنا چاہتا ہوں۔ اس لئے کافی ٹینشن ہے۔ یو نو میڈم! کسی بھی پوزیشن کو حاصل کرنا اتنا مشکل نہیں ہوتا جتنا اس پہ برقرار رہنا، اسے مینٹین رکھنا ہوتا ہے۔" شمائل نے بڑے سمجھ دار اسٹائل میں کہا۔

"اوہ، تو آپ پوزیشن ہولڈر ہیں۔" اس نے متاثر کن لہجہ اپنایا۔

"جی۔ کلاس میں تو لڑکیاں بولنے نہیں دیتیں۔ کچھ بھی کہو تو اُلٹے سیدھے جواب مار کے چپ کرا دیتی ہیں۔ اور یوں بھی عتیقہ، ثمانہ اور ثانیہ نے آپ کا امیج بہت روڈ قسم کی پروفیسر کا بنایا ہے جو بہت پھولن دیوی ٹائپ کی لیڈی ہوتی ہے۔"

شمائل کے کہنے پر وہ کھلکھلا کے ہنس دی۔

"پھولن دیوی ٹائپ۔ ارے میں اتنی خطرناک ہوں کیا؟"

"مجھے تو بالکل نہیں لگتیں۔ ان کو لگتی ہوں گی۔ لڑکیاں تو یوں بھی پاگل ہوتی ہیں۔ بے سروپا باتیں کرنے والی۔ اپنے خوابوں اور خوشیوں کے پیچھے آسمان کو زمین پہ لا کھڑا کر دینے والی۔ ٹوٹلی اسٹوپڈ۔" اس نے اپنی سرخ ناک سکیڑ کے کہا۔

"بڑی معلومات ہے لڑکیوں کے متعلق۔" وہ قائل ہوئی۔

"اس لئے ان کا آپ کو اس طرح پھولن دیوی کہنا مجھے بالکل اچھا نہیں لگا۔ سمجھتی کیا ہیں خود کو، ساری نرمی انہی کو عطا کی گئی ہے۔"

"اگر وہ کہتی ہیں تو کہنے دیں۔ آپ کیوں برا مناتے ہیں؟" اس نے کہا۔

"مجھے نہیں اچھا لگتا، کوئی یوں آپ کو کچھ کہے۔ جب آپ اتنی اچھی ہیں تو کیوں برا کہا جائے بھلا۔" اس نے بے اختیار ہی کہہ دیا۔ اس کی ساعتوں کے اندر اک چھناکا سا ہوا اور پھر ماضی کے کانچ کو توڑتا شائل عین عین اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"تم تو ہو ہی اتنی اچھی کہ اچھا کہنے کا دل کرتا ہے۔ اچھے اچھے الفاظ ختم ہو جاتے ہیں مگر تمہیں پکارتے پکارتے دل نہیں بھرتا۔"

"اچھا شمائل! مجھے ذرا جلدی ہے، میں چلتی ہوں۔"

وہ اپنا ہینڈ بیگ اٹھا کے خود کو سنبھالتی ہوئی چل پڑی اور شمائل اس کی لمحہ لمحہ بدلتی

کیفیت پہ حیرت کرتا رہ گیا۔



تمہیں چاہا ہے ہم نے
زندگی کو تیری راہوں میں سجایا ہے
گھروندے دل کی ساری بستیوں کے
ہم نے تیرے نام رکھے ہیں

"بند کرا اپنا یہ گانا عادل! میں نماز پڑھ کے سویا ہوں۔" حافظ بھائی نے اس طرح سے کہا کہ شمائل کا سارا تصور ٹوٹ گیا۔

"یار! اتنی آہستہ آواز میں ریڈیو سن رہا ہوں۔ ساحر لودھی کا پروگرام میں مس کر ہی نہیں سکتا۔ تمہیں کیا ہے؟" عادل نے ہمیشہ کی طرح بحث کو طول دینا چاہا۔

"یار! میں استخارہ کی نماز پڑھ کے سویا ہوں اور اس نماز کی یہ شرط ہوتی ہے کہ پاک صاف، باوضو ہو کے سوؤ۔ کیوں میرا ایمان خراب کرتے ہو بھائی!" حافظ نے معصومیت سے کہا۔

شمائل نے سر جھٹک کے دونوں کی گفتگو میں سے خود کو نکالنا اور اپنا تصور پھر سے جوڑنا شروع کیا۔

گھروندے دل کی ساری بستیوں کے
ہم نے تیرے نام رکھے ہیں
جو گزرو دل کی گلیوں سے
تو آ کے دیکھ لو جاناں
محبت کی حدوں سے دور اِک سرحد ہے
وفاؤں کی......
ہم اس سرحد پہ رک کے
تیرا نام لیتے ہیں
تیرے چہرے سے اپنا ہر تصور باندھ لیتے ہیں......

"ہیلو، ہیلو، ہیلو فرینڈز! سلام، نمستے، ستسری اکال، میں ہوں آپ کا دوست ساحر

لودھی اور آپ مجھے سن سکتے ہیں اپنے ایف ایم پہ۔ ہیلو فرینڈز فرام کراچی، ملتان، فیصل آباد، لاہور اینڈ اسلام آباد۔''

ساحر لودھی نامی کمپیئر انتہائی چھچھورے انداز میں شعیب اختر کی رفتار سے بھاگتے ہوئے بولا تو شائل کا تصور ایک دم پھر سے پاش پاش ہو گیا۔

''یار عادل! ذرا والیوم دھیمی رکھنا۔ ڈسٹربنس ہوتی ہے۔'' وہ بہت آرام سے بولا۔

''کیا یار شوی! تُو بھی اس مولوی کی پارٹی میں شامل ہو گیا۔ مجھے تو اپنی پوزیشن نری پرویز مشرف جیسی لگتی ہے جس کی شخصیت ایم ایم اے والوں کو نا منظور ہے۔'' عادل نے غصے سے کہا۔

''بات صرف اتنی ہے میرے بھائی! کہ اگر ہم ایک کمرے میں رہ رہے ہیں اور ہم تینوں کی الگ الگ ترجیحات ہیں تو ہم سب کو ایک دوسرے کے آرام اور ترجیحات کا خیال رکھنا ہوگا۔ بندہ کب تک کمپرومائز کرے۔'' شائل نے آہستہ سے کہا۔

''توبہ ہے یار! جینا مشکل کر دیا ہے تم لوگوں نے۔ پہلے اکیلا مولوی ہی بہت تھا، اب یہ شاعر صاحب بھی شامل ہو گئے ہیں۔'' عادل غصے سے اٹھا اور اپنا ریڈیو اٹھا کے باہر گیلری میں چلا گیا اور شائل واپس اپنے پیپر پر جھک گیا۔ مگر اب موڈ بننا دشوار تھا۔

''شائل بھائی!'' اسے حافظ نے پکارا۔ اس نے حافظ کی طرف دیکھا۔

''اللہ تعالیٰ آپ کو دنیا میں بھی خوشیاں عطا کرے اور آخرت میں بھی۔ اپنے نفس اور شیطان سے جنگ کرنی پڑے گی۔ ورنہ ہمارا اپنا ہی نقصان ہوگا۔'' حافظ نے اسے دعا دی۔ وہ مسکرا دیا اور دوبارہ سے اپنا تصور جوڑنے کی کوشش کرتا رہا۔



''یار! سر آفندی کتنا اچھا پڑھاتے تھے۔ کلاس میں ٹائم گزرنے کا پتہ بھی نہیں چلتا تھا۔ اور یہ پروفیسر بور لیکچر دیتی ہیں۔ گرافس ایسے سمجھاتی ہیں جیسے سلانے کے لئے لوری دے رہی ہوں۔'' عتیقہ نے جمائیاں لیتے ہوئے کہا۔

''ایسی بھی کوئی بات نہیں عتیقہ! ہر ٹیچر کا اپنا اسٹائل ہوتا ہے۔ جس طرح ہر انسان کے بات کرنے کا الگ لہجہ اور الگ طریقہ ہوتا ہے۔ میم ماہا کوئی اتنا برا تو نہیں پڑھاتیں۔'' شائل فوراً بول پڑا۔

''تم لڑکے تو فی میل پروفیسرز کی لُکس سے ہی امپریس ہوتے ہو۔ وہ جیسا بھی پڑھائیں، اس سے تم لوگوں کو کوئی غرض نہیں ہوتی۔'' عتیقہ چڑ گئی۔

''ایکسکیوزمی عتیقہ! میں اگر یہی بات تم سے کہوں کہ تم بھی سر آفندی کی پرسنالٹی سے متاثر ہو کے ان کو بہتر ٹیچر کہہ رہی تھیں تو تمہیں کیسے لگے گا؟'' شائل نے بدلہ لیا۔

''شٹ اپ شائل!'' وہ جل کے بولی۔

''کم آن گائز! کیوں لڑنے جھگڑنے بیٹھ گئے ہو تم لوگ؟ پروفیسرز، ٹیچرز آتے ہیں، جاتے ہیں۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ تم لوگ اپنے پرسنل تعلقات کیوں خراب کرتے ہو؟'' ثانیہ نے ان کی صلح کرانی چاہی۔

''ہاں یار! ثانیہ ٹھیک کہتی ہے۔ میم ماہا یا سر آفندی تم لوگوں کو گولڈ میڈل تو نہیں پہنائیں گے نا ان کو پوزیشن دینے پر۔ بس اپنے کام سے کام رکھو۔ لیکچر اٹینڈ کرو اور اپنی لائف انجوائے کرو۔ دیٹس آل۔'' سہیل نے اپنا کمنٹ دیا۔

''او کے گائز! میں چلتا ہوں۔'' شائل نے اپنی فائل اور نیلے رنگ کا بیگ اٹھا کر کندھے سے لٹکایا۔

''کیا جلدی ہے یار! بیٹھ جاتے۔ کیفے جا کے چائے ہی پی لیتے ہم۔'' سرفراز نے اسے ٹوکا۔

''نہیں یار! تمہیں پتہ تو ہے، شام کو پارٹ ٹائم ٹیوشن پڑھانے جاتا ہوں۔ دیر ہو جائے گی۔'' وہ یہ کہہ کر رکا نہیں، آگے بڑھ گیا۔

''ہونہہ..... سمجھتا کیا ہے خود کو۔ شہزادہ سلیم ہے۔'' عتیقہ نے سر جھٹکا۔

''غور کرنا عتیقہ عثمان! شہزادے سلیم سے کچھ کم بھی نہیں۔ گوری رنگت، خوبصورت نقش، کالے بال۔'' عمارہ نے ڈرامائی انداز میں کہا۔

''مائی فٹ۔ ایسی خوبصورتیاں میری راہ میں بچھی رہتی ہیں۔'' عتیقہ نے مغرور لہجے میں کہا اور دوپٹہ سنبھالتی اٹھ گئی۔ شائل علی کا اسے اگنور کرنا ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔

کوریڈور میں تیز رفتاری سے جاتے ہوئے شائل کو دیکھ کر ماہا کو عجب تشویش سی ہوئی۔ اس لئے وہ اسے پکار بیٹھی۔

''شائل!''

اس کے پکارنے پر وہ فوراً رکا اور مڑ گیا۔

''خیریت تو ہے؟.......آپ اس طرح دوڑتے ہوئے کہاں جا رہے ہیں؟'' ماہا نے کہا۔

''وہ، میم! ذرا آج زیادہ ہی وقت گپ شپ میں نکل گیا۔ شام کو ایک جگہ ٹیوشن پڑھانے جاتا ہوں، اسی لئے نکل رہا تھا۔'' وہ مسکرا کے بولا۔ اس کی مسکراہٹ بہت پُرکشش تھی۔ اس کے سنجیدہ سے چہرے پہ بہت رونق آ جاتی تھی جب وہ مسکراتا تھا۔

''اوہ.......تو پڑھنے کے ساتھ ساتھ پڑھانے کا ذمہ بھی اٹھایا ہوا ہے۔'' ماہا نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے توصیفی انداز میں کہا۔

''جی میم! ننھی سی جان پہ اتنا ظلم کیا ہوا ہے۔'' وہ بولا۔

''کہاں جاتے ہو پڑھانے؟''

''کلفٹن عبداللہ شاہ غازی کی طرف۔''

''وہ تو میرے گھر کے بہت قریب ہے۔ اگر زیادہ دیر نہ ہو آپ کو تو میں ڈراپ کر دوں گی۔'' ماہا نے وقت دیکھتے ہوئے کہا۔

''اصل میں میم! اپنے اسٹوڈنٹ کو میں نے کہا ہوا ہے کہ میں یونیورسٹی آف ہوتے ہی آ جایا کروں گا۔ یہاں سے زی ٹو نمبر کی بس مل جاتی ہے، گھنٹے میں وہاں پہنچا دیتی ہے۔ اسی بہانے میں لنچ اپنے اسٹوڈنٹ کے ہمراہ کرتا ہوں اور میرے لنچ کے پیسے بچ جاتے ہیں۔''

شائل کے یہ بتانے پر ماہا ہنس دی۔ دونوں چلتے چلتے کیفے ٹیریا آ پہنچے تھے۔

''کیا کریں میم! پیسے بچانے پڑتے ہیں۔ سمسٹر فیس ارینج کرنی پڑتی ہے، فلیٹ کا کرایہ ہے اور کچھ اپنا خرچہ۔'' شائل ایک ٹیبل سلیکٹ کر کے بیٹھ گیا۔

''آپ کے فادر کیا کرتے ہیں شائل.......؟'' وہ توجہ سے اس لڑکے کی باتیں سن رہی تھی۔

''دو سال قبل میرے والد کی ڈیتھ ہو گئی تھی۔ ایک بڑے بھائی ہیں شرجیل، جن کی دو ماہ بعد شادی ہونے والی ہے، ان کے بعد میں ہوں اور مجھ سے چھوٹا راحیل ہے اور ایک سب سے چھوٹی بہن ہے منیبہ۔'' وہ تفصیل بتانے لگا۔

''اگر آپ نے لنچ نہیں کیا تو ایسا کرتے ہیں چائے کے ہمراہ چکن سینڈوچز منگا لیتے ہیں۔ کیا خیال ہے؟'' ماہا نے پوچھا۔ وہ مسکرا دیا۔ گردن اثبات میں ہلائی۔

چائے کے ساتھ سینڈوچز کینٹین بوائے رکھ گیا تھا۔

''اپنی ٹیوشن سے واپسی پر ڈنر میرے گھر کیا کریں۔ آپ کے ڈنر کی بھی بچت ہو جایا کرے گی۔'' ماہا نے پیشکش کی۔

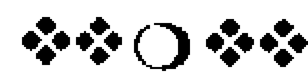
''میں نے اتنا کچھ اپنے متعلق بتایا ہے۔ آپ بھی تو بتائیں، آپ کے گھر میں کون کون ہے؟'' شائل نے چائے کا سپ لیتے ہوئے کہا۔

''گھر میں.......گھر میں، میں ہوں، میری پھپھو، میرا بیٹا عاشر اور ننھی سی ضحیٰ، جس کی شرارتوں سے پورا گھر کھلکھلاتا ہے۔'' ماہا نے مسکرا کے بتایا۔

''اور آپ کے ہزبینڈ؟'' ایک اور سوال آیا۔

''ضحیٰ جب چھوٹی سی تھی تو میرے ہزبینڈ کی ڈیتھ ہو گئی تھی۔'' وہ بہت آہستہ سے بولی۔ ماحول میں ایک دم سنجیدگی سی چھا گئی۔

''چائے بڑی اچھی ہوتی ہے کیفے کی۔ ہے نا؟'' شائل نے بات بدلنے کی خاطر کہا۔ وہ بھی مسکرا دی تھی۔



ڈور بیل ہوئی اور دروازہ پھپھو نے کھولا تھا۔ ماہا اندر بیٹھی ضحیٰ کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ عاشر ساتھ بیٹھا ویڈیو گیم کھیل رہا تھا۔

''ماہا! یہ تمہارا کوئی شاگرد تم سے ملنے آیا ہے۔'' پھپھو لاؤنج میں شائل کے ساتھ ہی آ گئی تھیں۔ اس طرح اچانک شائل کو سامنے پا کر ماہا کو حیرت ہوئی۔

''ارے شائل! آپ؟'' وہ مسکرا دی۔

''بس میم! آپ کے گھر کے پاس سے گزر رہا تھا، سوچا آپ کو سلام ہی کرتا چلوں۔'' وہ مؤدبا بولا۔

''آ جائیں، بیٹھیں۔'' ماہا نے اسے صوفے پر بیٹھنے کو کہا۔ ضحیٰ اور عاشر دونوں اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

''یہ میرے بچے ہیں۔ ضحیٰ اور عاشر۔ عاشر بیٹے! سلام کرو۔''

ماہا کے کہنے پر عاشر نے آ کے اس سے ہاتھ ملایا اور ننھی ضحیٰ آنکھیں پٹپٹا کے اس کو دیکھنے لگی۔ پھپھو تو نماز پڑھنے اپنے کمرے میں چلی گئی تھیں۔

''آپ بچوں کے ساتھ بیٹھیں شائل! میں ابھی آتی ہوں۔'' وہ وہاں سے اٹھ آئی۔ فوراً کمرے میں آئی اور شال اٹھا کے لپیٹ لی اور پھر کچن کا رخ کیا۔

''انکل! آپ مما کے کون ہیں؟'' ضحیٰ نے اس کے بہت پاس کھڑے ہو کر پوچھا۔

''یہ مما کے اسٹوڈنٹ ہیں۔ سنا نہیں ابھی پھپھو نے کیا کہا؟''

''لیکن مما تو سکول پڑھانے جاتی ہیں نا۔ اور سکول میں اتنے بڑے بڑے بچے پڑھتے ہیں؟'' پانچ سالہ ضحیٰ ذہن پر زور دے کر بولی۔

شائل نے اس معصوم کو کھینچ کے گود میں بٹھا لیا۔

''آپ کون سی کلاس میں پڑھتی ہیں پرنسس؟''

''کے جی ٹو۔'' وہ اطمینان سے بولی۔ اس کے براؤن گھنگھریالے بال شائل کو بہت اچھے لگے۔

''انکل! آپ کی کلاس کے باقی بچے بھی آپ کی طرح بڑے بڑے ہیں؟'' ضحیٰ کی معصومیت سے کہی بات ماہا نے بھی سنی تھی اور وہ مسکرا دی تھی۔

''جی بیٹے! کچھ تو مجھ سے بھی بڑے ہیں۔'' وہ بولا۔

''اور اگر آپ ہوم ورک نہ کریں تو مما آپ کو پنش بھی کرتی ہیں؟'' وہ پھر بولی۔

''بالکل کرتی ہیں۔'' شائل نے ماہا کی طرف دیکھا۔

''کتنے عجیب لگتے ہوں گے، بڑے بڑے انکل مرغے بنے ہوئے۔'' اب کے اس معصوم کمنٹ پر شائل کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

''ضحیٰ! میری کلاس میں صرف مرغے ہی نہیں، کچھ مرغیاں بھی ہیں۔'' ٹیبل پہ سینڈوچز اور کولڈ ڈرنک رکھتے ہوئے ماہا نے کہا۔

''لگتا ہے مما پولٹری فارم پڑھانے جاتی ہیں۔'' عاشر نے ویڈیو گیم کھیلتے کھیلتے کہا۔

''چلو ضحیٰ! بھائی کی گود سے واپس آ جاؤ۔ شائل! آپ یہ لیں۔'' ماہا نے بیک وقت ضحیٰ اور شائل دونوں کو مخاطب کیا۔ ضحیٰ بہت خاموشی سے اٹھ کے واپس ماں کے ساتھ بیٹھ گئی۔

''یہ بھائی تھوڑی ہیں مما! یہ تو انکل ہیں۔'' وہ سادگی سے بولی۔ ''بھائی تو عاشر بھائی ہیں۔''

''عاشر بھی بھائی ہیں اور یہ بھی بھائی ہیں۔'' ماہا نے اسے سمجھایا۔

''لیکن آپ تو کہتی ہیں میرا ایک ہی بھائی ہے۔'' ضحیٰ کی دلیل ٹھوس تھی۔

''ٹھیک کہتی ہیں مما، ضحیٰ! میں نہ انکل ہوں اور نہ بھائی۔ میں آپ کا فرینڈ ہوں۔'' شائل نے کوک کا سپ لیتے ہوئے کہا۔

ہلکی پھلکی گفتگو دیر تک ہوتی رہی۔



سایہ سا جو روح پہ میری ٹھہرا ہے
یہ تم تو نہیں؟
خوشبو کا ہالہ بن کے جو ذات پہ میری چھایا ہے
یہ تم تو نہیں؟

اس کی شاعری پچھلے ڈھائی سال سے مختلف رسائل میں شائع ہو رہی تھی۔ نوجوان حلقوں میں ''شہریار شائل'' کی غزلیں، نظمیں بے حد پسند کی جاتی تھیں۔ شاعری اس کے خون میں رچی بسی تھی۔ اس کے دادا شاعر تھے اور سارا بچپن وہ دادا کے ساتھ رہا۔ اکثر خود کو مشاعروں میں بچھے قالین اور تکیوں پہ سوتا پایا اور جب ڈھیروں ڈھیر تالیوں کے شور میں کسی شاعر کا نام پکارا جاتا، وہ آنکھ کھولتا اور جاگ جاتا۔ ابا اور امی کی غیر موجودگی میں دادا جان ہی تھے جن کا سایہ گھنی چھاؤں کی مانند تھا۔ سو اس طرح شاعری تو اس کے خون میں تھی، لیکن ساتھ ساتھ وہ اپنی تعلیم مکمل کرنا چاہتا تھا اور قدرت نے اسے ذہن بھی دیا تھا۔ اور نصابی دور میں وہ ہمیشہ اول رہا۔ لہٰذا اس نے آرکیٹکچر کو اپنے لئے چنا۔

ڈھائی سال سے وہ نظمیں اور غزلیں لکھ رہا تھا۔ ان نظموں، غزلوں میں کسی کا سایہ تو تھا مگر اس سائے کا کوئی چہرہ نہ تھا۔ مگر آج اپنے رائٹنگ ٹیبل پر بیٹھے نظم کی دو سطریں ہی لکھی تھیں کہ ان لفظوں میں اِک سایہ اُتر آیا تھا۔ اِک خوشبو اس کی روح کے چاروں طرف دھوئیں کی طرح چھانے لگی تھی اور اس سائے کو یکا یک ایک چہرہ مل گیا تھا اور یہ چہرہ ماہا کا چہرہ تھا۔ میم ماہا عامر کا۔ بالکل وہی نین نقش، وہی خال و خد۔ یہ دانستہ نہ تھا، نا دانستہ تھا۔ اس میں اس کے شعور کا نہیں، اس کے لاشعور کا قصور تھا۔ یہ سازش عقل کی نہیں، دل کی سازش تھی۔

'لیکن میم ماہا........!'

شائل نے زور زور سے نفی میں گردن جھٹکی جیسے یوں سر جھٹکنے سے ماہا کا خیال گرد کی طرح اُڑ جائے گا، ہوا ہو جائے گا۔

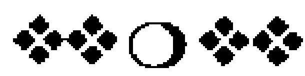
'کس طرح سوچ سکتا ہوں میں میم ماہا عامر کو؟........ کتنا تضاد، کتنا فرق ہے ان کی اور میری عمر میں، اسٹیٹس میں، پوزیشن میں، Designation میں۔ آسمان کو چھونے کی تمنا کر بھی کس طرح سکتے ہیں میرے ہاتھ؟........ نہیں۔' گردن ایک بار پھر جھٹکی۔

اس نے رجسٹر بند کیا اور آنکھیں موند کے کرسی کی پشت پر سر ٹکا دیا۔ اچانک آنکھوں کے سامنے ماہا کا وجود آ گیا۔ فیروزی شیفون کا دوپٹہ پہنے، گہرے نیلے شلوار قمیض میں براؤن بال کھولے اور دوپٹے کو لہراتی وہ چلتی چلی جا رہی ہے اور اس کی طرف مسکرا کے دیکھتی ہے۔

اس نے زبردستی اپنی آنکھیں کھول لیں۔

'اُف خدایا!........ یہ کیا ہو رہا ہے؟' وہ خود کلامی میں بولا۔

اسے اچانک گھٹن کا احساس ہوا۔ اور پھر خود سے بھاگو تو ذہن و دل بھی گھٹن کا شکار ہو جاتے ہیں۔ وہ اُٹھ کے بالکنی میں آ گیا۔ مگر کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں ماہا نہ ہو، اس کا عکس نہ ہو، اس کی خوشبو، اس کا چہرہ نہ ہو۔ محبت نیلا موسم بن کے دل میں اُتر آئی تھی........!



اسکالر شیٹ پہ جھکے ہوئے سبھی ایک بلڈنگ کا گراف بنانے میں مشغول تھے۔ وہ بھی شیٹ ٹیبل پہ چپکائے پنسل سے اور اسکیل کی مدد سے گراف بنا رہا تھا۔ جیومیٹریکل آلات اس کے سامنے بکھرے پڑے تھے، مگر اس کا ذہن کام نہیں کر رہا تھا۔ ابھی تک اس پہ رات والی کیفیت چھائی ہوئی تھی۔ اور پھر کلاس میں میم ماہا کا سامنا ہوتے ہی یہ کیفیت حد سے سوا ہو گئی تھی۔ دل کرتا اس کے چہرے کو دیکھے جاؤ۔ وہ جادوئی نین نقش دل کے کاغذ پر رقم ہو کے رہ گئے تھے۔

''کیا ہوا شائل؟........ آپ کا گراف نہیں بنا ابھی تک۔'' سبز دھانی ساڑھی

باندھے وہ اس کے ڈیسک تک آگئی تھی اور اسے کھویا کھویا دیکھ کر پوچھ بیٹھی۔

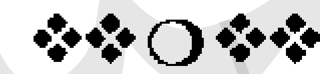
''بس میم! آج ذرا طبیعت ٹھیک نہیں تھی، اس لئے سست ہو رہا ہوں۔'' وہ خجل سا ہوا۔ ماہا نے لحہ بھر نرمی سے اس کی جانب دیکھا اور پھر فٹ اسکیل اس کے ہاتھ سے پکڑ کے اپنی پنسل سے اس کی شیٹ پہ گراف بنانے لگی۔

''اتنی سی عمر میں اتنے اتنے مشکل کام کرو گے تو طبیعت تو خراب ہو گی۔ خود پڑھنا، پڑھانا، بسوں پہ سفر کرنا، کھانے پینے کے ناغے کرنا۔ بھئی اپنے اوپر ذرا کم ظلم کیا کرو۔ انرجی ہو گی تو کوئی کام ہو گا۔ انرجی نہیں ہو گی تو کیا خاک محنت کرو گے؟''

میم لائنیں کھینچتے ہوئے بولیں اور شائل ان کی اس قدر قربت سے پزل سا ہو رہا تھا۔ ان کی ساڑھی کا ریشمی نرم کپڑا بار بار اس کے چہرے سے ٹکرا رہا تھا۔ اک مسحور کن خوشبو اس کے نتھنوں اور خیالوں سے ٹکرا رہی تھی۔ ایک عجیب جادوئی احساس اس پہ چھا رہا تھا۔ یہ مہک، یہ وجود، یہ احساس کتنا الگ، کتنا جادوائی تھا۔

''یہ لیں۔ بن گیا آپ کا گراف۔ اپنی صحت کا خیال رکھا کریں اور رات کا کھانا ٹیوشن سے واپسی پر میرے گھر کھا لیا کریں۔''

وہ آرام سے کہتی ہوئی آگے بڑھ گئیں اور عمارہ کا گراف بنوانے لگیں اور وہ اسی خواب ناک کیفیت میں بیٹھا انہیں دیکھتا رہا۔



''وارث! پلیز آپ بابا جانی کو سمجھایئے۔ زین ابھی بہت چھوٹا ہے۔ اسے کیوں ہاسٹل بھجوا رہے ہیں وہ؟ اور وہ بھی اتنی دور مری۔''

مہر النساء نے غصہ ضبط کرتے ہوئے ایک بار پھر وارث کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ وہ وارث کے چہرے پر اپنی بات سے اتفاق کا کوئی تاثر ڈھونڈنا چاہ رہی تھیں۔ لیکن وارث کا چہرہ بے تاثر تھا اور بے انتہا مطمئن۔ یہ اطمینان وارث کے چہرے کا خاصا تھا۔ اس اطمینان نے گویا اس کے چہرے پر گھر سا بنا لیا تھا۔ کوئی لمحہ ہو، کوئی سچویشن ہو، وہ ہمیشہ مطمئن رہتے تھے اور مہر النساء ان کے بالکل الٹ ہمیشہ جذباتی رہتی۔ ہر بات پر غصہ کرتی، ہر چیز کو اپنے نظریہ سے دیکھتی۔ دنیا اس کے لئے اسی طرح تھی جس طرح وہ اسے دیکھنا چاہتی تھی۔ باقی اس کی آنکھوں کے آگے جو کچھ

آتا، وہ یا تو اسے اگنور کر دیتی یا پھر اپنی آنکھیں ہی پھیر لینا چاہتی۔ سورج کی موجودگی میں بھی وہ آنکھیں موند کے رات کر لینا چاہتی، تو کر لیتی۔ انتہا پسند، آئیڈیلزم میں کھوئی رہنے والی، اپنی بات منوانے والی وہ مہر النساء سردار۔

''مہرو! آپ جانتی ہیں، اچھی طرح جانتی ہیں کہ سردار صاحب جو فیصلہ کر لیں تو پھر انہیں کوئی اس فیصلے سے ہٹا نہیں سکتا۔ کوئی فرشتہ بھی نہیں۔ پھر میں تو صرف ایک انسان ہوں، ایک ادنیٰ سا انسان۔'' وارث نے مسکرا کے کہا۔ مہرو کو اس کے اطمینان پہ غصہ آ رہا تھا۔

''آپ اتنا پوز نہ کریں وارث! بابا جانی آپ کی ہر بات مانتے ہیں۔ آپ کے ہر مشورے پہ عمل کرتے ہیں۔'' وہ بولی۔

''تصحیح کرتا ہوں۔ ہر بات پہ نہیں، کسی کسی بات پہ۔ اور زیادہ تر بزنس میٹرز میں ہی اپنی بات منوا پاتا ہوں انہیں۔'' وہ بولے۔

''زین ابھی بہت چھوٹا ہے وارث! صرف نائنتھ کلاس کا طالب علم ہے۔ اسے یوں تنہا کسی انجان شہر بھیج دینا کہاں کی سمجھداری ہے؟'' وہ اشتعال کا شکار تھی۔

''کیا مجھے اس چیز کا علم نہیں؟'' وارث مسکرا رہے تھے۔

''آپ میری باتوں کو مذاق سمجھ رہے ہیں نا۔ سمجھ بھی کیسے سکتے ہیں۔ آپ کیسے اندازہ لگا سکتے ہیں میری فیلنگز کا۔ زین میرے لئے بھائی نہیں، بچے کی طرح ہے۔ وہ چھوٹا سا، کامپلیکسڈ سا بچہ، جسے نہ ماں کا وجود نصیب ہوا اور نہ باپ کی توجہ، وہ ایک اکیلے انجان مکمل طور پر نئے ماحول میں کیسے ایڈجسٹ کرے گا؟ وہ تو تنہائی میں پاگل ہو جائے گا۔'' وہ انتہا درجے کی شدت پسند لڑکی آج اپنے بھائی کی خاطر لڑ رہی تھی۔

''مہرو! اگر ہم بھی سردار صاحب کے پوائنٹ آف ویو سے دیکھیں تو شاید ہمیں بھی یہ فیصلہ ٹھیک لگے۔ سردار صاحب ایک سیاسی شخصیت ہیں۔ ان کے حریف ان کی جڑیں کاٹنا چاہتے ہیں۔ الیکشن میں کھڑے ہونا آسان نہیں ہوتا۔ آپ کو پتہ ہے کہ پچھلے دنوں سردار صاحب پہ حملہ ہوا تھا۔ وہ نہیں چاہتے کہ ان کے بچوں کو کوئی نقصان پہنچے اس لئے وہ زین کو مری بھیج رہے ہیں۔'' وارث نے آسان لفظوں میں اسے سمجھانا چاہا۔

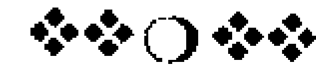
''اور میرا کیا؟...... میری جان کو کیا کسی سے خطرہ نہیں؟'' وہ تمسخرانہ ہنسی۔

''آپ کا تمام وقت یہاں حویلی میں ہی گزرتا ہے۔ یہاں پہ ملازمین ہیں، گارڈز ہیں، مکمل سکیورٹی ہے۔ لیکن زین روز اسکول جاتا ہے۔ شام میں ٹیوشن اور پھر ڈرائیونگ کلاس۔ اسے آپ کی نسبت زیادہ خطرہ ہے۔'' وارث بولے۔

''آپ کو کہنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں۔ آپ بھی تو بابا جانی کی زبان بولتے اور انہی کی زبان سمجھتے ہیں۔ پٹ بن گئے ہیں آپ وارث! بابا جانی کے اشاروں پہ ناچنے والے پٹ۔'' غصے میں پیر پٹختی وہ اندر چلی گئی اور وارث مسکرا کے اسے دیکھتے رہے۔

وہ جسے انہوں نے چار سال کی عمر سے لمحہ لمحہ بڑا ہوتے دیکھا تھا۔ وہ جو ان سے بیس سال چھوٹی تھی اور بچوں کی طرح ان سے لاڈ کیا کرتی تھی۔

انہوں نے گولڈ لیف کا پیکٹ نکالا اور سگریٹ سلگا لی اور اس کے دھوئیں میں ماضی کے کتنے دریچے وا ہونے لگے......!

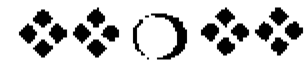


وارث خان لمز گریجویٹ سردار واجد کے وفادار ڈرائیور زاہد خان کا بیٹا تھا۔ زاہد خان کی وفات کے بعد سردار صاحب نے اسے اپنی کسٹڈی میں لے لیا۔ یہ بیس اکیس برس کا خوبصورت لڑکا انہیں پسند آیا۔ انہوں نے اسے پڑھایا لکھایا، اسے اپنا دایاں ہاتھ بنایا۔ اپنی فیکٹری اور باقی بزنس کی معلومات دیں، اس میں انوالو کیا اور کچھ ہی سال میں وارث ایک لائق فائق انسان بن گیا اور اپنا سب کچھ وارث کے بھروسے چھوڑ سردار واجد سیاست کا حصہ بن گئے اور پے در پے کامیابیاں حاصل کرنے لگے۔ ان کی شادی آٹھ سال بعد ان کی بیوی زیب النساء کی وفات پہ ختم ہوئی اور ''قصرِ زیب'' خالی رہ گیا۔ چار سال کی مہرو اور چار ماہ کا زین بن ماں کے ہو گئے۔

سردار واجد اس اچانک ملنے والے صدمے پہ ٹوٹ سے گئے اور اپنا آپ بزنس اور سیاست کے حوالے کر دیا۔ دونوں بچے وارث کے ساتھ مانوس ہونے لگے اور آہستہ آہستہ وارث ہی ان کے سب کچھ بن گئے۔ آیا عائشہ آپا اور وارث ہی ان کی کل کائنات تھے۔

زین تو ابھی چھوٹا تھا لیکن مہرو میں تو وارث نے کئی تبدیلیاں دیکھی تھیں۔ وہ اپنی

عمر سے کہیں زیادہ سنجیدہ اور سمجھدار تھی۔ ذہین و فطین، زین کی ماں بھی تھی۔ وارث کی دوست بھی اور اس گھر کی سنبھالنے والی بھی۔ وارث نے سگریٹ کا کش لیا اور دیر تک اسی کو سوچتے رہے۔



''یہ لو...... چائے پی لو۔'' ہمایوں نے چائے کا کپ اس کے ٹیبل پر رکھا اور وہ جو فائل کے اوپر جھکی شدت سے اپنے کام میں مگن تھی، چونکی۔

''تھینکس۔'' وہ مسکرائی۔

''وقار علی کے کیس پہ کام کر رہی ہو؟''

''نہیں، وقار علی کے کیس میں کچھ خاص نہیں۔ نارمل کسٹڈی کیس ہے۔ فیصلہ اس کی بیوی کے حق میں ہوگا۔ دنیا کی کوئی عدالت سات سال سے پہلے بچے ماں سے جدا نہیں کرتی۔'' شہرین نے اطمینان سے چائے کی چھوٹی سی چسکی لیتے ہوئے کہا۔

''تو پھر یہ فائل کس کے کیس کی ہے؟'' ہمایوں نے پوچھا۔

''ایک پراپرٹی کیس ہے۔ کوئی خاتون ہیں۔ حیدر آباد کے پاگل خانے میں پچھلے پندرہ سال سے رہ رہی ہیں۔ ذہنی توازن بگڑا ہوا ہے یا پھر تھا۔ ان کی کچھ پراپرٹی ہے جسے وہ کسی کے نام کرنا چاہتی ہیں۔'' اس نے بتایا۔

''کس کے نام؟'' ہمایوں نے دلچسپی لی۔

''یہی بات مجھے حیران کیے ہوئے ہے ہمایوں! وہ عورت جو اپنا نام جہاں آراء بتاتی ہے، جو کہ نیم پاگل ہے، وہ جو اتنی ساری پراپرٹی کی مالک ہے، وہ اپنا سب کچھ سردار واجد کے دو بچوں کے نام کرنا چاہتی ہے۔'' سمارا نے کہا۔

''کون سردار واجد؟'' ہمایوں کو حیرت ہوئی۔

''متحدہ پارٹی کے رکن جو ابھی الیکشن میں کھڑے ہوئے ہیں۔ چوہدری ساجد کے حریف۔'' شہرین نے بتایا۔

''اس عورت کا کیا رشتہ ہے سردار واجد سے؟''

''کوئی نہیں۔ بقول اسی کے وہ سردار واجد کی کچھ نہیں لگتی۔''

''تو پھر اس کا رشتہ سردار واجد کی بیوی سے ہوگا۔''

سردار کی بیوی زیب النساء ماضی کی مشہور ٹی وی اداکارہ تھی، جس کی ماں لاہور میں نائیکہ تھی، زیب نے سردار واجد سے کورٹ میرج کی تھی۔ دو بچے ہوئے اور اس کی ڈیتھ ہوگئی۔ کہنے والے کہتے ہیں سردار نے خود اس کا مرڈر کیا تھا۔'' شہرین نے چائے کا کپ ختم کیا اور کہا۔

''اوہ گاڈ! کہانی تو بہت دلچسپ ہے۔'' ہمایوں نے گردن ہلا کے کہا۔

''ہاں.....لیکن گتھی سلجھ نہیں پا رہی۔ کل پھر میں جہاں آراء سے ملنے از ابیلم جاؤں گی۔ زیادہ بات نہیں کرتی وہ۔ بیمار بھی بہت ہے۔ چہرہ زیادہ تر ڈھانپ کے رکھتی ہے۔ عجیب پراسراری چیز ہے۔''

''مس شہرین حسن! جس طرح کے کیس تم چاہتی ہو، تمہیں اسی طرح کے کیس مل جاتے ہیں۔'' ہمایوں مسکرا کے اس کے کیبن سے نکل گیا۔



وہ اس کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ کالے رنگ کے بیگ میں اپنے کپڑے پیک کر رہا تھا۔ استری شدہ، اَن پریسڈ گولے بنا بنا کے اس بیگ میں ٹھونستا جا رہا تھا۔ ابھی اور بھی بہت سی چیزیں بیڈ پہ بکھری پڑی تھیں اسی بیگ کے اندر جگہ بنانے کو۔ مہرالنساء چپ چاپ اس کے پاس آئی اور اس کے ہاتھ سے کپڑے لینے لگی۔

''جا رہے ہو زین؟'' وہ بولی۔

زین خاموشی سے اپنی بڑی بہن کا چہرہ دیکھتا رہا۔

''لاؤ، میں پیک کر دوں۔''

''نہیں آپی! میں کرلوں گا۔ بابا کہتے ہیں، میں بڑا ہو گیا ہوں۔ اپنا ہر کام کر سکتا ہوں۔ اکیلا رہ سکتا ہوں۔ میری زندگی کا پرائمری دور گزر چکا ہے اور سیکنڈری دور کے لئے آزادی اور انڈیپینڈنس اشد ضروری ہے۔''

''بابا کے نظریات اپنی جگہ زین! لیکن میرے لئے تم ہمیشہ بچے ہی رہو گے۔ ننھے سے، دودھ پیتے، روتے دھاڑتے زین۔'' اس نے لاڈ سے کہا۔

''پلیز آپی! میں ننھا بچہ نہیں رہا۔ مجھے اس طرح ٹریٹ مت کیا کریں۔ اب میں مری جا رہا ہوں۔ ہاسٹل میں رہوں گا۔ بابا ہر مہینے مجھے ڈھیر سارے پیسے بھیجیں گے

اور میٹرک پاس کرنے پر وہ مجھے بائیک بھی لے دیں گے۔ مجھے اپنے کام خود کرنے چاہئیں آپی!'' زین نے زچ ہو کے کہا۔

''ڈھیر سارے پیسوں اور بائیک کے خوابوں نے یا پھر ہاسٹل کی آزاد زندگی کی باتوں نے تمہارا مائنڈ ضرور چینج کیا ہے، میرا نہیں۔ یہ چیزیں تمہارے لئے چارم رکھ سکتی ہیں، میرے لئے نہیں۔ اتنی دور شہر جا رہے ہو........ مجھ سے اس گھر سے دُور کیا رہ پاؤ گے زین؟'' مہرو کی آنکھوں کے کونے نمناک ہو گئے تھے۔

''کم آن آپی! آپ تو مجھ سے بہت بڑی ہیں اور آپ ہی اتنا اَن پریکٹیکل سوچ رہی ہیں۔ بابا کہتے ہیں کہ اسی سال کے آخر میں آپ کی شادی کر دیں گے اور وہ خود بھی اسلام آباد گھر لے کے شفٹ ہو جائیں گے اور ''قصرِ زیب'' سے ناطہ ختم۔ یوں بھی ایک اینٹ پتھر کے گھر میں میرے لئے کیا چارم ہو سکتا ہے؟'' زین نے لاپرواہی سے کہا۔

مہرو کی آنکھوں کی نمی نے اب غصے کی چادر اوڑھ لی۔ جس طرح گرم استری پہ چھینٹے پڑنے سے شاں شاں کی آواز آتی ہے۔ سو مہرو کے دل کی استری تو پہلے ہی گرم تھی، زین کی اس بات نے پانی کے چھینٹوں کا کام کیا۔

''یہ گھر تمہارے لئے اینٹ پتھر کا ہوگا زین! میرے لئے نہیں۔ اپنے بچپن کی، امی کی ڈھیروں ڈھیر یادیں ہیں اس گھر میں۔ کتنے دن، کتنے لمحے بسر کئے ہیں یہاں ہم نے۔ پاؤں پاؤں چلنے سے لے کر قدم مضبوطی سے جمانے اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے تک کے تمام لمحے میں نے یہاں کاٹے ہیں۔ اور بابا نے یہ سوچ بھی کیسے لیا کہ ''قصرِ زیب'' سے ناتہ ختم بھی ہو سکتا ہے۔ ''قصرِ زیب'' سے ناتہ کبھی ختم نہیں ہو سکتا زین! زندگی کے ختم ہونے کے بعد بھی۔'' وہ آنکھوں کی نمی صاف کرتی زین کے کمرے سے چلی آئی۔

زین سر جھٹک کے دوبارہ اپنی پیکنگ میں مصروف ہو گیا۔ اس کے لئے اپنی بہت ہی حساس اور شدت پسند بہن کے جذبات کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ وہ اپنے بابا کی طرح میٹریل سٹک تھا۔ جذبات اور احساسات سے بے نیاز اور بے حد دُور۔ پلاسٹک کے کسی کھلونے کی طرح۔ اور پھر مرد تو یوں بھی اسی طرح ہوتا ہے۔ احساسات، جذبات

اور ان سے آشنائی سے بالکل خالی، بنا ہوا کے غبارے کی طرح کسی کے رونے پہ ہنسنے والا، کسی کے نرم جذبوں کو بے وقوفی کہنے والا، کسی کی آرزوؤں پہ اپنی انا کا جوتا رکھ کے اسے کفن پہنانے والا۔ مرد اور مردے میں لفظوں، حرفوں ہی کی طرح بہت کم فاصلہ ہوتا ہے۔ ہر منجمد احساس کے پیچھے مرد ہے۔ ہر سفاک فیصلے کے پیچھے مرد ہے۔ ہر انا پرستی کے خول کے پیچھے مرد ہے۔ زندگی کو سمجھوتوں کی شکل میں مولڈ کرنے والا مرد ہے۔

پیدا ہوتے ہی بیٹیوں کو زمین میں زندہ دفنا دینے والا بھی مرد تھا۔ دیواروں میں چنوا دینے والا بھی مرد تھا۔ اپنی ہی بیٹی کی آرزوؤں کی لاش گرا کے اس کی قسمت لکھنے والا بھی مرد ہے اور کلہاڑی اٹھا کے اپنی ہی بہن، اپنی ماں جائی کو کاری کہنے والا بھی مرد ہے۔

تمام کی تمام اشرف المخلوقات صرف مرد کے حصے میں آئی ہے اور عورت اس کی اس اشرف المخلوقاتی کے خول تلے دبتی آئی ہے، پستی آئی ہے، مٹتی آئی ہے........توے سے گرم گرم چپاتیاں اتار کے ساری عمر مرد کے معدے میں سے دل کے راستے ڈھونڈتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں شناسائی کے جلتے چراغ تلاش کرتی، اس کے پاؤں دبا دبا کے، اس کے جذبات کے بھڑکتے الاؤ پہ اپنے حُسن کے ٹھنڈے چھینٹے مارتی، اپنے فرائض نبھاتی اور حقوق سے محروم ہوتی آئی ہے عورت۔

والد کے سفاک فیصلوں پہ اپنے خواب قربان کرتی ہے اور والد نے کبھی تسلیم تک نہ کیا بلکہ اس کے سر پہ ہاتھ رکھ کے کہہ دیا۔ ''بیٹی! تیری قسمت کا لکھا ہے۔ اس گھر سے تیرا جنازہ ہی نکلے گا۔'' وہ مرد جو باپ کا بہروپ رچائے بیٹی کے سامنے ہوتا ہے، وہ یہ نہیں جانتا کہ اس کرم جلی کا جنازہ تو تبھی اٹھ گیا تھا جب وہ نکاح پڑھوا کے بابل کی دہلیز پھلانگ آئی تھی اور اپنی جیل تبدیل کروائی۔ غلامی کے فرائض نئے لکھوائے اور سزا میں اضافہ کروایا۔

روتے روتے مہرالنساء ''قصرِ زیب'' کے صحن میں آ گئی تھی جہاں دو فوارے کے تالاب میں بطخیں تیر رہی تھیں۔ رات کی رانی کی خوشبو نے پورے ماحول پہ اپنی حکمرانی کر رکھی تھی۔ ہزار واٹ کے بلب نے لان کا کونہ کونہ جگمگا رکھا تھا اور لان میں

لگے لالہ و گلاب کے پھول کسی آرٹسٹ کی تصویر کی طرح ساکت و خوبصورت لگ رہے تھے۔

اس نے روتے ہوئے سوچا، کیا یہ گھر فقط اینٹ پتھر کا ہے؟........ اگر یہ اینٹ پتھر کا ہوتا تو یہاں کے در و دیوار اس سے پیار کیوں کرتے؟ پھول پودے اس کے دکھ درد کیوں بانٹتے؟ فصیلوں میں، دریچوں میں وہ اپنا پن کیوں پاتی؟ اسے ہر ہر کونے سے آوازیں کیوں آتی تھیں۔

'نہیں........ یہ گھر بے روح نہیں، زندہ و سالم ہے۔ میں اس گھر کو کبھی نہیں چھوڑوں گی۔' اُس نے روتے روتے سوچا تھا۔

''کیا بات ہے؟........ آپ یہاں اس وقت تنہا بیٹھی ہیں اور اُداس بھی لگ رہی ہیں۔'' وارث پتہ نہیں کب اس کے پیچھے آ بیٹھے تھے۔

''کسی کو میری اُداسی سے کیا۔ میں تنہا رہوں یا مر جاؤں، آپ کو کیا پرواہ؟'' وہ آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔

''خیر، اتنا بھی سنگدل نہیں ہوں میں۔ ہوسکتا ہے شکل سے لگتا ہوں، لیکن دل کا اچھا ہوں۔'' وارث مسکرائے۔

''وارث! زین کہتا ہے بابا یہ گھر چھوڑ دیں گے۔ اس اینٹ پتھر کے گھر میں ان کے لئے کوئی چارم نہیں ہے۔ وارث! کیا یہ گھر واقعی بے روح ہے؟ اینٹ پتھر کا ایک معمولی مکان ہے یا آپ کو بھی میری طرح اس میں جان محسوس ہوتی ہے؟'' وہ روہانسے لہجے میں بولی۔

''وابستگی تو ہر مکیں کو مکاں سے ہو جاتی ہے۔ انسان کا دل ہے پھر سینے میں۔ پیار نہ کرے تو کیا کرے۔''

''مت کہیں اسے مکان........ مکان سے ایک کھوکھلی، بے روح عمارت کا خیال آتا ہے۔ ہڑپہ اور موہنجوداڑو کے کھنڈر بھی کسی کے مکان تھے۔ گھر تو دلوں سے بنتے ہیں۔ دلوں میں لمحہ لمحہ بڑھتی محبت سے بنتے ہیں۔ قصرِ زیب مکان نہیں وارث! یہ میرا گھر ہے۔'' وہ دوبارہ رونے لگی۔ ٹپ ٹپ آنسو بہہ بہہ کے رخساروں پہ آگ سی جلا رہے تھے۔ اس طرح کے آنسو ہمیشہ وارث کو گڑبڑا دیا کرتے تھے۔ وہ ان کی تجلیوں

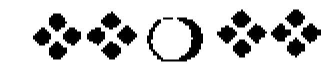
کی تاب نہ لا سکتے تھے۔ آنکھیں چرا لیتے تھے۔

''سردار صاحب کو بھی اس گھر سے بہت محبت ہے۔ آپ کی امی جان کے لئے خصوصی طور پر یہ قصرِ زیب بنا تھا۔ انہی کی پسند، انہی کی ذات کے مصداق خوبصورت۔ سردار صاحب کبھی بھی نہیں بیچیں گے اسے۔ آپ اطمینان رکھیں۔'' وارث نے اسے سمجھایا۔

''تو پھر بابا نے زین سے ایسی بات کیوں کی؟'' وہ کسی طور قائل ہو کے نہ دے رہی تھی۔

''انہوں نے اسے ہاسٹل جانے اور اطمینان سے اپنی پڑھائی کرنے کی خاطر ایسا کہا ہوگا۔ آپ زیادہ مت سوچیں ایسا۔''

وارث کی تسلیوں سے اس کا دل سنبھل گیا تھا۔ آنسو تھم گئے تھے۔



آج پورے شہر میں بڑی زور کی بارش ہوئی تھی۔ سردیوں کے اوائل کی یہ بارش موسم میں خنکی کا باعث بنی تھی۔

وہ قصرِ زیب کے کاریڈور کی بالکنی میں کھڑی تھی اور زرد رنگ کی شال میں لپٹی ٹپ ٹپ بارش کی برستی بوندوں کو دیکھے جا رہی تھی۔ بطخیں ٹھنڈ سے چھپ کے اپنے ڈربوں کے اندر چلی گئی تھیں۔ پھول لہلہا رہے تھے۔ سامنے والے کاریڈور کے شیشوں پہ دھند چھا گئی تھی۔ اچانک سیڑھیوں سے وارث برآمد ہوئے تھے اور دھیمے دھیمے قدم اٹھاتے اس کے پاس آ کے ٹھہرے تھے۔

''اتنی سردی ہے...... آپ اپنے کمرے میں چلی جائیں۔''

''میرے اوپر سردی اثر ہی نہیں کرتی۔ آپ فکر نہ کریں۔'' وہ بولی۔

''ناراض ہیں مجھ سے؟'' وارث نے نرمی سے کہا۔

''نہیں...... میں کیوں ناراض ہوں گی؟ آپ کون لگتے ہیں میرے؟ جن سے ناراض ہونے کا حق رکھتی ہوں، ان سے بھی نہیں ہو سکتی۔''

''سردار صاحب کی بات کر رہی ہیں؟''

''نہیں...... میں کسی کی بات نہیں کر رہی۔'' وہ بطوری۔

''زین سے بات ہوئی تھی میری فون پہ۔ ٹھیک ہے بالکل۔ کہہ رہا تھا روم میٹس بھی اچھے ملے ہیں اسے۔'' وارث نے بتایا۔

''میں نے اس کے بارے میں آپ سے پوچھا؟...... کیوں بتا رہے ہیں آپ؟ اور وہ کیا خود مجھے فون نہیں کر سکتا؟ بچہ ہے کیا اتنا چھوٹا؟''

''جو لوگ ناراض نہیں ہوتے، وہ کیا اتنی کرختگی سے بات کرتے ہیں؟'' وارث کے چہرے پہ دبی دبی مسکراہٹ تھی۔

''سختی ہو چاہے کرختگی، ایک آپ ہی تو ہیں جس سے میں ہر طرح سے بات کر لیتی ہوں۔ اپنا تو کوئی ہے نہیں، ایک آپ ہی تو ہیں میرے۔'' وہ یکایک رونے لگ گئی۔ آنسو گالوں پہ پھسل پھسل کے آنے لگے۔ ٹھنڈے پانی کی برستی پھوار اور ٹھنڈے گالوں پہ پھسلتے گرم اشک۔

''آپ ایسا کیوں سوچتی ہیں مہرو؟''

''کچھ انسان اتنے تنہا ہوتے ہیں وارث! کچھ لوگوں کے گرد میلے سے لگے ہوتے ہیں، اپنوں کے، دوستوں کے، ہمدردوں کے، غم خواروں کے اور کچھ لوگ میری طرح تن تنہا۔ اکیلے رونا چاہیں تو کندھا میسر نہ ہو۔ ہنسنا چاہیں تو کوئی ساتھی نہ ملے...... بالکل تنہا۔'' وہ تڑپ کے رو دی تھی اور ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا تھا۔ وارث نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا تھا، ذرا سا جھک کے۔

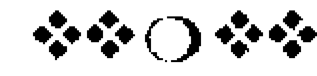
''مہرو! آپ تو اتنی سٹرونگ ہیں...... آپ کیوں روتی ہیں؟...... مہرو! اللہ تعالیٰ ہر کسی کا ہوتا ہے۔ ان کا بھی جو اسے یاد نہیں کرتے، اسے مانتے نہیں۔ آپ اپنے یہ قیمتی آنسو کیوں ضائع کر رہی ہیں؟ کیوں انہیں بے وقعت کر رہی ہیں؟''

وہ ان کے کندھے سے لگی ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی اور وارث عجیب گھبراہٹ کا شکار تھے۔ یہ بے انتہا شدت پسند لڑکی دل کے نزدیک آ کے ان سے اپنائیت کی طلب گار تھی۔ اس بات سے قطعی انجان کہ اس دل کے اندر خود اسی کا روپ ہے، خود اسی کا عکس ہے۔ لیکن یہ عکس، یہ روپ خود وارث کے لئے خوف کا باعث تھا۔ وہ اپنے دل میں اس عکس کی موجودگی سے ڈرتے تھے۔ وہ نمک حرام کا لیبل اپنے اوپر چپکانا نہیں چاہتے تھے۔ وہ خود غرض نہیں تھے، احسان فراموش نہیں تھے۔ وہ سردار صاحب

کی بیٹی سے محبت کر کے امانت میں خیانت کا مرتکب بننا نہیں چاہتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو دھوکا دے رہے تھے۔ اپنے ہی دل کی زبان کو سمجھنے سے انکار کر رہے تھے۔ اپنا ہی آپ مار رہے تھے۔

''اپنے کمرے میں جائیں مہرو! اس طرح بارش میں کھڑے رہنا آپ کے لئے ٹھیک نہیں۔'' وہ اس کو اپنے سے الگ کر کے بولے تھے۔

''اندر جو آگ جھلس رہی ہے، اس کو بارش میں بجھانے کی سعی کر رہی تھی۔ کیا پتہ تھا کہ یہ آگ تو دل کے جنگل میں بری طرح پھیل چکی ہے۔ بوندیں اس پہ بے اثر ٹھہریں گی۔'' اُداسی سے کہتی ہوئی وہ کاریڈور کا احاطہ پھلانگ کے سیڑھیاں چڑھنے لگی اور وارث دیر تک اسے جاتا دیکھتے رہے۔



''عتیقہ! تم آج کل اتنی خاموش کیوں رہنے لگی ہو؟'' سارا نے اس سے پوچھا تھا۔

''نہیں تو۔ میں تو بالکل خاموش نہیں رہتی۔ بس کچھ امتحانوں کی ٹینشن تھی۔ اور تو کچھ نہیں۔'' عتیقہ نے مسکرا کے کہا۔

''زیادہ بنو مت۔ میں کئی دنوں سے دیکھ رہی ہوں۔ بیٹھے بیٹھے کھو جانا، درختوں کو دیکھتے رہنا، اسکالر شیٹ بچھائے اس پہ بے وجہ لکیریں کھینچتے رہنا اور اس طرح گم صم، اُداس بیٹھے رہنا، یہ کوئی نارمل عادات تو نہیں۔''

''سارا! ایک تو تم بے سروپا باتیں بہت کرنے لگی ہو۔'' عتیقہ چڑ گئی۔

''ہائے، ہائے........ ایک زمانہ تھا جب تمہیں میری ہر بات کام کی بات لگا کرتی تھی اور آج کل تمام باتیں بے سروپا لگتی ہیں۔ مجھے پتہ ہے کیا لگتا ہے۔''

''بکو، کیا لگتا ہے؟'' عتیقہ نے کتاب کھول لی اور اسے الٹا سیدھا کھول کے دیکھنے لگی۔

''یہی کہ تمہیں محبت ہو گئی ہے۔'' سارا بہت مطمئن تھی۔ عتیقہ کا دودھیا چہرہ ذرا سا سرخ ہوا اور اس نے عجیب نظروں سے سارا کو گھورا۔

''میرے لئے کرنے کو بہت کام ہیں۔ زندگی بہت چھوٹی ہے اور مجھے کوئی شوق نہیں اسے محبت جیسے فضول کام میں صرف کرنے کا بلکہ گنوانے کا۔ مجھے اپنی زندگی میں

بہت Constuctive کام کرنے ہیں۔ کیا سمجھیں؟'' عتیقہ نے کہا۔

''عتیقہ! تمہاری آنکھیں تمہاری زبان کا ساتھ نہیں دے رہیں۔'' سارا نے اسے مزید تپانا چاہا۔

''مائی فٹ........ کیا تمہیں کوئی کام نہیں مجھے پریشان کرنے کے علاوہ؟'' عتیقہ نے دوبارہ کتاب میں منہ گھسایا۔

''کہیں........ وہ........ شائل علی تو نہیں؟'' سارا کی زبان سے یہ نام سن کر عتیقہ ذرا سا سہم گئی۔ اس کی پیشانی پہ ننھے ننھے قطرے چمکنے لگے۔ دل کی دھڑکنوں میں ذرا سی لرزش ہوئی۔ سانسوں کا مدھم زیروبم ذرا سا تیز ہوا اور آنکھوں کے آگے شائل علی کا مسکراتا، گیت گاتا چہرہ آ گیا۔

شفاف رنگت، کشادہ پیشانی، گھنگھریالے بال اور چھوٹی سی بھوری آنکھوں پہ لگا سنہری چشمہ۔ عتیقہ کے دل سے ایک آواز آئی۔

''اُف شائل علی! تم نے کب آنکھوں میں سے دل تک راستہ بنا لیا؟ کب دل میں جا کے براجمان ہو گئے؟ پتہ ہی نہ چلا۔ اب میرے اس راز میں پوری دنیا شامل ہونے لگی ہے سوائے تمہارے۔ اور تم جس کے لئے یہ سارے جذبے ہیں، تم ہی میرے جذبوں کی تپش سے ناآشنا ہو........ انجان ہو۔''

جانے کون نگر کی چڑیا
شام منڈیر پر آ بیٹھی ہے
چونچ میں اِک نازک سی ڈالی
اس پہ ایک سنہرا پھول
جیسے عشق سفر کی دھول!



"آپ بتائیے، آپ کا سردار واجد کے بچوں سے کیا رشتہ ہے؟" شہرین نے بہت مطمئن لہجے میں اس عورت سے پوچھا تھا۔

وہ خاموش تھی۔

"دیکھیں، آپ نے اتنی بڑی وصیت کے لئے مجھے Contact کیا ہے۔ مجھے ضروری معلومات تو حاصل کرنی ہوں گی نا۔ اور پھر پراپرٹی بھی اتنی معمولی نہیں ہے۔ اچھی خاصی ہے۔ اور پھر سردار واجد شہر کی سیاسی شخصیت ہیں اور سیاسی شخصیات سے بہت سے واہمے بھی جڑے ہوتے ہیں۔ آپ اگر مجھے کچھ نہیں بتائیں گی تو مسئلہ ہوگا۔ میں کیس فائل نہیں کروں گی۔"

عورت متواتر خاموش تھی۔

"اس کا مطلب ہے آپ کو دلچسپی نہیں ہے۔ اوکے، ٹھیک ہے۔ میں چلتی ہوں۔ لیکن اب دوبارہ نہیں آؤں گی۔" شہرین نے اپنا بیگ اٹھایا اور جانے لگی۔ اچانک وہ عورت بول پڑی۔

"رک جاؤ......مت جاؤ......کہیں مت جاؤ۔"

"میں کہیں نہیں جا رہی......آپ بتائیے۔" شہرین ایک بار پھر سے کرسی پہ بیٹھ گئی۔

"مجھے ڈر ہے۔" اس عورت نے دھیمے اور سہمے لہجے میں کہا۔

"ڈر؟......کس بات کا ڈر؟" شہرین نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"میں نے تمہیں سب کچھ بتا دیا تو تم اس راز کو فاش کر دو گی۔ اور پھر کئی جانوں کو خطرہ ہوگا۔" عورت نے کہا۔

"میرے اوپر یقین کیجئے۔ آپ میری والدہ کی عمر کی ہیں، اس لئے میں آپ کو آنٹی بلا رہی ہوں۔ آنٹی! میں قسم کھا کے کہتی ہوں کہ آپ کا راز میں کبھی فاش نہیں کروں گی۔ آپ مجھ پہ یقین کیجئے۔" شہرین نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پہ رکھا۔

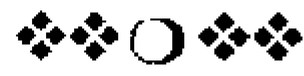
وہ عورت آہستہ آہستہ ایک ایک جملہ شہرین کے گوش گزار کرتی رہی اور شہرین پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی تمام باتیں سنتی رہی۔

کتنے عجیب انکشاف تھے۔

کتنی گہری حقیقتیں تھیں۔

کس قدر حیران کن سچائیاں تھیں۔

شہرین بوجھل دل اور بوجھل ذہن کے ساتھ پاگل خانے کے اس وارڈ سے باہر آئی تھی۔ اس طرح کا کیس اس نے کبھی زندگی میں دیکھا تو کیا، سنا بھی نہ تھا۔



ماہا نے جیسے ہی لاؤنج میں قدم رکھا، اس کی پہلی نظر شائل پہ پڑی۔ وہ بچوں کے ساتھ کیرم بورڈ کھیل رہا تھا۔

"دیکھیں شائل بھائی! چیٹنگ مت کیجئے۔" عاشر نے تنبیہہ کی۔

"وہ تو تمہارا کام ہے مسٹر! میرا نہیں۔" شائل نے مسکرا کے کہا۔

"آپ میری گوٹی کو مت ماریئے گا۔" ضحیٰ نے معصومانہ لہجے میں فرمائش کی۔

ماہا اندر آتے ہوئے مسکرا دی۔

"مما آ گئیں......مما آ گئیں۔" ضحیٰ دوڑ کے ماہا کی ٹانگوں سے لپٹ گئی اور اس ننھی سی جان کو ماہا نے اٹھایا اور اس کے دونوں گالوں پہ پیار کیا۔ اسے اٹھائے اٹھائے ماہا صوفے تک آئی۔

"کیا ہو رہا ہے یہاں؟" اس نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ ہم ذرا چیٹنگ کرنا سیکھ رہے تھے شائل بھائی سے۔" عاشر نے کہا۔

"آپ میرے بچوں کو کیا سکھا رہے ہیں شائل......؟" ماہا نے مصنوعی غصے سے شائل کو گھورا۔

"اصل میں میم! میں ان کو کیرم کھیلنے کے چند آسان طریقے سمجھا رہا تھا جو مجھے

میرے بابا نے سکھائے تھے۔'' شائل نے کہا۔

''ہمارے بابا نہیں ہیں.......آپ ہمیں اس لئے سکھا رہے ہیں؟'' معصوم ضحیٰ نے اچانک یہ جملہ ادا کیا۔

لمحہ بھر کو ماہا اور شائل کے چہرے پہ اُداسی در آئی۔ ماہا نے خود کو سنبھالنے کی سعی کی۔

''کک......کافی......کافی پیو گے شائل؟ مجھے بہت ضرورت فیل ہو رہی ہے۔''

''جی میم! میں بھی پیوں گا۔''

''ابھی لائی۔'' ماہا اٹھ کر کچن کی طرف چل دی۔

❖❖○❖❖

کوئی تو ہوتا......!
میں جس کے دل کی کتاب بنتا
میں جس کی چاہت کا خواب بنتا
میں ہجر موسم کی لمبی راتوں میں یاد بن کر
عذاب بنتا......
کوئی تو ہوتا......
جو میری خواہش میں اٹھ کے
راتوں کو خوب روتا
دکھوں کی چادر لپیٹ کر وہ
ہجومِ دنیا سے دور ہوتا
میں روٹھ جاتا
مناتا مجھ کو
کہ چاہے میرا قصور ہوتا
کوئی تو ہوتا......!

''آپ سے ایک پرسنل سوال پوچھ سکتا ہوں؟'' کافی کا مگ اٹھائے شائل بھی ٹیرس کی طرف آ گیا تھا جہاں وہ تنہا کھڑی آسمان کی وسعتوں میں کسی کا چہرہ تلاش کر رہی تھی۔

''پوچھو۔'' ماہا نے کہا۔

''آپ کو اپنے بچوں کی طرح اپنے ہزبینڈ کی کمی محسوس نہیں ہوتی؟''

ماہا کتنی دیر خاموش خلا میں دیکھتی رہی۔

کس ستارے کو تلاش کر کے اپنے مقدر کے ماتھے پہ ٹانک دیتی؟......کون سا جگنو، کون سا چاند تھا جو اس کے اندر کی تاریکیوں کو روشنی دے پاتا؟......اس کی زندگی میں روشنی کے نام پہ تھا ہی کیا۔

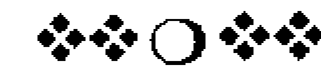
''کمی......خلا......اس کو محسوس کرنا ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔ اور پھر جو خلا پورا نہ ہو سکے اس کی ناپ تول میں عمر گنوانے سے حاصل ہی کیا؟ اور پھر میری زندگی میں اتنا وقت ہی نہیں بچتا کہ میں زندگی کی کسی کمی یا خلا یا ویرانے کو ناپوں۔'' ماہا کا لہجہ بہت اُداس تھا۔

''اگر زندگی کی کمی یا خلا کو کچھ وقت دیا جائے یا اگر ان کے متعلق کچھ سوچا جائے تو ہو سکتا ہے کہ اسے پُر کرنے کا سامان بھی نکل آئے۔'' شائل نے ماہا کی اُداس جھیل جیسی آنکھوں میں جھانکا۔ ماہا نے اپنی آنکھیں جھکا لیں۔

''کچھ لوگوں کی زندگی میں فقط درد ہوتے ہیں، مسیحا نہیں ہوتے۔ اور مسیحائی کا تصور بھی نہیں ہوتا۔ مجھے اپنی تنہائی، اپنے غم بہت عزیز ہیں۔ میں اس خلا کو پورا کرنا نہیں چاہتی۔'' ماہا یہ کہتی ہوئی وہاں سے لاؤنج میں آ گئی اور شائل اس کی مٹیالی ساڑھی اور ہم رنگ آنکھوں میں کھو سا گیا۔ وہ دیر تک کھڑا سوچتا رہا۔

'اگر تمہیں یہ خلا عزیز ہے تو پھر تم کیوں ستاروں کی طرف دیکھتی ہو کہ ستاروں کی طرف دیکھنے والے تو فقط وہی ہوتے ہیں جن کو تقدیر بدل دینے والی کسی روشنی کی آمد کا انتظار ہو......جو تنہائی کے جنگل کے حصار میں برف کی سِل پہ بیٹھی وارث شاہ کے دیس سے آنے والے کسی رانجھے، کسی گھنگھریالے بالوں والے شہزادے کی منتظر ہوں۔ شہزادہ جو مشکی گھوڑے پہ سوار جنگل کے کیل کانٹے ہٹاتا اس کے پاس آ پہنچے اور اس کے جسم میں گڑی تنہائی کی تمام سوئیوں کو نکال پھینکے، اسے اپنے مشکی گھوڑے کی پیٹھ پہ بٹھائے اور اسے آزاد کرا کے لے جائے......ستاروں کی طرف دیکھنے والیاں تو خلا کی وسعتوں میں محبت تلاشنے والیاں ہوتی ہیں......تم ستاروں کو کیوں دیکھتی ہو

"بابا؟........ کیونکر........؟"



مہرالنساء کمپیوٹر پہ بیٹھی مختلف ویب سائٹس کو کھولے اور بند کئے جارہی تھی کہ جب وارث اس کے پاس آئے۔

"السلام علیکم!"

"وعلیکم السلام! کیسے ہیں وارث؟" مہرو مسکرائی۔

"ٹھیک ہوں۔ آپ کیسی ہیں؟"

"کہیں جارہے ہیں آپ؟"

"ہاں........ کچھ ضروری چیزیں خریدنی تھیں۔ مارکیٹ تک جارہا ہوں۔ کل سردار صاحب بھی آرہے ہیں۔ ان کی بھی کچھ چیزیں خریدنی ہیں۔ آپ کو کچھ چاہئے تو لسٹ بنادیجئے۔" وارث نے گھڑی دیکھ کر کہا۔

"وارث! میں بہت بور ہورہی ہوں۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو آپ کے ساتھ چلوں؟ مجھے اپنے لئے کچھ ڈریسز بھی خریدنے تھے۔" مہرو کے کہنے کے ساتھ ہی وارث سوچ میں پڑ گئے تھے۔

"اگر سردار صاحب نے گھر فون کیا تو؟" ایک جواز آیا۔

"بابا ہمیشہ میرے موبائل پہ رنگ دیتے ہیں۔ اور ویسے بھی صبح ان کا فون آیا تھا۔ اب نہیں آئے گا۔"

"اچھا ٹھیک ہے، چلیں۔ میں گاڑی پورچ سے نکال لوں۔"

"میں اپنا بیگ اٹھالاؤں۔" مہرو اٹھ کے اوپر اپنے کمرے کی طرف دوڑ گئی۔

گاڑی بہت رفتار سے شہر کی کشادہ اور صاف سڑک پہ دوڑ رہی تھی۔ مہرالنساء شہر کی جھلملاتی سڑکوں، شاہراہوں اور جگمگاتی دکانوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اپنے شہر کی روشنیوں سے اسے پیار تھا۔ یہیں وہ پیدا ہوئی تھی۔ گو کہ اس کی والدہ کا تعلق یہاں سے نہیں تھا لیکن اسے بذاتِ خود اس شہر سے بہت پیار تھا۔ بالکل اپنے گھر "قصرِ زیب" ہی کی طرح یہ شہر بھی اسے اپنا گھر لگتا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ اس شہر کا چپہ چپہ، جگہ جگہ، ہر سڑک، ہر شاہراہ قصرِ زیب کا حصہ ہے۔ سارا شہر اس کا اپنا ہے۔

"کتنا خوبصورت شہر ہے نا کراچی۔ بالکل قصرِ زیب کی طرح۔" مہرو نے اپنے اندر کے احساسات کو زبان دی تھی۔

ڈرائیو کرتے ہوئے وارث کی مسکراہٹ گہری ہوگئی تھی۔ کتنی جچتی تھی اس کے چہرے پہ یہ مسکراہٹ۔ گھنی مونچھوں تلے گلابی ہونٹ جیسے جگمگا جاتے تھے۔ مہرو کتنی دیر محویت سے انہیں دیکھتی رہی۔ لمحہ بھر کو شہر کی جگمگاہٹ اس کے ذہن سے اتر گئی۔ وارث نے اس کا دیکھنا نوٹ کرلیا اور دوبارہ نارمل انداز میں گاڑی چلانے لگے۔

"آپ بہت کنجوس ہیں وارث!"

"وہ کیسے؟" وارث نے پوچھا۔

"مسکراہٹ میں کنجوسی کرتے ہیں۔ بولنے میں کنجوسی کرتے ہیں۔ اظہار میں کنجوسی کرتے ہیں۔ کبھی کبھی تو آپ مجھے روبوٹ لگتے ہیں جس کا ریموٹ صرف بابا کے ہاتھ ہے۔" مہرو کے کمنٹ پہ وارث ایک بار پھر مسکرائے۔ وہی جگمگاتی مسکراہٹ۔

"آپ کی طرح الفاظ ہمیشہ میرے ذہن کے دروازے پہ دستک کہاں دیتے ہیں؟ اور اظہار........ میرے اندر کوئی بھی ایسا جذبہ نہیں جسے اظہار کی ضرورت ہو۔ میں جو کہہ دیتا ہوں، وہی سوچتا ہوں۔ مجھے سوچ کے کہنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔" وارث کا انداز بہت نارمل تھا۔

"اس کا مطلب آپ کے دل کے اندر کوئی کھٹا میٹھا احساس نہیں۔ آپ کو چاندنی راتوں میں، برستی بوندوں میں، چمکتی دھوپ اور بہتے جھرنوں میں کسی کا چہرہ، کسی کا روپ نظر نہیں آتا۔ شاعر کی نظموں میں سے کسی کا روپ بوتل کے جن کی طرح دھواں بن کے نہیں اُبھرتا۔ تنہائی میں کوئی میٹھی خوشبو آپ کے حواس اپنی مٹھی میں نہیں جکڑتی۔" مہرو نے کہا۔

وارث نے اپنی گردن نفی میں ہلائی۔

"تو پھر آپ یقیناً روبوٹ ہی ہیں۔" مہرو نے نتیجہ ظاہر کیا۔

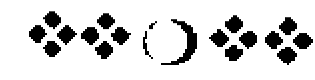
"وارث! آپ شادی کیوں نہیں کرتے؟" ایک اور سوال اُبھرا۔

"روبوٹ کی شادی ہوتی ہے کیا؟" سوال کے جواب میں سوال آیا۔

"ہوسکتا ہے ہمسفر آپ کو روبوٹ سے انسان بنادے۔" مہرو کا کمنٹ اب کے

وارث کو ہنسنے پر مجبور کر گیا۔ وہ دیر تک ہنستے رہے اور مہرو دیر تک انہیں دیکھتی رہی۔ اس کا دیکھنا وارث کو ایک پل کے لئے چونکا گیا۔ وارث نے اسے دیکھا تو وہ باہر دیکھنے لگی اور وارث ونڈ اسکرین پہ نظر جمانے لگے۔ لیکن سامنے شیشے میں بھی وہی روپ جھلملا رہا تھا جو شاعر کی نظموں میں سے بوتل کے جن کی طرح دھواں بن کے اُبھرتا تھا...... چاندنی راتوں اور برستی بوندوں میں جھلملاتا تھا...... اوس بن کے پھولوں پہ چمکتا تھا...... جو محبت بن کے سانس کی رگوں میں اور دل کی شریانوں میں زندہ تھا...... ازل سے زندہ تھا۔

وارث نے اپنی گردن جھٹکی اور گاڑی کو ٹرن کر کے دوسری سڑک پر ڈال دیا۔



''بہت عجیب اور حیران کر دینے والی باتیں بتائیں اس عورت نے۔ یقین کرو ہمایوں! میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کروں۔ لیکن کچھ کرنے یا نہ کرنے کا سوال تو بعد میں اٹھتا ہے۔ پہلے میں ہی تو یقین کر لوں کہ وہ عورت جو کہہ رہی ہے، وہ سچ بھی ہے یا جھوٹ؟'' شہرین نے ہمایوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''لیکن اس عورت کو جھوٹ بولنے کی آخر ضرورت ہی کیا ہے؟ اور وہ بھی اتنی بڑی پولیٹیکل فگر کے لئے۔ مجھے تو اس کی بات کی ہر ہر کڑی سچ لگتی ہے۔'' ہمایوں نے کہا۔

''لیکن تم ہی سوچو ہمایوں! کیا ایسا آج کی دنیا میں ہوتا ہے؟ پریکٹیکل لائف، پریکٹیکل لائف ہوتی ہے۔ سنڈریلا یا پریوں کی کہانی نہیں ہوتی۔ اور پھر وہ عورت پچھلے سولہ برس سے پاگل خانے میں ہے۔ پتہ نہیں اس کا دماغی توازن درست بھی ہے کہ نہیں۔'' شہرین نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''ضروری نہیں ہے شہرین! کہ جو عورت اپنی عمر کا زیادہ حصہ پاگل خانے میں گزارے، وہ واقعی پاگل ہو۔ اس کی رپورٹس غلط بھی ہو سکتی ہیں۔ وہ پاگل نہیں ہے۔ بہرحال اپنی تسلی کے لئے تم اس کے دوبارہ سے ٹیسٹ کروا لو۔ کوئی بھی پاگل عورت اس طرح کی باتیں نہیں کر سکتی جو، لوجیکلی درست ہوں۔'' ہمایوں نے اسے قائل کرنا چاہا۔

''تو پھر اب مجھے کیا کرنا چاہئے؟''

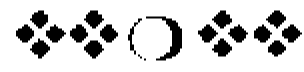
''تم اپنے کیس کا لائحہ عمل خود تیار کرو۔ اسٹیپ بائی اسٹیپ۔ پراپرٹی بھی ٹرانسفر کراؤ لیکن اس عورت کی کہانی بھی دنیا پہ واضح کرو۔ وہ عورت مظلوم ہے اور مظلوم کو انصاف دلانا ثواب ہوتا ہے۔'' ہمایوں نے مدبرانہ انداز اپنایا۔

''میں بہت اُلجھی ہوئی ہوں۔'' اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

''اس کے لئے اپنے چیمبر سے باہر نکلو اور میرے ساتھ چل کے کہیں لنچ کرو اور لنچ کرنے کے بعد اچھی سی کافی پیو۔ میں تمہیں تمہارے گھر ڈراپ کر دوں گا اور آرام کی نیند سو کے کل صبح فریش ہو کے کورٹ آؤ۔ اپنا بہت سارا خیال رکھو ورنہ بہت مشکل ہو گی۔'' ہمایوں نے مسکرا کے مشورہ دیا۔

شہرین نے فائل بند کر دی۔

''میرا خیال ہے تمہارا آئیڈیا بہترین ہے۔'' اس نے بیگ اٹھا کے ہمایوں کے ہمراہ قدم بڑھا دیئے۔



یونیورسٹی کے آرکیٹیکچر کا پورا گروپ پکنک کے لئے ہاکس بے آیا ہوا تھا۔ یوشیپ کے پتھروں سے پانی کی لہر آ کے ٹکراتی اور سفید سفید جھاگ جابجا بکھر جاتی۔ انہی پتھروں کے اوپر عتیقہ بیٹھی ماہا اور شائل کو دیکھ رہی تھی۔ شائل، ماہا سے کوئی بات کر رہا تھا اور ماہا کھلکھلا کے ہنس رہی تھی۔ شائل کے ہاتھ میں کوکا کولا کا ایک ٹین پیک بھی تھا۔ اس کی دودھیا رنگت دھوپ کی وجہ سے گلابی ہو رہی تھی۔

عتیقہ کا دل بے وجہ اُداس ہو رہا تھا۔ اپنی محبت کو کسی اور کے ساتھ مسکراہٹ بانٹتے دیکھنا کس قدر اذیت ناک ہوتا ہے...... روح میں شعلے سلگ اٹھتے ہیں۔ آنکھیں سمندر جیسے پانی سے بوجھل ہونے لگ جاتی ہیں۔ شریانوں میں دوڑتا لہو لمحہ بھر کو منجمد سا ہو جاتا ہے۔ بے چینی روم روم میں اُتر آتی ہے۔

وہ کتنی دیر تک اسی طرح سے شائل کو دیکھتی رہی۔ نجانے کیا تھا اس چہرے میں۔ وہ چہرہ، جس نے محبت کا جادو جگایا تھا۔ حرف و لفظ کے معنی تبدیل کر کے رکھ دیئے تھے۔ احساسات کے صحرا میں نئی لہریں پیدا کر دی تھیں۔ منجمد برف سے جذبوں کو آگہی کی تپش عطا کی تھی۔ ستارے پہلے بھی ستارے تھے مگر ان کی چمک یکا یک بدل

گئی تھی۔

پھول پہلے بھی پھول تھے مگر خوشبو کے در احساس پہ اب وا ہوئے تھے۔

دل پہلے بھی دھڑکتا تھا مگر دھڑکنوں کو نئی نئی آہٹیں اب محسوس ہوئی تھیں۔

عتیقہ عثمان کا مغرور دل شمائل علی کی یکطرفہ محبت میں چڑیا کی طرح قید تھا۔ چڑیا پَر پھڑپھڑا رہی تھی۔ محبت تڑپ رہی تھی۔

''آپ کو سمندر اچھا لگتا ہے میم؟'' شمائل نے اچانک ہی یہ جملہ کہا تھا۔

''خوبصورتی کسے اچھی نہیں لگتی؟ ساحل، ساحل پہ بکھرے خوب صورت پتھر اور ان سے ٹکراتا، جھاگ اُڑاتا پانی، وسیع سمندر جس کی حدیں وہاں ختم ہوتی ہیں جہاں آسمان شروع ہوتا ہے۔ کاش میں کوئی پرندہ ہوتی۔ آسمان کی وسعتوں میں اُڑان بھرتی۔ ایک ساحل سے دوسرے ساحل تک سفر کرتی۔ آسمان ہوتا، سمندر ہوتا اور میں ہوتی۔'' ماہا نے دور سمندر کی گہرائیوں پہ نظر ٹکا کے کہا۔

سبھی یہ رشتے تمہارے میرے بدن کے رشتوں کا سلسلہ ہیں
تمہیں خبر ہے
کہ ہم سمندر اور آسمانوں کی انتہا ہیں

شمائل نے اپنی گہری آنکھوں سے ماہا کو دیکھ کے نظم پڑھی۔

''بہت اچھی نظم ہے.......تمہیں شاعری بھی آتی ہے؟''

''ارے میم! شاعر کہلاتے ہیں ہم دوستوں کے بیچ۔ کچھ سالوں سے رسالوں میں بھی نظمیں چھپوا رہے ہیں۔ لوگ بہت سراہتے ہیں۔'' شمائل نے کالر جھاڑے۔

''ارے واہ! پڑھانا ضرور کسی دن اپنی شاعری۔''

''آپ کی سمجھ میں آئیں گے میرے دل کے جذبے؟'' شمائل نے ذومعنی بات کہی۔

''اتنی بھی ناسمجھ نہیں کہ شاعری نہ سمجھ سکوں۔'' ماہا مسکرا دی تھی۔



وارث چائے کا مگ اٹھائے ٹیرس میں آ گئے تھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ وہ چائے پیتے پیتے اخبار دیکھیں گے اور کچھ فیکٹری کے کاغذات پہ نظر ڈالیں گے کہ آج رات کو

سردار صاحب نے آنا تھا اور آتے ہی انہوں نے تمام بزنس میٹرز کے متعلق پوچھنا تھا۔ ابھی وارث نے چائے کا پہلا گھونٹ بھر کے اخبار پہ نظر ڈالی ہی تھی کہ ان کی نظر سامنے والے منظر پہ پڑی اور ٹھہر گئی۔

گلابی رنگ کی شلوار قمیض میں گلاب اور چنبیلی کی کیاریوں کے پاس ہاتھ میں باسکٹ تھامے وہ مہرو تھی۔ وہ گلاب اور چنبیلی کے پھول توڑ کر باسکٹ میں رکھے جا رہی تھی۔

یہ منظر کتنا خوبصورت اور اصل تھا۔ وارث نے لمحہ بھر کو سوچا۔

کیا اس طرح کی خوبصورتی دنیا میں کہیں ہوتی ہے؟.......کیا سچائی کا کوئی روپ اتنا متاثر کن ہوتا ہے؟.......کیا دھوپ، بادل، کرنیں، برف، جھرنے اتنے حسین ہوتے ہیں؟.......کیا ان میں وہ بات ہوتی ہے جو اس لڑکی میں ہے؟.......اس لڑکی کی ہر ہر چیز اتنی جاذب نظر کیوں ہے؟

یہ لڑکی ہنسے، روئے، بسورے، عجیب طرح کی شکلیں بنائے، غصہ کرے، چیخے یا چاہے کچھ بھی کرے، یہ ہر روپ میں اچھی کیوں لگتی ہے؟.......اس کے اندر وہ کون سی کیمیائی کشش ہے جو دل کی کھردری اور زنگ آلود دھرتی پہ ریت کے کاغذ اور ریگمال کی طرح لگتی ہے اور احساسات کو رگڑتی ہے....... کتنے سالوں سے اس نے رگڑا ہے۔ احساسات کو رگڑ رگڑ کے دل کی دنیا کو بہت صاف، بہت سیدھا، بہت ہموار کر دیا ہے۔ کیا ہے اس لڑکی کے اندر؟

یہ جو سردار صاحب کی بیٹی ہے، جسے میں پچھلے کئی برسوں سے کسی پودے کی طرح بڑھتا ہوا دیکھتا آیا ہوں، یہ جو اتنے برسوں میں اک خوبصورت شجر کی طرح بن گئی ہے، جس میں ہزاروں رنگ برنگے پھول کھل اُٹھے ہیں....... یہ لڑکی جو میرے لئے جنت کے ممنوعہ شجر کی طرح ہے، جسے چھوا یا جس کے پھل کو کھایا تو مجھے جنت سے نکال دیا جائے گا اور اس شجر کو چھونا یا اسے پانے کی خواہش کرنا میرے لئے نمک حرامی کے مترادف ہوگا۔

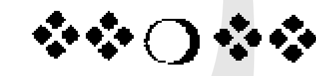
اتنے برسوں سردار صاحب نے مجھے اپنے بچے کی طرح پالا، اعلیٰ تعلیم اور اعلیٰ طرز زندگی عطا کیا۔ اس صورت میں کیا یہ سوچنا بھی جائز ہے؟

نہیں، نہیں، نہیں.......دماغ نے تین بار دل پر زوردار ہتھوڑے برسائے۔

دل بے چارہ سہم سا گیا۔

وارث نے اپنی آنکھوں کے سامنے والے منظر کو آنکھیں موند کے مٹانا چاہا۔ سورج کی طرف پیٹھ کر کے وہ رات کا دعویٰ کرنا چاہتے تھے۔

انہوں نے اپنا دھیان اخبار میں لگانے کی کوشش کی۔



مہرالنساء ریموٹ کنٹرول ہاتھ میں اٹھائے ٹی وی کے چینل تبدیل کئے جا رہی تھی۔ اس کی گود میں ایک فیشن میگزین بھی کھلا پڑا تھا۔ آنکھیں نہ ٹی وی پہ تھیں اور نہ رسالے پہ۔ کسی غیر مرئی نقطے پہ اٹکی تھیں اور ذہن میں کئی طرح کے خیالات اُلجھے ہوئے تھے۔

اسی لمحے لاؤنج کی طرف آنے والا دروازہ کھلا اور وارث کے ہمراہ بابا اندر آئے۔ سردار واجد کو دیکھ کر مہرو کے چہرے پر پھول کھل اٹھے۔ وہ دوڑتی ہوئی آئی اور سردار صاحب سے لپٹ گئی۔ سردار صاحب نے اس کے سلکی براؤن بالوں میں ہاتھ پھیرے۔

''کیسی ہیں آپ بیٹا؟'' بابا کا رویہ ہمیشہ کی طرح تھا۔ تکلف سے بھرا اور سرد۔ مہرو کے دل کو اور ٹھیس سی لگی۔

سردار صاحب نے اسے اپنے سے الگ کیا، اس پر ایک نظر ڈالی اور یہ نظر انہیں برسوں پہلے کے شب و روز میں لے گئی۔ وہ شب و روز جنہوں نے حال کو بھی ماضی کے بے رحم پنجرے میں جکڑ کے رکھا تھا۔ جنہوں نے زندگی کی تمام شاموں کو بے کیف اور تمام راتوں کو بے چین کر دیا تھا۔

مہرو کا چہرہ زیب کا چہرہ تھا۔ لیکن نہیں، زیب حد درجہ خوبصورت تھیں۔ مہرو سے لاکھ درجہ خوبصورت!.......سردار صاحب نے اپنی توجہ بدلنی چاہی۔

''فیکٹری کی کیا پوزیشن ہے وارث.......؟'' انہوں نے وارث کی طرف متوجہ ہو کے کہا۔

''بہتر ہے۔ ورکرز اور یونین کے کچھ مسائل چل رہے ہیں۔ میں آپ کو بعد میں

آگاہ کر دوں گا۔'' وارث نے کہا۔

''اور زین کیسا ہے؟'' ایک اور سوال۔

''زین بالکل ٹھیک ہے....... بات اکثر ہوتی رہتی ہے۔ ان کے پاس موبائل فون ہے۔'' وارث نے اطلاع دی۔

''ٹھیک ہے.......ہم اس سے بات کریں گے کھانے کے بعد۔''

''بابا! میں نے آپ کے لئے خود کھانا بنایا ہے۔ آپ میرے ساتھ کھائیں گے نا؟'' مہرو نے اپنا وجود جتانا چاہا۔ سردار صاحب سوچ میں پڑ گئے۔

''بیٹا! ابھی ہم بہت تھک گئے ہیں۔ ذرا سا آرام کریں گے۔ اس کے بعد فیکٹری میٹرز وارث سے ڈسکس کرنے کے بعد کھانا کھائیں گے۔ آپ کھانا کھا لو۔ اتنی دیر تک جاگنا آپ کے لئے ٹھیک نہیں۔'' اپنے روایتی لہجے میں کہتے ہوئے سردار صاحب وارث کے ہمراہ سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے تھے اور مہرو کے دل میں توڑ پھوڑ شروع ہو گئی تھی۔ ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگی تھیں۔ وہ بھاگتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی گئی تھی۔



وارث کتنی دیر سے اس کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا رہے تھے مگر وہ کھول نہیں رہی تھی۔ اور بہت دیر بعد جب اس نے دروازہ کھولا تو وارث اس کا چہرہ دیکھ کے ہی سمجھ گئے کہ وہ روتی رہی ہے۔ سوجی ہوئی سرخ آنکھیں، اسی طرح کی سرخ ناک اور بکھرا بکھرا چہرہ۔

''میں آپ کے لئے کھانا لایا ہوں مہرو!'' وارث بہت مان سے کمرے کے اندر آ گئے تھے اور ہاتھ میں پکڑی ٹرے ٹیبل پہ رکھ کے خود صوفے پہ براجمان ہو گئے۔

''مجھے بھوک نہیں۔ اور ویسے بھی میں سو رہی تھی۔'' بھاری آواز میں اک جھوٹ کا تاثر تھا۔

''سو رہی تھیں یا پھر رو رہی تھیں؟'' وارث نے بھانپ لیا۔ وہ بیڈ پہ بیٹھ گئی۔

''جب سب پتہ ہوتا ہے تو پوچھنے کیوں آتے ہیں؟'' نمکین پانی ایک بار پھر آنکھوں سے اُبل پڑا تھا۔ وارث اُٹھ کے اس کے پاس آئے۔

''کیا بات ہے؟...... کیوں رو رہی ہیں؟''

''آپ نے دیکھا نہیں وارث! بابا چھ مہینے بعد آئے اور ان کا رویہ کیسا تھا میرے ساتھ۔ میرا کیا قصور ہے وارث؟ کیوں وہ مجھے پیار نہیں کرتے؟ زین کو تو وہ کس قدر پیار کرتے ہیں۔ اسے گود میں بٹھاتے ہیں، اسے چومتے ہیں، اس کے ساتھ اس کی پرابلمز ڈسکس کرتے ہیں۔ اور میں...... مجھ سے تو وہ اس طرح ملتے ہیں جیسے میں ان کی بیٹی نہیں، گھر کے کسی نوکر کی یا عام فرد کی بیٹی ہوں۔'' وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''ایسی کوئی بات نہیں مہرو! زین چھوٹا ہے۔ لاڈ کرتا ہے۔ حساس ہے۔ مگر آپ تو بڑی ہیں، سمجھ دار ہیں، پڑھی لکھی ہیں۔ سردار صاحب اس لئے رویے میں فرق رکھتے

ہیں۔ ورنہ آپ کے اور زین کے مابین کوئی فرق نہیں ان کے لئے۔'' وارث نے اسے سنبھالنا چاہا۔

''یہ دلاسے میں پچھلے بیس برس سے سنتی آ رہی ہوں وارث! اور دینے والے بھی آپ ہی ہیں۔ بچی تھی تب۔ بہل جاتی تھی رو دھو کے، آپ سے ناراض ہو کے۔ جب آپ کوئی گڑیا لا دیتے تو چپ ہو جاتی۔ فراموش کر دیتی۔ مگر اب نہیں بہلتا میرا دل ان بے کار بہلاوؤں سے۔ ان بے وجود دلاسوں سے۔ میں اب بچی نہیں ہوں وارث!'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

''مہرو! آپ مت روئیں۔'' انہوں نے اس کے کندھے پہ ڈرتے ہوئے ہاتھ رکھ دیئے اور نتیجے میں وہ ان کے کندھے سے لگ کے بلکنے لگی۔

''وارث! میرا کوئی نہیں ہے...... میں بہت تنہا ہوں...... محبت کی بہت کمی ہے میری زندگی میں۔ میری زندگی میں آپ کے سوا اور کوئی نہیں...... مجھے اپنے دامنِ دل میں سمیٹ لیجئے وارث!...... پلیز میری پیاسی زندگی کو اپنی محبت دے دیجئے۔''

وہ رو رو کے کہہ رہی تھی اور وارث پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس شدت پسند لڑکی کا اعترافِ محبت سن رہے تھے...... حیران تھے، پریشان تھے۔ ان کی دھڑکنوں کی رفتار دوڑ لگا رہی تھی۔ تو کیا یہ جذبے دو طرفہ تھے؟...... کیا احساسات کی آگ کا الاؤ مہرو کے دل میں بھی تھا؟...... کیا محبت کے نیلے موسم نے مہرو کے دل کو بھی لپیٹ میں لے رکھا تھا؟...... وارث نے اسے خود سے الگ کیا۔

''نہیں مہرو! میں تہی داماں ہوں...... میں آپ کو کچھ نہیں دے سکتا۔'' یہ کہتے ہوئے وارث کمرے سے جانے لگے۔ عقب میں مہرو کی سسکیاں تھیں اور ان سسکیوں میں ایک آواز تھی۔

''میری ذات کو پاش پاش ہونے سے بچا لیجئے وارث!...... مجھے اپنا لیجئے۔'' وہ تڑپ رہی تھی۔



جیسے ہی شمائل کی آنکھ کھلی تو اس کی سماعت سے عادل بھائی اور حافظ بھائی کی کھٹ پٹ کی آواز ٹکرائی۔ وہ کروٹ بدل کے سونا چاہتا تھا مگر ان کی لڑائی فل والیم میں تھی،

جسے ریموٹ کنٹرول سے نہ کم کیا جا سکتا تھا اور نہ آف۔ مجبوراً شمائل کو بستر سے نکلنا پڑا اور اس جگہ پہنچنا پڑا جہاں عادل اور حافظ کے مابین یہ جنگ عظیم سوئم جاری تھی۔ وہاں جا کے پتہ چلا کہ یہ لڑائی شیونگ کریم کے چوری ہونے پر ہے۔

حافظ بھائی چاہتے ہیں کہ انہی کی طرح عادل اور شمائل بھی داڑھی بڑھا لیں اور سنت کی پیروی کریں۔ شمائل تو اپنی نرم گفتاری سے حافظ بھائی کو کونس کر لیتا تھا لیکن عادل احتجاج پہ اتر آتا تھا اور نتیجتاً اپنے فرض کی تکمیل کے لئے حافظ نے عادل کی شیونگ کریم چرا لی تھی اور عادل چیخ رہا تھا۔

''ابے او مولوی کی اولاد! بتا میرا شیونگ فوم کہاں ہے؟ .... آج میرا انٹرویو ہے۔ میرا شیو کرنا لازمی ہے۔'' عادل چیخ رہا تھا۔

''انٹرویو میں شیو نہ کرنے کے متعلق اگر سوال پوچھیں تو کہہ دینا سنتِ نبویؐ کی پیروی کرنے کی نیت ہے۔'' حافظ نے ڈھٹائی سے کہا۔

''اے میرے باپ! یہ نیت مجھ سے کل کروا لینا۔ آج میرا فوم مجھے دے دے۔ خدا اور رسول کے واسطے، دے دے۔ بڑا ضروری انٹرویو ہے میرا۔ آگے ہی مجھے دیر ہو گئی ہے۔'' عادل کی آواز غصے سے کم اور مجبوری سے زیادہ لرز رہی تھی۔

شمائل اپنا چشمہ پہنتا ہوا ان تک آیا اور پیار سے حافظ کو سمجھانے لگا۔

''حافظ بھائی! پلیز اسے اس کا شیونگ فوم دے دیں۔ آج اس کا انٹرویو ہے۔ بہت لازمی، بہت ضروری۔ اور پھر آپ جیسے شریف انسان کو یہ حرکت کرنے کی کیا ضرورت ہے؟''

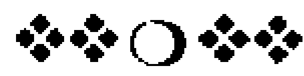
''شرافت ہی تو راس نہیں آتی لوگوں کو۔ پوچھو اس فلمی اداکار کی اولاد سے کہ میری نماز کی تمام ٹوپیاں اور تسبیحاں کہاں چھپا کے رکھی ہیں؟ فجر کی نماز بھی میں نے رومال باندھ کے ادا کی ہے۔ انگلیوں پہ تسبیح پڑھی ہے۔ اگر میں خدا کے سامنے بنا مکمل کوائف کے حاضری دے سکتا ہوں تو کیا یہ نانہجار بنا شیو کے انٹرویو میں حاضری نہیں دے سکتا؟'' حافظ بھائی بھڑک اٹھے۔

''عادل بھائی! آپ کو بھی ایسی حرکت نہیں کرنی چاہئے۔ سدھر جائیں۔ واپس کریں ان کی چیزیں۔'' شمائل نے عادل کو جھڑکا۔

''کیا یار شمائل! تُو بھی مجھ پہ بھڑکتا ہے؟'' عادل غرایا۔

''آپ کی حرکتیں ہی ایسی ہوتی ہیں۔ بے چارے حافظ بھائی شریف النفس انسان ہیں۔ اللہ کی راہ پہ چلنے والے۔ ان کو تو نہ ستایا کریں۔''

''اللہ کی راہ پہ چلنے والے سے کہو شمائل! کہ حقوق العباد، حقوق اللہ سے پہلے آتے ہیں۔ لاؤ میرا شیونگ فوم اور الماری سے نکال لو اپنی چیزیں۔'' غصے سے گھورتے ہوئے عادل نے کہا۔ حافظ بھی شیونگ کریم لینے چلا گیا۔ شمائل نے چین کا سانس لیا۔



یار کو ہم نے جا بجا دیکھا
کہیں ظاہر کہیں چھپا دیکھا
کہیں ممکن ہوا کہیں واجب
کہیں فانی کہیں بقا دیکھا
کہیں وہ بادشاہ تخت نشیں
کہیں وہ در لباس معشوقاں
برسرِ ناز اور ادا دیکھا
کہیں عاشق نیاز کی صورت
سینہ گویاں و دل جلا دیکھا
یار کو ہم نے جا بجا دیکھا
کہیں ظاہر کہیں چھپا دیکھا
یار کو ہم نے جا بجا دیکھا

وہ سمندر کے کنارے کھڑا تھا۔ رات کے کسی درمیانے پہر میں۔ بارہویں کا چاند آسمان کے عین درمیان میں تھا اور سمندر چاند کے فراق میں تڑپ تڑپ کے ساحل کے پتھروں سے سر ٹکرا رہا تھا، جھاگ اُڑا رہا تھا، دیوانہ ہو رہا تھا اور اسی سمندر کی طرح دیوانہ ہو رہا تھا وارث حسن خان کا دل........ وہ دل جو سمندر ہی کی طرح چاند کا خواہاں تھا........ مہرالنساء کے ساتھ کا خواہاں تھا۔

زمین سے آسماں تک، سمندر کی آخری حد تک جہاں آسمان کی سرحد شروع ہوتی تھی اور آسمان کی حدِ نظر تک پھیلی وسعتوں تک وہ متلاشی تھا، اس ہستی کا، اس ذات کا جسے وارث نے ہر ہر شے کے اندر پایا تھا، محسوس کیا تھا، دیکھا تھا۔ جس سے اس کے ہر درد کا واسطہ تھا۔ جو اس کے ہر درد کا درمان تھا۔ ہر غم کا مداوا تھا۔ جو اس کے دل کا دوست تھا۔ جو اس کے اندر کا حال جانتا تھا۔ جس نے اسے کہیں بھی، کبھی بھی تنہا نہ چھوڑا تھا۔ جو اسے ستر ماؤں سے بھی بڑھ کر چاہتا تھا۔ جو اس کا اور سارے جہان کا رب تھا۔

یار کو ہم نے جا بجا دیکھا
کہیں ظاہر کہیں چھپا دیکھا

وہ جب بھی کبھی اُداس ہوتا تھا، اسی طرح سمندر کے کنارے آ کے آسمان کی کوئی حد تلاشتا تھا، کوئی کونہ ڈھونڈتا تھا اور اپنے رب سے باتیں کرنے لگ جاتا تھا۔ اُس نے اپنے مالک سے ہر درد بانٹا تھا۔ ہر دکھ کا مداوا چاہا تھا۔ اور آج وارث حسن خان کے دل میں پیدا ہوا تھا ایک دائمی درد جسے دردِ محبت کہتے ہیں اور محبت بھی وہ جو ملنا ممکن نہ ہو۔ جو عشق لاحاصل بنا سینے میں سلگتا رہے۔ تا عمر تڑپتا رہے۔ جو عشق دل کو معذور کر دے، جو حواس اور اوسان پہ چھا کے انہیں ماؤف کر ڈالے۔

ایسا عشق اور ایسے میں آج پھر وارث کسی مداوے، کسی درماں کا خواہشمند تھا۔ جو دل کے کھلے ہوئے جلتے زخموں پہ اک ٹھنڈا پھاہا رکھ دے، مرہم رکھ دے۔

’اے میرے مالک! اے مالکِ خیر و شر! اے سانس کی شریانوں سے بھی نزدیک ہو کے التجائیں سننے والے! مجھے بخش دے۔ میں تیرا گنہگار، سیاہ کار بندہ ہوں۔ میرے دل میں تُو نے ایسی آرزوئیں کیوں جگائی ہیں میں جن کے لائق نہیں؟ جن کا ہونا ممکن نہیں۔ میرا دل چاند کا خواہاں ہونے کیوں چلا ہے؟ میرا دل کیوں تڑپ رہا ہے؟ میرے دل اور میرے جذبات کو میرے قابو میں رکھ میرے مالک! میری خواہشوں کو ان کی اوقات نہ بھولنے دے....... میری تمناؤں کو میرے جسم کی سرحد کے اندر رکھ میرے مالک!....... میں مہرو کو کیوں سوچ رہا ہوں؟ کیوں چاہ رہا ہوں؟ کیوں مانگ رہا ہوں؟ جب کہ یہ ممکن بھی نہیں۔ یہ آسان بھی نہیں۔ پھر کیوں؟.......

کیوں؟....... کیوں؟....... مہرو کا خیال میرے ذہن و دل سے نکال دے میرے پروردگار! مہرو کا خیال نکال دے۔‘

سمندر جس طرح ٹھاٹھیں مارتا چاند تک پہنچنے کی سعی کرتا تھا، وارث کا دل بھی اسی طرح تڑپتا، سلگتا رہا۔



’’مہرو! آپ آج کل کیا کر رہی ہیں؟‘‘ ناشتے کی ٹیبل پہ چھری کانٹے سے ٹوسٹ انڈا کھاتے ہوئے سردار واجد نے مہر النساء سے پوچھا۔

’’کچھ خاص نہیں بابا! ایم اے کے پیپرز سے فارغ ہو کر رزلٹ ہی کا انتظار کر رہی تھی۔‘‘ اس نے کہا۔

’’گڈ....... اس کا مطلب آپ فارغ ہیں؟‘‘

مہرو نے گردن اثبات میں ہلائی۔

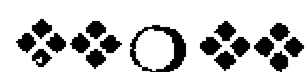
’’تو پھر آپ ایسا کریں، اپنا سامان پیک کر لیں۔ آپ وارث کے ہمراہ لاہور جا رہی ہیں کل۔‘‘ سردار صاحب نے بے حد اطمینان سے کہا۔

’’لاہور؟....... لیکن کیوں بابا؟‘‘ مہرو حیران ہو کے سردار صاحب کو دیکھتی رہی۔

’’دراصل بیٹا! اگلے ماہ ہمارے الیکشن شروع ہو رہے ہیں۔ ہم یہاں کراچی میں رہیں گے۔ لوگوں کا آنا جانا لگا رہے گا۔ پریس کانفرنس، سیمینار وغیرہ وغیرہ۔ اور ایسے میں ہم آپ کو ڈسٹرب کرنا نہیں چاہتے۔ اور یوں بھی آپ لاہور والے گھر میں زیادہ محفوظ رہیں گی۔‘‘ انہوں نے کہا۔

’’لیکن بابا! قصرِ زیب میں بھی ہم محفوظ ہیں۔ یہ ہمارا اپنا گھر ہے اور پھر یہاں سے جانے کا بھلا کیا جواز ہے؟‘‘ وہ اُلجھ رہی تھی۔

’’بیٹا! آرگیومنٹس نہیں کیا کرتے۔ کہہ دیا کہ آپ جائیں گی تو جائیں گی۔ میں وارث سے کہتا ہوں کل کے ٹکٹ بنوا لیں۔ اور آپ تیاری مکمل کر لیں۔‘‘ حتمی طور پہ کہتے ہوئے سردار صاحب ٹیبل سے اٹھ گئے تھے اور مہرو دیر تک کانٹے سے ٹوسٹ کو کچوکے لگاتی رہی تھی۔



''ضحیٰ! مجھے پریشان مت کرو۔ میں کام کر رہی ہوں۔'' فائل پہ ایک ڈائیگرام بناتی ہوئی ماہا نے ننھی ضحیٰ کو جھڑکا جو مسلسل اس کے گھٹنے کو چھیڑ کر اسے اٹھنے کا کہہ رہی تھی۔

''مما! مجھے نوڈلز چاہئیں۔'' ضحیٰ بسوری۔

''بیٹا! ذرا دیر ٹھہر جاؤ۔ یا پھر پھپھو سے کہہ دو۔ مما کام کر رہی ہیں نا۔'' اس نے سمجھانا چاہا۔

''نہیں مما! مجھے ابھی چاہئیں۔ بعد میں آپ کام کر لیجئے گا۔ مجھے ابھی ابھی چاہئیں نوڈلز۔'' وہ ماں کے گھٹنے کو نوچتی رہی۔

''ضحیٰ! تنگ مت کرو۔'' اس نے غصے سے ضحیٰ کو گھورا۔ ضحیٰ کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔ وہ منہ بسور کے نم آنکھوں کے ساتھ اس سے دور ہو گئی اور ساتھ والے صوفے پہ بیٹھ کے رونے لگی۔

''ضحیٰ! رونا مت۔ بس پانچ منٹ میں، میں بنا دیتی ہوں۔'' ماہا نے نرمی سے کہا۔

اسی لمحے عاشر کے ہمراہ شائل اندر آیا۔ عاشر کے ہاتھ میں بیٹ تھا اور وہ گیم کھیلنے کے لئے بالکل تیار نظر آ رہا تھا۔ شائل نے ہلکے نارنجی رنگ کی ٹی شرٹ اور بلیو جینز پہن رکھی تھی۔ اس کا چہرہ بہت نکھرا ہوا اور تازہ لگ رہا تھا۔

''گڈ ایوننگ میم!'' شائل نے ماہا کی طرف مسکرا کے دیکھا اور کہا۔

''ارے شائل! تم اس وقت؟'' اس نے اپنے کھلے ہوئے بال کلپ میں قید کیے۔

''مما! میں نے شوبی بھائی کو کرکٹ کھیلنے کے لئے بلایا تھا۔ اب یہ ہر فرائیڈے میرے ساتھ میچ کھیلیں گے۔'' شائل کی جگہ عاشر نے جواب دیا۔

''تم ہر فرائیڈے کو اتنی دور سے صرف عاشر کے ساتھ میچ کھیلنے آؤ گے؟'' ماہا نے براہِ راست شائل سے پوچھا۔

وہ مسکرا دیا۔ کہنا تو چاہتا تھا کہ میں اتنی دور سے فقط آپ کو دیکھنے آتا ہوں، آپ کی باتیں سننے آتا ہوں، آپ کے ساتھ وقت گزارنے آتا ہوں۔ ہر ہفتے کیا میں تو روز آ سکتا ہوں۔

''کوئی مسئلہ نہیں میم! مجھے بھی تو عاشر اور ضحیٰ کے ساتھ وقت گزارنا بے حد پسند ہے۔'' شائل نے مسکرا کر کہا۔

منہ بسورے بیٹھی ہوئی ضحیٰ بھی اب نارمل ہو گئی تھی اور شائل کی طرف متوجہ تھی۔ ماہا بھی خاموش ہو گئی۔ اپنے بچوں کے لئے شائل کے دل میں اس طرح کے احساس دیکھ کر اسے بھی بے حد خوشی ہوئی۔

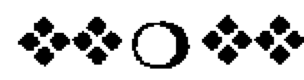
اولاد ایک ایسی کسوٹی ہے جس پہ آپ پوری دنیا کو پرکھتے ہیں۔ جو اولاد کو چاہے، وہ کسوٹی پہ پورا اترتا ہے۔ جو اولاد کو نہ چاہے، وہ آپ کو چاہے کتنا ہی عزیز کیوں نہ ہو، دل سے اتر جاتا ہے۔ اللہ کی کتاب میں ٹھیک لکھا ہے کہ زر، زمین اور اولاد میں تمہاری آزمائش ہے۔

دل کیسا کھل اٹھتا ہے اگر کوئی ہماری اولاد کو چاہے، اسے پیار بھری نظروں سے دیکھے، اس کے لئے اچھا سوچے۔ چاہے وہ کتنا ہی غیر ہو، اپنا اپنا سا لگتا ہے، قابلِ احترام لگتا ہے۔ اور اگر کوئی ہماری اولاد سے نفرت کرے، اسے ستائے، دھتکارے، تڑپائے تو وہ چاہے جتنا ہی اپنا ہو، غیر لگتا ہے۔ قابلِ نفرت، قابلِ تحقیر لگتا ہے۔

آزمائش فقط اولاد میں ہی ہے۔

کسوٹی فقط اپنا خون ہی ہے۔

''اچھا جاؤ........ آپ لوگ اپنا میچ کھیلو۔ مجھے کچھ کام کرنا ہے۔'' ماہا نے چشمے کے فریم کے اوپر سے دیکھ کے کہا اور شائل، عاشر اور ضحیٰ کو لے کر گیند بلا اٹھا کر سیڑھیاں اترنے لگا۔



اسے کہنا دسمبر آ گیا ہے
دسمبر کے گزرتے ہی برس اک اور ماضی کے گھپ اندھیرے میں ڈوب جائے گا
اسے کہنا دسمبر لوٹ آئے گا
مگر جو خون سو جائے گا جسموں میں
نہ جاگے گا
اسے کہنا، ہوائیں سرد ہیں
اور زندگی کہرے کی دیواروں میں لرزاں ہے
اسے کہنا شگوفے ٹہنیوں میں سو رہے ہیں

اور ان پر برف کی چادر بچھی ہے
اسے کہنا اگر سورج نہ نکلے گا
تو کیسے برف پگھلے گی
اسے کہنا کہ لوٹ آئے

مہرو نے اس کے کمرے کا دروازہ ہلکے سے کھٹکھٹایا اور جواب کا انتظار کئے بغیر ہی اندر آ گئی۔ اور اسے دیکھ کر وارث ذرا گھبرا سا گئے۔ رات کے ڈیڑھ بجے کا عمل تھا اور اتنی رات گئے مہرو کا اس طرح سے آنا۔ اتنے سالوں سے وہ کبھی ایسے نہیں آئی تھی اور اس کے چہرے پہ بکھرے آثار بتا رہے تھے کہ وہ روئی ہے۔ سرخ زرد رنگ کی شال میں لپٹی۔ بکھرے بکھرے چہرے والی لڑکی کے خدوخال میں درج تھا کہ وہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ تڑپ رہی ہے۔ کسی اَن دیکھے عذاب سے گزر رہی ہے۔

وارث جو آرام دہ کرسی پر بیٹھے آسکر وائلڈ کی کوئی کتاب پڑھ رہے تھے، کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ سامنے دیوار پر لگی گھڑی دیکھی اور ایک بار پھر مہرو کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں کی نمی اور چہرے کے تاثرات اس کے دل کے غماز تھے۔

''آپ اس وقت یہاں کیا کر رہی ہیں؟'' انہوں نے قدرے اجنبیت سے کہا۔

''آپ سے کچھ بات کرنے آئی ہوں۔'' وہ آنکھیں غیر مرئی نقطے پہ ٹکا کے بولی۔

''بات؟...... کیسی بات؟ کیا اس بات کے کرنے کے لئے صبح ہونے کا انتظار نہیں کیا جا سکتا تھا؟ رات کے اس پہر اس طرح سے میرے کمرے میں آپ کا آنا درست نہیں۔'' وارث نے نرمی سے کہا۔

''گھبرائیں نہیں۔ کسی کو علم نہیں ہوتا۔ قصرِ زیب میں دیواروں اور دروازوں کے علاوہ کوئی نہیں۔ اگر آپ کو ان دیواروں، دروازوں سے ڈر ہے تو پھر میں چلی جاتی ہوں۔'' وہ جانے کے لئے مڑی۔

''رکیں مہرو! اگر آپ کوئی بات کرنے آئی ہیں تو پھر کر کے ہی جائیں۔'' وارث نے کہا۔ مہر النساء نے لحہ بھر کو اس کی جانب دیکھا اور پھر پلٹ کے ایک صوفے پہ بیٹھ گئی اور اپنی ہتھیلیوں میں کچھ ڈھونڈنے لگی۔ کچھ مناسب الفاظ ذہن میں تراش رہی تھی۔ لیکن یہ اس کے لئے بے حد مشکل تھا۔ لفظوں کا جوڑ توڑ کس قدر مشکل ہو گیا تھا۔

''جی کہیں مہرو! کیا کہنا ہے؟'' وارث نے سوال کر کے اس کی مشکل آسان کر دی۔

''وارث! میں ایک لڑکی ہوں۔ بالغ اور سمجھ دار۔ دین دنیا کی تمام معلومات رکھنے والی۔ اپنے مذہب کی مکمل طور پر پیروی کرنے والی۔ جو میں آپ سے کہنے والی ہوں یا جس چیز کا اظہار کرنے والی ہوں، مجھے میرے مذہب نے اس کی مکمل اجازت دی ہے۔ مجھے اس فیصلے کا حق مکمل طور پہ حاصل ہے۔'' وہ کہتے کہتے ٹھہر گئی۔

وارث کے دل میں خطرے کی گھنٹیاں بجنا شروع ہو گئیں۔ وہ آہستہ آہستہ سمجھنے لگ گیا کہ مہرو کیا کہنے والی ہے۔ اس کی زبان میں ایک ٹائم بم تھا جس کا بٹن دبتے ہی ایک بہت بڑا دھماکا ہونے والا تھا۔ وارث ہمہ تن گوش تھے۔ ان کے دل کی دھڑکن میں تیزی آ گئی۔ خون کی شریانوں میں ہلچل مچ گئی۔ پیشانی پہ پسینے کے ننھے ننھے قطرے بہنے لگ گئے۔

''کہیں، کیا کہنا چاہ رہی ہیں مہرو؟'' انہوں نے بے اختیار کہا۔

''مجھے آپ سے محبت ہے وارث!...... میں آپ کی بن جانا چاہتی ہوں۔ آپ سے نکاح کرنا چاہتی ہوں۔''

بٹن دب گیا۔ بم بلاسٹ ہو گیا۔ دھماکے نے وارث کی ساعتوں کے پرخچے اُڑا دیئے۔ وہ لرز گئے۔ دل کی دھڑکن دوڑتے دوڑتے ٹھہر گئی۔ شریانیں منجمد ہو گئیں۔ پسینے کے قطرے خشک ہو گئے اور ماتھا ٹھنڈا پڑ گیا۔ ریڑھ کی ہڈی کے اندر اک ٹیس سی اُٹھی اور وہ دم بخود سے اس بہادر اور ہمت والی لڑکی کے اظہار اور اقرار اور خواہش کو سنتے رہے۔

وہ صوفے سے اٹھی اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی وارث کے عین سامنے آ کے کھڑی ہو گئی۔ شدت پسند آنکھوں کو وارث کی روشن آنکھوں میں گاڑ دیا۔

''آپ سے بے انتہا محبت کرتی ہوں...... آپ کو اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتی ہوں۔ کیا آپ مجھے اپنی زندگی میں شامل کر سکتے ہیں؟ کیا آپ مجھے بابا سے مانگ سکتے ہیں؟''

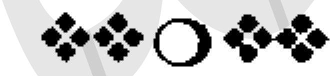
سوال بے حد مشکل تھا اور مہرو کا انداز جان لیوا۔ وارث کے تاثرات بھی اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ وہ بے تاثر چہرے اور گونگی آنکھوں کے ساتھ مہرو کو دیکھ

رہے تھے۔ لفظ اب ان کا ساتھ چھوڑ رہے تھے۔ وہ زبان اور ابجد کے تمام حروف فراموش کر بیٹھے۔ بولنا چاہتے تھے، بول پاتے نہ تھے اور مہرو ان کے جواب کی منتظر تھی۔

''مجھے علم ہے وارث! کہ آپ کو اس کی توقع نہ تھی۔ ابھی جو کچھ میں نے کہا ہے، مجھے پتہ ہے اس طرح کے فیصلے لمحوں میں نہیں ہوتے۔ میں جانتی ہوں آپ اپنے اور میرے بیچ کے فاصلوں سے ڈرتے ہیں۔ لیکن وارث! فاصلے تب تک فاصلے رہتے ہیں جب تک انہیں ہاتھ آگے کر کے مٹا نہ دیا جائے۔ فیصلے تبھی ہو پاتے ہیں جب انہیں کرنے کی سعی کی جائے۔ تقدیر میں جو لکھا ہوتا ہے وہ بھی تب تک نہیں ہوتا جب تک اسے کرنے کا ارادہ نہ کیا جائے۔ میں آپ کے جواب کا انتظار کروں گی وارث! آپ سوچیں، وقت لیں اور پھر مجھے بتائیے گا۔'' وہ یہ کہہ کر جانے کے لئے مڑی۔

وارث بت کی مانند ساکت تھے۔ اسے روکنا چاہتے تھے، اسے کچھ کہنا چاہتے تھے مگر کچھ کہہ نہ پائے۔ روک نہ پائے۔

وہ لکڑی کا دروازہ عبور کر کے جا چکی تھی اور دروازے کا ہلتا پردہ کتنی دیر تک مہرو کا ہیولا بنا وارث کو ڈراتا رہا۔ اس کے کہے الفاظ دوہراتا رہا۔ ان کی نیندوں میں چھید کرتا رہا۔



''اس عورت کے دماغی ٹیسٹ دوبارہ کروائے ہیں۔ کل تک اس کی تمام رپورٹس بھی مل جائیں گی۔'' شہرین نے چائے کا سپ لیتے ہوئے کہا۔ ہمایوں نے فائل میں سے چہرہ اٹھا کے شہرین کی جانب دیکھا۔

''اچھی بات ہے۔ کسی بھی نتیجے پر پہنچنے سے قبل یہ طے ہونا ضروری ہے کہ اس عورت کا دماغی توازن درست بھی ہے کہ نہیں۔ کیا نام بتایا تم نے اس کا؟''

''نام......اس عورت کا نام کسی کو معلوم نہیں۔ جب وہ پاگل خانے میں آئی تھی تو ہر کسی کو بالی کے نام سے بلاتی تھی۔ اس لئے سب نے اسی کو بالی کہنا شروع کر دیا۔ ڈاکٹرز کا کہنا ہے کہ پہلے کی نسبت وہ اب بہت بہتر ہے۔ نہ اس پر دورے پڑتے ہیں اور نہ وہ کوئی پاگلوں والی حرکت کرتی ہے۔ اور ہومی! یقین کرو، جس طرح سے اس

عورت نے سردار واجد کی کہانی سنائی، کوئی پاگل عورت اس طرح بیان نہیں کر سکتی۔'' شہرین نے یقین بھرے لہجے میں کہا۔

''جانتی ہو شہرین! اگلے ہفتے الیکشن شروع ہیں اور سردار واجد الیکشن کا مضبوط امیدوار ہے۔ اگر چاہو تو سردار صاحب سے مل کر اس بات کی تہہ تک پہنچ سکتی ہو۔'' ہمایوں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''اس سے اس عورت کو کیا فائدہ ہوگا؟ وہ تو اپنی تمام پراپرٹی سردار کے بچوں کے نام کرنا چاہ رہی ہے۔ بنا اپنا نام، پتہ اور شناخت Disclose کئے۔''

''یہی تو اصل پوائنٹ ہے شہرین! کہ وہ عورت اپنی شناخت کیوں چھپانا چاہ رہی ہے۔ کون ہے وہ اور اس کا اصل کردار کیا ہے اس کہانی میں؟'' ہمایوں بھی گہری سوچ میں پڑ گیا تھا۔

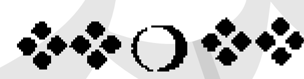
''اس عورت کے سینے میں بہت گہرے راز دفن ہیں۔ وہ شکل وصورت اور باتوں سے کوئی معمولی عورت نہیں لگتی۔ وہ اس کہانی کی سب سے اہم کڑی لگتی ہے۔ لیکن یہی جاننا ہمارے لئے امتحان کے مترادف ہے۔ ابھی تک اس عورت نے اپنا ذکر فقط مہر النساء سردار کے سامنے ہی بتانے کی اجازت دی ہے۔'' شہرین نے کہا۔

''مہر النساء سردار؟........وہ کون ہے؟''

''سردار واجد کی بڑی بیٹی۔ جس کے نام پہ بالی پراپرٹی ٹرانسفر کرانا چاہتی ہے اور اس سے ملنا بھی چاہتی ہے۔''

''تم مہر النساء سردار سے ملو گی؟'' ہمایوں نے پوچھا۔

''ضرور ملوں گی۔ لیکن پہلے بالی کی ٹیسٹ رپورٹس آ جائیں۔ اس کے بعد۔'' شہرین نے غیر مرئی نقطے پہ آنکھیں ٹکا کے کہا۔ ہمایوں نے بھی گردن اثبات میں ہلا دی۔



شائل آج کلاس میں لیٹ پہنچا تھا۔ سر اعجاز کی کلاس شروع ہو چکی تھی۔ وہ کلاس کے دوران ہی خاموشی سے داخل ہوا اور پروفیسر اعجاز کو سلام کر کے خالی سیٹ تلاش کرنے لگا۔ عتیقہ کے برابر کی سیٹ خالی تھی اور وہ خود بھی ذرا سرک کے بیٹھ گئی جس کا مطلب تھا کہ وہ شائل کے لئے جگہ بنانا چاہتی ہے۔ شائل خاموشی سے جا کے اس کے

برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا اور نوٹ بک کھولی۔ سر اعجاز کے لیکچر کے پوائنٹس لکھنے لگا۔

عتیقہ اس کی جانب دیکھتی رہی۔ اس کے سراپے کی خوشبو اور اس کی خوش لباسی ہمیشہ عتیقہ کو دیوانہ کرتی تھی۔ لگتا تھا کہ شائل کی ذات جادو کا کوئی منتر ہے، جو جب بھی عتیقہ کے سامنے آتی ہے وہ جادو کے اثر میں گرفتار ہو جاتی ہے، مدہوش ہو جاتی ہے۔ نتھنوں کے اندر سے کوئی نشہ رگ و پے میں اُترتا سا محسوس ہوتا ہے۔ یہ نشہ عشق کا نشہ تھا۔

عشق جو حواس پہ سوار ہو جائے تو دنیا بھلا دینے کو کافی ہوتا ہے۔ عشق جو دیوانگی سکھاتا ہے۔ دیوانگی جو آنکھوں کے اوپر اک سنہری پٹی باندھ دیتی ہے۔ پٹی جو اصول و قوانین فراموش کر دیتی ہے۔ بدنامی اور بربادی کے ڈر کو دلوں سے نکال دیتی ہے۔ عتیقہ کے دل پہ بھی یکطرفہ عشق کی یہی پٹی تھی جس نے اس کے حواس اس سے چھین لئے۔ اسے بیگانہ کر ڈالا تھا۔

بیگانگی اور دیوانگی کا یہ عالم شائل کی غیر موجودگی میں بھی ہوتا تھا۔ مگر اس کی موجودگی میں یہ دیوانگی، یہ بیگانگی، یہ بے قراری حد سے سوا ہونے لگتی۔

وہ شائل کی جانب کتنی دیر دیکھتی رہی۔ پھر ذرا قریب آ کے مدھم آواز میں اس سے پوچھا۔

''آج لیٹ کیوں ہو گئے؟''

شائل اس کی جانب متوجہ ہوا اور اسی طرح کی مدھم آواز میں بولا۔

''آنکھ لگ گئی تھی۔ اٹھ ہی نہیں پایا وقت پہ۔''

''الارم لگا کے سویا کرو۔'' یہ مشورہ تھا۔ اب کے شائل کو ذرا اُلجھن ہونے لگی۔

''گھڑی نہیں ہے الارم والی۔'' وہ اس کی طرف دیکھے بغیر بولا۔

''تو آج کل ہر کوئی موبائل فون پر الارم لگا کے سوتا ہے۔ گھڑی کا استعمال بھلا کون کرتا ہے؟'' عتیقہ روانی سے بولی۔

''اچھا آئندہ یہی کروں گا۔ اب لیکچر سننے دو نا۔''

اس کے ذرا سے کرخت جملے نے عتیقہ کے دل میں اک ٹیس پیدا کی۔ وہ خاموش ہو گئی۔

وہ بے دلی سے لیکچر سننے لگی۔ لیکن دل کو شائل کے سخت لہجے کا بڑا ملال تھا۔

زندگی میں انسان سبھی کچھ فراموش کر دیتا ہے۔ بس سخت لہجوں کے پتھر نہیں بھولتے۔ ترش باتوں کے نشتر فراموش نہیں ہوتے۔

محبوب کی بیگانگی بھری آنکھیں اور اس کی زبان سے ادا ہونے والا کوئی ایک بے رحم جملہ، کوئی ایک سفاک بات انسان کے دل کو جھنجھوڑ کے رکھ دیتی ہے........ دل کے نظام کو عمر بھر کے لئے ڈانواں ڈول کر دیتی ہے۔ کسی نوکیلے کانٹے کی طرح گوشت میں پیوست ہو کے رہ جاتی ہے۔ کسی بے رحم لہر کی طرح پتھر پہ جم کے رہ جاتی ہے۔

زندگی کے کسی فرصت کے لمحے میں جب محبوب کی اچھائیوں، برائیوں اور یادوں کا شمار کیا جاتا ہے تو وہ بے رحم جملہ، وہ سفاک یاد سینہ تانے کھڑی ہو جاتی ہے۔ نیندوں میں چھید کرتی ہے، جذبات کے الاؤ کو بھڑکاتی ہے، آنکھوں سے نیندیں چھین کر انہیں آنسو سونپ دیتی ہے۔

عتیقہ کے اندر بھی اِک الاؤ سا بھڑکا اور اس نے فوراً اسے بجھانا چاہا۔ بجھانے کے لئے اسے جو طریقہ موزوں لگا، اس نے بے اختیار اس کا استعمال کیا۔

''آج میم ماہا نہیں آئیں۔'' عتیقہ نے نارمل سے انداز میں کہا۔ شائل لمحہ بھر کو چونکا، عتیقہ کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پہ اک سایہ سا لہرایا۔

''مگر کیوں؟'' شائل پریشان ہوا۔

''مجھے نہیں معلوم۔'' عتیقہ کا انداز بیزار سا تھا۔

''کچھ تو وجہ ہو گی۔'' شائل کا دھیان مکمل طور پر لیکچر سے ہٹ گیا تھا۔

''خود ہی پوچھ لینا۔ مجھے لیکچر سننے دو۔'' عتیقہ نے بھی اسی کرخت لہجے میں کہا۔

شائل کو اس کی یہ کرختگی اور اکڑا پن سخت ناگوار گزرا۔

وہ بے دلی سے اپنی کاپی پہ کچھ لکھنے لگا۔ لیکن اب اس کا دھیان ماہا کی طرف تھا۔ اس کا ذہن موجودہ دنیا سے دُور تھا۔

✻✤✻✤✻

شہزادے تم پھول نگر کے باسی ہو
نازک سے پھولوں میں رنگ سجاتے ہو
سپنوں کی کومل دنیا کو چاہت سے مہکاتے ہو
چمپا، چنبیلی، صنوبر، بیلا سارے تیرے ساتھی ہیں
شوخ سی خوشبو بنتے ہو اور رنگوں میں ڈھل جاتے ہو
شہزادے تم میرا آنچل دیکھ رہے ہو
کتنا میلا، کتنا خالی
زرد سا اودا رنگ ہے اس کا
خالی اس کے ہاتھ
جگہ جگہ سے پھٹا ہوا ہے، جگہ جگہ سے دست بریدہ
شہزادے میرا یہ آنچل تم پھولوں سے بھر دو نا
ننھی کلیوں سے میرے آنچل کو رنگ دو نا
خوشبو سے مہکاؤ اور رنگوں سے بوجھل کر دو نا
اپنے پیار کی بارش سے میرے من کو جل تھل کر دو نا
اتنی چاہت مجھ کو دو کہ مجھ کو پاگل کر دو نا
شہزادے ....تم پھول نگر کے باسی ہو

صبح کی پہلی پہلی کرنیں قصرِ زیب کے پائیں باغ کو روشن کر رہی تھیں۔ تازہ پھولوں کی مہک چاروں جانب پھیلی تھی۔ چڑیوں اور دیگر پرندوں کی چہچہاہٹ نے ماحول پہ اک عجیب کیف آور سی کیفیت پیدا کر رکھی تھی۔ گھاس پہ اوس کے کئی قطرے

موتیوں کی مانند چمک رہے تھے۔ مہر النساء روز کی طرح تازہ پھولوں کی کلیاں توڑ توڑ کر اپنے دوپٹے میں جمع کیے جا رہی تھی۔ اُسے صبح کے اس پہر سے بے حد محبت تھی۔ یہ لمحہ اسے اپنے آپ سے روبرو ہونے کا لمحہ لگتا تھا۔ اپنے معبود سے محوِ گفتگو ہونے کا وقت محسوس ہوتا تھا۔

صبح کا وقت یوں بھی ہر چیز کے طلوع ہونے کا وقت ہوتا ہے۔ سورج کے چڑھنے سے روز دل میں سوئی ہوئی کئی ساری امیدیں، آرزوئیں اور خواب طلوع ہوتے ہیں، جن کی نئی خوشبو روح کی چاروں جانب بکھرتی ہے اور جذبات پہ کچھ نئے دریچے وا کرتی ہے۔

مہر کے اندر بھی کچھ اسی طرح کے بند دریچے تھے جو اس طرح کی تنہائی اور پراسرار ماحول میں وا ہوا کرتے تھے اور کبھی اسے بے حد بے چین کر دیتے تھے تو کبھی بے حد پُرسکون۔ لیکن ابھی تک اسے اپنے دل کے کسی دروازے کی چابی نہ مل سکی تھی۔ ابھی تک وہ اپنے ہی اندر چھپے پراسرار قسم کے بھیدوں کی حقیقت نہ جان پائی تھی۔

وہ پھول اپنے دوپٹے میں جمع کر کے گھر کے اندر جانے لگی۔ اندر سے وارث ٹریک سوٹ میں ملبوس باہر کی طرف آ رہے تھے۔ دونوں ہی اپنے اپنے خیالوں میں مگن تھے۔ دونوں کا ٹکراؤ لازمی تھا۔ لہٰذا دونوں ٹکرا گئے۔ مہرو کے دوپٹے میں سمائے تمام کے تمام پھول نیچے زمین پر گر کر بکھر گئے۔

ٹکراؤ بہت شدید تھا۔ دونوں کے سر آپس میں ٹکرائے تھے۔ دونوں کی پیشانی پہ چوٹ آئی تھی۔ وارث چوٹ والی جگہ پہ ہاتھ رکھ کر ملنے لگے اور مہرو نیچے جھک کر اپنے پھول اٹھانے لگی۔

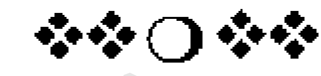
وارث بھی اس کے سامنے اسی کی طرح جھک کے پھول اٹھانے لگ گئے۔ وہ پھول اٹھاتے، اس کے دوپٹے میں رکھتے، پھر دوسرا پھول اٹھاتے، پھر رکھتے اور مہرو نے دوپٹہ آگے کر دیا۔ پھول اٹھا کے رکھنے کا عمل اس نے ترک کر دیا تھا۔ وہ وارث کے چہرے پہ اداس آنکھیں ٹکائے دیکھتی رہی۔ وارث نے بھی لمحہ بھر اس کو دیکھا۔

''آپ کو چوٹ تو نہیں آئی زیادہ........؟'' وارث نے پوچھا۔ لہجہ ہمیشہ کی طرح بے تاثر تھا۔

’’کچھ چوٹیں بہت ساری چوٹوں پہ مرہم کا کام کرتی ہیں وارث! اس چوٹ کا درد، درماں کا کام کرتا ہے اور وہ چوٹ ہر کسی کو نہیں ملتی، کسی کسی کو ملتی ہے۔‘‘ مہرو نے اُداس لہجے میں کہا۔ وارث اس کی بات سمجھ نہیں پائے۔ پھول چن لینے کے بعد اٹھے اور اپنے ٹریک سوٹ کو جھاڑنے لگے۔

’’ٹکرانے کی معافی چاہتا ہوں، آپ کے سارے کے سارے پھول بکھر گئے۔‘‘ وارث یہ کہہ کے زیادہ دیر رکے نہیں، واک کی غرض سے لان کی طرف چلے گئے اور مہرو مسکرا دی۔

’دل کی راہوں میں اچانک کہیں سے آ گئے وارث حسن خان اور خوابوں کے تمام کے تمام پھول بکھرا دیئے۔ پھولوں سے سجی اس رہگور سے اب مجھے بھی محبت ہو گئی ہے۔ کاش تم اسی طرح ہر خواب کا پھول چن چن کے میرے آنچل میں ڈالو اور میں آنچل پھیلائے تمہاری منتظر بیٹھی رہوں۔‘ مہرو کے دل سے آواز آئی۔ وہ دوپٹے میں پھول سمیٹے اندر کی طرف بڑھ گئی۔



بچوں کی سالگرہ کی تیاری میں مصروف ماہا کتنی پیاری لگ رہی تھی۔ یوں تو عاشر اور ضحیٰ کی پیدائش کے سال اور تاریخ الگ الگ تھی لیکن مشترکہ مہینے کی وجہ سے ماہا ان کی سالگرہ ہمیشہ اکٹھی منایا کرتی تھی۔ اس سال بھی بارہ ستمبر یعنی ضحیٰ کی سالگرہ کے دن پارٹی رکھی گئی تھی اور دو دن پہلے ہی ماہا نے تیاری شروع کر دی تھی۔ کھانے کا مینیو بنانا، کیک کا آرڈر دینا، بچوں کے کپڑے خریدنا، کرسیوں اور ڈیکوریشن آئٹمز کا بندوبست کرنا، کتنے سارے کام تھے اور ماہا اکیلی۔

پھپھو کی طبیعت بھی ناساز تھی۔ لہٰذا جو تھوڑی بہت ان کی مشاورت ہوتی تھی وہ بھی ممکن نہ تھی۔ آج نجانے کیوں ماہا خود کو تنہا محسوس کر رہی تھی۔

کبھی کبھی تنہائی اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ وہ خود بھی پریشان ہو اُٹھتی ہے۔ برسوں انسان تنہا رہتا ہے۔ تنہائی کو اپنا سب سے اچھا دوست اور غمگسار کہتا ہے۔ لیکن یونہی بیٹھے بیٹھے کبھی کبھی اسے اپنے آپ پہ ترس سا آتا ہے اور اپنی تنہائی پہ بے انتہا غصہ۔ سلگتی آنکھیں اپنے سامنے کسی کو دیکھنا چاہتی ہیں۔ خاموش ہونٹ کسی کے ساتھ بولنا،

کسی کے ساتھ ہنسنا چاہتے ہیں...... ویران سماعتیں کسی نقرئی دھن کو اپنے اندر اتارنا چاہتی ہیں۔ پیاسی روح کسی کی آہٹ، کسی کی چاہت کو اپنے اندر سمو لینا چاہتی ہے۔ تنہا انسان کو بھی کبھی کبھی تنہائی چیرتی، پھاڑتی، جھنجوڑتی ہے۔ تنہائی فقط اللہ تعالیٰ کی ذات کے لئے ہی ہے۔ جو تنہا ہے، یکتا ہے، بیگانہ ہے۔ جسے کسی کے ہونے نہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جو ہر کام کسی کے بغیر کر سکتا ہے۔ اسی کی ذات کے سوا اور کوئی ذات تنہا نہیں۔

جِنوں کی بھیڑ میں بھی میرا رب تنہا ہے
فرشتے بھی کروڑوں ہیں ان کا رب اکیلا ہے

ستارے، کہکشائیں، بادل، جھرنے، نظارے کچھ بھی تنہا نہیں۔ اللہ کی کوئی تخلیق تنہائی کے لئے نہیں بنائی گئی۔ وہ کسی نہ کسی کے ہونے کے لئے بنائی گئی ہے۔ اور بے شک انسان کو بھی تنہائی کے لئے تخلیق نہیں کیا گیا۔ اسے لحہ بہ لحہ کسی ساتھی، کسی غمگسار کی ضرورت ہے جس کے بنا انسان کے اندر کبھی نہ مٹنے والا خلا ٹھہر جاتا ہے۔ روح میں ایک سوراخ ہو جاتا ہے۔ ماہا بھی یہ سوراخ کبھی کبھی شدت سے محسوس کرتی تھی۔

وہ کھانوں کی لسٹ بناتے بناتے رک گئی۔ پین کو پیپر پہ دے مارا اور موبائل فون اٹھاتی باہر لان میں آ گئی۔ رات کی رانی کی خوشبو چاروں جانب پھیلی ہوئی تھی۔ وہ کسی سے بات کرنے کی غرض سے باہر آئی تھی۔ لیکن وہ کس سے بات کرتی؟ اپنی کسی دوست سے؟ کولیگ سے؟ پڑوسن سے؟ نہیں، وہ کوئی روز کے معمول کی بات کرنے کے موڈ میں نہ تھی۔ ساس کی برائیاں، شوہر کی زیادتیاں سننے کا دل نہ تھا اس کا۔ تو پھر کون تھا جو اس سے وہ باتیں کرتا جو وہ سننا چاہتی تھی۔ کس سے اپنے دل کا حال کہتی؟

کیا اس بھری دنیا میں اس کا کوئی بھی اپنا نہ تھا؟...... کیا وہ اس قدر تنہا تھی؟

اُف تنہائی۔

اُس نے اپنے موبائل میں اپنے تمام رابطے دیکھنا شروع کئے۔ دوست، عزیز، رشتہ دار، پڑوسی، کولیگ...... اس کی نظر شمائل علی کے نمبر پر ٹھہر گئی اور اس نے لاشعوری طور پر وہ نمبر ڈائل کر دیا۔

شمائل نے دوسری بیل پہ ہی نمبر پہچان کر فون اٹھالیا۔

''میم ماہا! آپ اس وقت؟........ خیریت تو ہے؟''

''بس شمائل! بہت اکیلا محسوس کر رہی تھی خود کو۔ سوچا تم سے بات کرلوں۔'' اس نے کہا۔

''ضحیٰ اور عاشر کہاں ہیں میم؟ ان کی شرارتوں کے بیچ آپ کیسے تنہا ہوسکتی ہیں؟''

''وہ دونوں اپنے کسی دوست کے گھر گئے ہیں ڈرائیور کے ساتھ۔ اصل میں پرسوں ان کی برتھ ڈے پارٹی ہے۔ وہ انوائٹ کرنے گئے ہیں۔'' ماہا نے بتایا۔

''اوہ گریٹ........ بچوں کی سالگرہ اور آپ نے مجھے نہیں بتایا۔''

''بتا تو رہی ہوں۔ پرسوں بچوں کی سالگرہ ہے۔ اور تم نے ضرور آنا ہے۔''

''اتنا زبردست پروجیکٹ آپ کو ملا ہے بچوں کی سالگرہ کی تیاری کا اور آپ اُداس ہیں۔ ایسا کیوں؟'' شمائل نے کریدنے کی کوشش کی۔

''اُداسی محفل یا مصروفیت سے مشروط تو نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی انسان ہزاروں لوگوں کے درمیان بھی اُداس ہو جاتا ہے۔''

''اونہوں........ اس قدر اچھا موقع اور آپ کی یہ اُداسی بھری باتیں۔ کچھ مزہ نہیں آیا۔ اچھا آپ کو میں اطلاع دے دوں کہ اگلے پندرہ منٹ بعد آپ کھلکھلا کے ہنس دیں گی اور اپنی یہ تنہائی بھلا دیں گی۔'' شمائل نے بہت ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

''اچھا........ وہ کیسے؟'' ماہا مسکرا دی۔

''وہ ہمارا مسئلہ ہے۔ آپ کا نہیں۔ آپ نے صرف ہمارے شارٹ سوالوں کے جوابات دینے ہیں۔''

''اوکے........'' وہ مسکرا دی۔

''آپ نے بچوں کی سالگرہ کی تیاری کر لی ہے؟ کیا پکانا ہے، کیا پہننا ہے، کیا کیا کرنا ہے؟''

''تیاری ابھی صرف پیپرز کی حد تک ہے۔ شروعات نہیں کی۔'' وہ بولی۔

''مجھے کوئی برتھ ڈے پارٹی کا خاص تجربہ تو نہیں البتہ میں آپ کو کچھ مزے مزے کی ٹپس ضرور دے سکتا ہوں۔''

''اچھا؟........ کس طرح کی ٹپس؟''

''سب سے پہلے باری آتی ہے ڈیکوریشن آئٹمز کی تو میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ آپ ان پہ زیادہ خرچہ نہ کریں۔ اگر آپ گزری کی طرف چلی جائیں تو آپ کو سستے ریٹز اور ڈیکوریشن آئٹمز مل جائیں گے جو ایک بار کے استعمال کے بعد کسی خاص کام کے نہیں رہتے۔ لیکن ایک بار کا گزارا ہو جائے گا۔'' شمائل نے شروعات کی۔

''گزری کی طرف جانا پڑے گا؟'' ماہا نے سوچتے ہوئے کہا۔

''جی........ اور پھر باری آتی ہے کیک کی۔ یا تو آپ پکچر کیک بنوائیں جس پہ بچوں کی تصاویر بنائیں۔ پکچر کیک کی ایک دکان زمزمہ میں ہے۔ لیکن اگر آپ اچھے چاکلیٹ کیک کو پسند کرتی ہیں تو پھر ''ہوب ناب'' سے بہتر کوئی آپشن نہیں۔ ہوب ناب والوں کی ایک دکان فیزی میں ہے اور دوسری زمزمہ میں۔ آپ ایسا کریں، چاکلیٹ موس فلیور کا کیک بنوائیں جس پہ اچھا سا کارٹون بنا ہو۔ یہ بتائیں، ضحیٰ کو کون سا کارٹون پسند ہے؟'' شمائل روانی سے کہتے کہتے رکا۔

''ضحیٰ کو ٹویٹی برڈ پسند ہے۔'' وہ بولی۔

''پرفیکٹ۔ ضحیٰ کے کیک پہ ٹویٹی برڈ اور عاشر کے کیک پر گاڑی بنوائیں۔ کیک کے بعد کھانے کا مینیو۔ ریفریشمنٹ کے لئے پزا، چنا چاٹ، دہی بھلے وغیرہ اور پھر اچھی سی بریانی، قورمہ اور رائتہ کافی رہے گا۔ سویٹ ڈش میں آئس کریم رکھ لیجئے گا۔ کیا خیال ہے؟''

''بالکل ٹھیک خیال ہے۔'' ماہا نے تائید کی۔

''اس کے بعد باری آتی ہے بچوں کے کپڑوں کی۔ کسی اچھی سی گارمنٹس کی دکان سے ضحیٰ کے لئے گڑیوں کی طرح کے فراک اور عاشر کے لئے اچھا سا ٹو پیس خرید لائیں۔ بیل گمز سے جوتے لے لیں اور اپنے لئے کسی اچھی سی بوتیک سے زبردست سا جوڑا۔'' شمائل نے اپنی تیز رفتاری جاری رکھی۔ ماہا مسکرا دی۔

''کون سا رنگ پہنوں میں؟'' وہ دلچسپی سے پوچھ بیٹھی۔

شمائل رک کے لمحہ بھر کو تصور باندھنے لگا۔ ماہا کا ہر اک رنگ میں لپٹا منفرد سا وجود اس کی آنکھوں کے سامنے آ گیا۔

''آپ تو ہر رنگ میں بہت خوبصورت لگتی ہیں۔ رنگوں کی وقعت آپ کے اوپر اور

بڑھ سی جاتی ہے۔'' اس نے بہت خاص لہجے میں کہا اور یہ تعریف اور یہ لہجہ ماہا کے دل میں اک انوکھا سا احساس پیدا کر گیا۔

''نیلا اور گلابی رنگ میرے پسندیدہ رنگ ہیں۔'' وہ بولی۔

''طے رہا کہ آپ انہی رنگوں کو پہنیں گی۔ میں نے آپ کے ہاتھوں میں کبھی چوڑیاں نہیں دیکھیں۔ اگر آپ چوڑیاں پہن لیں تو کس قدر اچھی لگیں گی آپ۔'' شائل نے اس کے چوڑیوں والے ہاتھ کا تصور کر کے کہا۔

دائرے شوخ رنگوں کے بنتے رہے
یاد آتی رہی وہ کلائی ہمیں
دل کے سنسان آنگن میں بجتی رہیں
ریشمی شربتی چوڑیاں رات بھر

''بہت عرصہ ہو گیا میں نے چوڑیاں نہیں پہنیں۔ اب تو مجھے خالی کلائیوں کی عادت سی ہو گئی ہے۔'' اس کا لہجہ اُداس تھا۔

''وعدہ کریں کہ آپ پارٹی میں چوڑیاں پہنیں گی۔''

''ٹھیک ہے۔'' وہ شائل کو انکار ہی نہ کر پائی۔ اس کا لہجہ، اس کی باتیں کتنی چارہ گر سی تھیں۔ کتنی اپنی اپنی سی تھیں۔

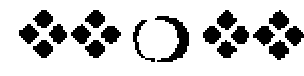
پیاسے دل پہ اپنائیت کا ایک چھینٹا ہی بہت ہوتا ہے۔ دل کی بنجر مٹی گیلی ہوتے ہی سکون اور ٹھنڈک کا احساس جگاتی ہے۔

دل کی خشکی کس قدر ویران کر دیا کرتی ہے روح کو۔ زندگی جینے کے لئے روح کی خوشی کس قدر ضروری ہوتی ہے۔ جذبات کی نمی دل کو کس قدر ٹھنڈک پہنچاتی ہے۔ وہ کتنا خوشی سے مسکرا رہی تھی۔ کبھی کسی نے بچوں کی سالگرہ اس طرح شیئر نہیں کی تھی اس سے، اس طرح بانٹی نہ تھی۔ اس طرح کوئی حصہ دار نہیں ہوا تھا اس میں۔ اپنی خوشی میں کسی کو حصہ دار بنانا کتنا اچھا لگتا ہے۔ خوشیوں کی روٹی کے دو حصے کرنا اور آدھی تمہاری آدھی میری کے مصداق اسے کھانا کتنا اچھا لگتا ہے۔

''بہت شکریہ شائل! میری خوشی میں اس طرح شامل ہونے کے لئے۔ یقین کرو ایسا پہلے کسی نے نہیں کیا۔''

''اس سالگرہ کو اتنا حسین بنائیں کہ اگلے پچاس سال آپ اسے بھول نہ پائیں۔'' شائل نے کہا۔

''میں اسے ساری زندگی بھلا نہیں پاؤں گی شائل!'' وہ کھلکھلا دی تھی۔ آج اسے اپنے اندر اک نئی روح محسوس ہو رہی تھی۔



بے خبر سا تھا مگر سب کی خبر رکھتا تھا
چاہے جانے کے سبھی عیب و ہنر رکھتا تھا
لاتعلق نظر آتا تھا بظاہر لیکن
بے نیازانہ ہر اِک دل میں گزر رکھتا تھا
اس کی نفرت کا بھی معیار جدا تھا سب سے
وہ الگ اپنا اِک اندازِ نظر رکھتا تھا
بے یقینی کی فضاؤں میں بھی تھا حوصلہ مند
شب پرستوں سے بھی اُمیدِ سحر رکھتا تھا
مشورے کرتے تھے جو گھر کو سجانے کے لئے
ان سے کس طرح کہوں میں بھی تو گھر رکھتا تھا
ان کے ہر وار کو سہتا رہا ہنس کر محسن
یہ تاثر نہ دیا، میں بھی سپر رکھتا تھا

''مہر النساء کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا وارث؟'' سردار صاحب نے بیٹھے بیٹھے الیکشن اور بزنس میٹرز کے بیچ ہی مہرو کا ذکر چھیڑ دیا تھا۔ وارث لمحہ بھر تو ان کا چہرہ دیکھتے رہے جہاں فکر کے کچھ آثار تھے اپنی اکلوتی بیٹی کے لئے۔

''ان کی طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔ بس ذرا وہ زین بابا کے ہاسٹل شفٹ ہونے پر پریشان تھیں۔ ان کے خیال میں زین بابا بہت چھوٹے ہیں اور اس عمر میں ان کا یوں گھر سے چلے جانا ان کے لئے اچھا نہیں۔'' وارث نے انہیں مطمئن کرنا چاہا۔

''چھوٹی عمر میں بڑی بن بیٹھی ہے بھائی کی۔ اس کی پریشانی اور تفکر لازمی ہے۔ لیکن وارث! آج کل کے بچوں کو اگر آزادی اور تنہائی نہ دی جائے تو وہ کامیابی کے

راستے تلاش نہیں کر پاتے۔ مہرو نے آج یا کل اپنے گھر چلے جانا ہے۔ لیکن زین ہماری سیاسی اور کاروباری زندگی کی باگ ڈور سنبھالے گا۔ ہمارا بایاں ہاتھ بنے گا اور اس کے لئے اس کا ہم سے دور رہنا ضروری ہے۔ آپ خیال رکھئے گا وارث! کہ زین کو کسی چیز کی کمی محسوس نہ ہو۔ پیسہ، آسائشات کچھ کمی بیشی نہ ہونے پائے۔'' سردار صاحب کی آنکھوں میں زین کے متعلق بات کرتے ہوئے اک چمک سی در آئی تھی۔

''انشاء اللہ آپ کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔'' وارث نے کہا۔

''رہی بات مہر النساء کی تو کل آپ اسے لاہور چھوڑ آیئے۔ وہاں پہ ایک ملازمہ کا بندوبست کر دیا ہے۔ بنگلہ کھلوا کے اس کی صفائی کروا دی ہے۔ مہر النساء کا کچھ دن یہاں سے جانا لازمی ہے۔ کم از کم الیکشن کے دنوں تک کے لئے۔ آپ اسے چھوڑ کے زین کے پاس چکر لگا آیئے گا اور مجھے باخبر رکھئے گا۔ الیکشن کیمپ کی مصروفیات کے دوران تمام فیکٹریز کی دیکھ بھال کی ذمہ داری آپ پہ آن پڑے گی۔'' سردار صاحب نے سگار سلگاتے ہوئے کہا۔

''آپ اطمینان سے اپنے الیکشن امور پر توجہ دیں۔ فیکٹری اور بچوں کی فکر آپ مجھ پہ چھوڑ دیں۔'' وارث نے مسکرا کے کہا۔

''وارث! تم ہمارے کون سے ثواب کا اجر ہو، ہمیں آج تک سمجھ نہیں آئی یہ بات۔'' سردار صاحب کے چہرے کی مسکراہٹ میں اطمینان کی جھلک تھی۔

''ثواب کا اجر تو آپ کا سایہ ہے سردار صاحب! ورنہ مجھ جیسے یتیم کی یہ اوقات کہاں؟ کاش زندگی میں کوئی ایسا موقع آئے کہ وارث خان آپ کے احسانوں کا بدلہ اتار پائے۔'' وارث کا لہجہ بھیگ سا گیا۔

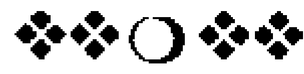
''ہماری محبت کو احسان کا نام دے کر اس کی توہین نہ کرو وارث! تم ہمیں مہرو اور زین سے زیادہ عزیز ہو۔''

''سردار صاحب! آپ کی محبت اور شفقت میرے لئے متاعِ حیات ہے۔'' وارث نے کہا۔

''دعا کرنا کہ ہم اپنے تمام فرائض پہ پورا اتریں۔ ان امیدوں پہ بھی جن کا بوجھ ہمارے کندھوں پہ ہے، جو ہمارے لوگوں نے ہم سے لگائی ہیں۔ ہمارے حریف گو ہم

سے زیادہ طاقتور نہیں لیکن شاطر ضرور ہیں۔ ہم نہیں چاہتے ہمارے لوگوں اور علاقے کی تقدیر چوہدری ساجد کے ہاتھ لگے۔ چوہدری ساجد کو ہم برسوں سے جانتے ہیں۔ اس کا اور ہمارا بچپن اور جوانی اکٹھے گزری ہے۔ اس کی رگ رگ سے واقف ہیں ہم۔'' سردار واجد نے موضوع بدلا۔

''گھبرائیں نہیں سردار صاحب! الیکشن میں جیت آپ کے حریف کی نہیں، آپ کی ہوگی۔ آپ کے عوام کے ووٹ اور دعائیں آپ ہی کے ساتھ ہیں۔'' وارث نے انہیں تسلی دی۔ وہ بھی مطمئن سے ہو گئے۔



الیکشن کے سلسلے میں چوہدری ساجد علی سے ملنے والوں کا تانتا بندھا تھا۔ کئی چمچے، مخبر روزانہ دورہ کرتے اور سردار واجد کے حریفوں اور چاہنے والوں کے متعلق اطلاع فراہم کرتے۔ آج بھی ان کے بنگلے پہ اسی طرح کا سماں تھا لیکن چوہدری صاحب اپنے خاندانی مسائل حل کرنے میں مصروف تھے۔ ان کی **Past History** یہ تھی کہ عمر بھر ان کے ہاتھ اور پاؤں کالے کاموں میں مصروف رہے۔ ان کی زندگی عورتوں سے عشق معشوقی میں گزری۔ کچھ قانونی اور کچھ غیر قانونی شادیاں کیں۔ قانونی شادیوں میں سے ان کی پہلی شادی ایک نیک اور پرہیزگار خاتون صدیقہ بی بی سے ہوئی جو کہ شوہر کی بدکاریوں اور ان کے دیئے صدموں سے زندہ نہ بچ سکیں اور ایک بیٹے زاہد علی کو چھوڑ کر دارِ فانی سے کوچ کر گئیں۔ صدیقہ کے بعد ان کی شادی فرزانہ بیگم سے ہوئی جو ایک مشہور سیاست دان کی بھانجی تھیں اور بھاری بھر کم جہیز میں ایک عدد گارمنٹس فیکٹری بھی لائی تھیں۔ بلا کی مغرور، اکڑی ہوئی خاتون ثابت ہوئیں۔ اپنی چھبیس ستائیس سالہ شادی شدہ زندگی میں وہ چوہدری ساجد کو فقط دو تحفے ہی دے پائیں۔ ایک بیٹا سلمان اور بیٹی عرفانہ۔ لیکن یہ تحفے چوہدری ساجد کے کالے کرتوتوں کا پھل تھے۔ بڑھتی عمر کے ساتھ ساتھ ان دونوں تحفوں نے باپ کی عزت مٹی میں ملانے کا جو ماں کے ساتھ مل کر مشترکہ فیصلہ کیا تھا، اس کو پورا کرنے کے لئے وہ لمحہ بہ لمحہ کوشاں رہتے تھے۔

ایک طرف عرفانہ نے چھوٹی عمر سے جو معاشقوں کا سلسلہ چلایا تھا تو وہ نہ رکنے کا

نام لیتا تھا اور نہ ختم ہونے کا۔ ہر چھ ماہ بعد ایک عاشق نامراد کا اس کی لسٹ میں اضافہ ہوتا تھا اور سلمان ساجد نے بھی اسی طرح عورتیں بدلنے اور عیاشی پہ پیسہ لٹانے کی قسم کھا رکھی تھی۔ بری صحبت میں آ کر مزید بگڑ گیا تھا اور ہمیشہ باپ کے لئے نیا مسئلہ پیدا کر دیتا تھا۔

چوہدری ساجد کے سردار واجد سے پرانے تعلقات تھے۔ وہ دونوں ایک ہی سکول میں اور پھر کالج میں زیر تعلیم رہے۔ روم میٹس تھے۔ دکھ سکھ کے ساتھی تھے لیکن ان دونوں کی دوستی میں دراڑ بنی اپنے زمانے کی مشہور ماڈل اور اداکارہ زیب۔ جس کے حُسن کے دونوں شیدائی بن گئے۔ لیکن زیب کا جھکاؤ سردار واجد کی طرف تھا کیونکہ وہ اچھے برے میں تمیز کرنے والی لڑکی تھی۔ اور اس طرح برسوں کی دوستی دشمنی کا روپ دھار گئی۔ انتقام چوہدری ساجد کے رگ و پے میں سرائیت کر گیا اور وہ تب سے ہر قدم پہ سردار صاحب کو ہرانے کی ٹھان بیٹھے۔ چاہے فیکٹری کی فیلڈ ہو یا سیاست کی، وہ ہر معاملے میں ان سے جیت جانا چاہتے تھے۔

الیکشن کی زوردار تیاری شروع ہو چکی تھی۔ لیکن آج ایک بار پھر سلمان نے نیا گل کھلایا تھا۔ رات کو کسی شاہراہ پر نشے میں دھت گاڑی چلاتے ہوئے پکڑا گیا تھا اور حوالات میں بند تھا۔ اس بات کے آؤٹ ہونے کا سراسر یہی مطلب تھا کہ چوہدری ساجد کی الیکشن مہم پر اثر پڑتا۔ لہٰذا چوہدری ساجد اس مسئلے کو حل کرنے کی پوری کوشش کر رہے تھے۔

''کون بول رہے ہو تم؟........ مجھے اپنا نام بتاؤ گدھے کہیں کے۔'' فون کا ریسیور ہاتھ میں پکڑے ہوئے چوہدری ساجد نے چلاّ کر کہا۔

''انسپکٹر ہو گے اپنے لئے۔ تم نہیں جانتے تم نے چوہدری ساجد کے بیٹے کو گرفتار کیا ہے جو تمہارے علاقے کا مستقبل ہے اور ایک دن پورے صوبے کا چیف منسٹر ہو گا۔ میں کہتا ہوں چھوڑ دو میرے بیٹے کو ورنہ میں ابھی کمشنر کو فون کھڑکاتا ہوں۔''

چوہدری ساجد کے چہرے کے بدلتے زاویے بتا رہے تھے کہ انسپکٹر بھی آسانی سے ہاتھ آنے والی چیز نہیں۔ اس نے شاید آگے سے پیسے کی ڈیمانڈ کی تھی۔

''تو تم رشوت لئے بغیر اسے نہیں چھوڑو گے؟'' اب چوہدری کے لہجے میں ذرا سی

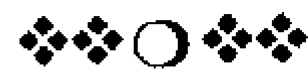
بے بسی تھی۔

''میڈیا کوریج کی مجھے دھمکی نہ دو۔ تمام کے تمام اخباری نمائندے اور نجی چینل اور ان سے جڑے بندے میری مٹھی میں ہیں۔ لیکن میں پھر بھی یہ معاملہ باہر کے لوگوں میں اچھالنا نہیں چاہتا۔ میں شریف بندہ ہوں اور ٹیڑھی بات پسند نہیں کرتا۔ بولو کتنے پیسے لو گے اس بات کو یہیں ختم کرنے اور سلمان ساجد کو چھوڑنے کے؟''

''کیا؟........ تین لاکھ روپے؟........ ہوش میں تو ہو؟........ جانتے ہو کس سے بات کر رہے ہو؟''

''اچھا، اچھا........ ٹھیک ہے........ میرا بندہ آ کے تمہیں رقم دے دیتا ہے۔ اور ایک گھنٹے کے اندر اندر یہ معاملہ دب جانا چاہئے۔'' چوہدری نے گویا مک مکا کر کے فون رکھ دیا اور ساتھ کھڑے اپنے پرسنل اسسٹنٹ نیازی کو مخاطب کیا۔

''نیازی! ایک اُلو دا پٹھا ہے، انسپکٹر بلال۔ بڑے پَر مار رہا ہے میرے پُتر نوں گرفتار کر کے۔ کہتا ہے کہ میڈیا میں نیوز اچھال دے گا سلمان کی بدکاریوں کی۔ اوہدا منہ بند کرن واسطے تین لاکھ روپے دے آ اور چوہدری سلمان نوں رہا کروا آ۔'' چوہدری ساجد نے اپنے مخصوص انداز میں کہا اور نیازی گردن اثبات میں ہلا کر باہر چلا گیا۔ چوہدری ساجد نے سکون کا سانس لیا۔ گویا یہ معاملہ سلجھ گیا تھا۔



''آپ تیار ہیں مہرو؟........ جانے کا طے شدہ وقت آ گیا ہے۔'' اس کے کمرے کے دروازے میں کھڑے وارث گھڑی دیکھتے ہوئے بولے تھے۔

اس نے وارث کو اکثر گھڑی دیکھتے ہوئے پایا تھا۔ وہ ہمیشہ گھڑی دیکھا کرتے تھے جیسے وقت کی رفتار سے مقابلہ کرنا چاہتے ہوں۔ وارث اور کلائی سے بندھی گھڑی گویا دو لازم وملزوم چیزیں ہوتے تھے۔

وہ بستر پہ بیٹھی بیگ بنا رہی تھی۔ کپڑوں کا سوٹ کیس تیار تھا۔ ہینڈ بیگ میں وہ کچھ ضروری چیزیں ڈال رہی تھی۔ لپ اسٹک، نقدی، بال پوائنٹ، موبائل فون اور الماری کی چابیاں وہ بیگ میں ڈالنا کبھی بھولتی نہ تھی۔ آج بھی وہ انہی چیزوں کو ڈال رہی تھی۔

''میری تیاری مکمل ہے۔'' وہ مختصراً بولی۔

''سارا سامان پیک کرلیا ہے لے جانے کے لئے؟'' وارث نے گھڑی سے نظر ہٹاتے ہوئے کہا۔

''ہاں بس ایک قصرِ زیب کو نہیں لے جا سکتی۔ اور اس کے بناء میں تہی داماں، خالی ہوں۔'' مہر کے لب و لہجے پہ اداسی کا عنصر غالب تھا۔ وارث کے چہرے پہ لحہ بھر کو ایک تاثر دوڑا اور معدوم ہو گیا۔ تصویر سا چہرہ ذرا دیر کو زندہ ہوا اور پھر ڈوب گیا جیسے آسمان پہ کبھی کوئی ستارہ ذرا سا ٹمٹماتا ہے، پھر ہلکا ہو جاتا ہے۔ وارث اندر آئے اور اس کے بستر کے قریب آ کے رکے۔ مہر کی آنکھیں نمی سے جھلملا رہی تھیں۔

''آپ قصرِ زیب سے مختصر عرصے کے لئے جا رہی ہیں، ہمیشہ کے لئے نہیں۔ یہ گھر آپ کا ہے اور آپ کا منتظر رہے گا۔ رونے یا پریشان ہونے سے کوئی فائدہ نہیں۔'' وارث نے اطمینان سے کہا۔

''پھر مجھے کیوں لگ رہا ہے وارث! کہ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قصرِ زیب سے رخصت ہو رہی ہوں؟'' آنکھوں کے ساتھ ساتھ اس کا لہجہ بھی نم ناک تھا۔

''ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ آپ اطمینان رکھیں۔'' وہ بولا۔

''آپ کی ذات جتنا اطمینان میں کہاں سے لاؤں وارث؟...... نجانے آپ میں اتنا ٹھہراؤ کہاں سے آ گیا ہے؟ کس سے سیکھا ہے آپ نے یہ ٹھہراؤ؟ یہ اطمینان مجھے تو اپنی روح کے اندر اک آتش فشاں کا گماں ہوتا ہے جو کبھی نہ کبھی پھٹ پڑے گا اور کائنات کے ذرّے ذرّے کو جلا ڈالے گا۔ نجانے آپ کا دل اک ٹھہرے ساکت دریا کی طرح کیوں ہے؟'' وہ بہت عجیب انداز میں بولی۔

''آتش فشاں بھی دریاؤں اور سمندروں کے اندر سما کے بجھ جاتے ہیں مہر النساء! دریاؤں کو بجھنے یا مٹ جانے کا خوف نہیں ہوا۔ اس لئے اپنے دل کو آتش فشاں مت بنائیں۔ اس آگ کو نکال باہر کریں اور اپنی ذات میں دریاؤں سا ٹھہراؤ لے آئیں۔ یقین مانیں آپ بہت مطمئن ہو جائیں گی۔'' وارث کے چہرے پہ مسکراہٹ در آئی۔

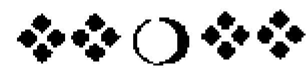
مہر خاموش آنکھوں سے انہیں دیکھتی رہی۔

وارث نے اس کا سوٹ کیس اٹھایا اور کمرے سے باہر چلے گئے اور وہ کتنی دیر اس

خالی دروازے کو دیکھتی رہی۔

'مجھے معلوم ہے وارث! کہ آتش فشاں دریاؤں اور سمندروں میں سما کے بجھ جاتے ہیں۔ اسی لئے تو میں آپ میں سما جانا چاہتی ہوں۔ اسی لئے تو اپنی جلتی جھلتی روح آپ کی ٹھنڈی اور مطمئن شخصیت کے سپرد کر دینا چاہتی ہوں...... مجھے اپنی ذات میں سمو لیجئے وارث!...... مجھے تنہا جھلنے سے بچا لیجئے۔'

وہ ملتجی آنکھوں سے سوچ گئی۔



شائل یار! یہ دنیا بھر کے رسالوں کے ٹائٹل ورق پہ لڑکیوں کی تصاویر کیوں چھاپی جاتی ہیں؟''

عادل بھائی نے رسالے کی مختصر سی ورق گردانی کر لینے کے بعد رسالے کے ٹائٹل کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ اس رسالے میں شائل کی نظمیں چھپی تھیں جو وہ عادل اور حافظ دونوں کو پڑھاتا تھا۔

''لڑکیوں کی تصاویر نہ چھاپیں تو لوگ رسالے خریدنا بند کر دیں۔'' شائل نے مسکرا کر کہا۔

حافظ بھائی بظاہر تسبیح کرنے میں مشغول تھے لیکن بہر حال وہ شائل اور عادل کی باتوں کی طرف متوجہ بھی تھے۔

''یہ بات تو تمہاری سو فیصد درست ہے۔ میں نے بھی آج تک جب کوئی رسالہ خریدا تو وہ لڑکیوں کی تصاویر کی وجہ سے ہی خریدا...... مجھے کبھی کوئی غرض نہیں رہی کہ رسالے کے اندر کیا ہے۔'' عادل بھائی نے آنکھ دبا کے شائل کو کہا۔

''استغفر اللہ!...... استغفر اللہ!'' حافظ نے استغفار کہہ کر دونوں انگلیاں کانوں پر لگائیں۔

''کیوں حافظ بھائی! سچ کہہ رہا ہوں۔ سچ بولنے کی تلقین تو آپ خود ہی کرتے ہیں۔ یوں بھی خوبصورت لڑکیوں کو دیکھ کر دل خدا کی تعریف ہی کرتا ہے کہ واہ مالک! کیا چیز بنائی ہے تُو نے۔'' عادل نے ایک بار پھر حافظ کی دُکھتی رگ پہ ہاتھ رکھا۔

شائل مسکرا دیا۔

"بھائی میرے! عورتوں کو اللہ رب العزت نے ماں کا درجہ دیا ہے، بہن، بیٹی کا رتبہ دیا ہے۔ ان کی عزت کرنی چاہئے نہ کہ نامحرم عورتوں کو دیکھ دیکھ کے خوش ہوا جائے۔ یہ تو سراسر گناہ ہے۔" حافظ نے نرمی سے سمجھایا۔

"لیکن حافظ بھائی! کسی نامحرم کو دیکھیں گے پسند کریں گے، اسے چاہیں گے تو محرم بنانے کا خیال آئے گا نا۔ اور میرا خیال ہے یہ تو کوئی غلط بات نہیں۔ اب آپ اس رسالے کی لڑکی کو ہی دیکھ لیں۔ کس قدر خوبصورت، کس قدر معصوم ہے۔" عادل نے ٹائٹل اس کے سامنے کر دیا۔ اس کی ایک جھلک پانے کے بعد حافظ نے آنکھیں موند لیں۔

"استغفر اللہ!...... میرے خدایا! مجھے معاف فرما دینا۔" حافظ بھائی مسلسل استغفار کرنے لگے۔

"شمائل بھائی! اسے منع کر دو۔ خود تو گنہگار ہے ہی، مجھے بھی اپنے گناہ میں شامل نہ کرے۔" حافظ کا چہرہ لال ہونے لگا اور وہ اٹھ کے واش روم کی طرف جانے لگا۔

"ویسے حافظ بھائی! ایک مرتبہ دیکھ لینے میں کوئی مضائقہ تو نہ تھا۔" شمائل بھی شرارت میں شامل ہو گیا تھا۔ حافظ بھائی اسے گھورتے ہوئے واش روم کے اندر چلے گئے۔ شمائل اور عادل نے تالی ماری۔

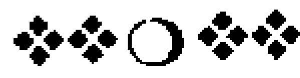
"اب مزہ دیکھنا شمائل!" عادل نے رسالہ اُلٹا کر کے حافظ کے تکیے کے اوپر رکھ دیا اور خود شمائل کا ہاتھ پکڑ کر اُٹھنے لگا۔ "چل تُو میرے ساتھ باہر۔"

"تم پٹو گے کسی دن مولانا سے۔" شمائل باہر جانے لگا۔

"حافظ بھائی! میں ذرا شومی کے ساتھ کھانا لانے باہر جا رہا ہوں۔" وہ شمائل کو ساتھ لئے زور سے کہتا کمرے سے باہر چلا گیا۔ ان کے جاتے ہی حافظ بھائی واش روم سے نکلے اور کسی کو نہ پا کر شکر کا سکھ کا سانس لیا اور بستر تک آنے لگے۔ بستر پہ رسالے کو اُلٹا رکھا پایا۔ پہلے اپنے دائیں طرف دیکھا، پھر بائیں طرف اور پھر رسالہ اٹھا کے ٹائٹل گرل کی تصویر کو بغور دیکھنے لگے اور کئی لمحوں تک یک ٹک دیکھتے رہے۔

"پکڑے گئے مولوی۔" کھڑکی میں چھپ کے کھڑے دیکھتے عادل نے برجستہ کہا اور مولوی کے ہاتھ سے رسالہ چھوٹ گیا۔ شمائل اور عادل کی ہنسی رکنے والی نہ تھی اور

حافظ بھائی کا چہرہ خجل پن سے سرخ ہونے لگا۔



سالگرہ کی تیاری مکمل طور پر اسی طرح سے ہوئی، جس طرح شمائل نے اسے کہا تھا۔ کہیں شعوری تو کہیں لاشعوری طور پر اس نے ہر وہ کام انجام دیا تھا جو شمائل نے اسے کہا تھا۔ "ہوب ناب" سے کیک کا آرڈر دیا جس پر ٹویٹی برڈ اور ریس کار کے شیپ بنے تھے۔ گزری سے سجاوٹ کا سامان خریدا، بچوں کے کپڑوں میں بھی شمائل کے مشوروں کو دھیان میں رکھا۔ کھانے کی لسٹ میں بھی انہی تمام چیزوں کو مینیو میں شامل رکھا اور اب وہ ایک بوتیک میں کھڑی اپنے لئے کسی خوبصورت جوڑے کو پسند کر رہی تھی۔

اس نے بہت عرصے سے کسی شوخ رنگ کو نہیں پہنا تھا۔ خوش لباسی تو یوں اس کی فطرت کا حصہ تھی۔ وہ ہمیشہ سب میں منفرد اور جاذب نظر آنا چاہتی تھی اور وہ اپنی شخصیت میں ایسی کشش رکھتی تھی کہ ایک بار سرسری نظر ڈالنے والا دوسری بار دیکھنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ لیکن جب سے وہ تنہائی کے کربناک جنگل میں آ بسی تھی رنگوں، جگمگاہٹوں اور شوخیوں سے اس نے سارے ناتے توڑ دیئے تھے۔ قوس قزح اور اس کی پرچھائیوں سے ناراض ہو گئی تھی۔ لیکن آج بہت عرصے بعد اس کا دل کسی شوخ رنگ کی طرف کھنچ رہا تھا۔ وہ کسی جھلملاہٹ کو تلاش کر رہی تھی۔ جیسے سیاہ، خاموش راتیں اپنے ویران دوپٹوں میں کوئی چاند ٹانکنا چاہتی ہیں اور اماوس کی پرچھائیوں کو نوچ کر پھینک دینا چاہتی ہیں۔ ماہا کو بھی اپنی سیاہ خاموش، اماوس جیسی تنہائی کے لئے اِک چاند کی چاہت تھی۔ جو دُور بادلوں کے پیچھے سے اسے مسکراتا نظر آتا تھا۔

اُس نے اپنے لئے ایک گلابی رنگ کے جوڑے کا انتخاب کیا جس پہ نیلے رنگ کا نفیس کام تھا۔ نیلا دوپٹہ اور خوبصورت نگوں والا کام۔ اس نے ذرا بھی دیر نہ کی اسے خریدنے میں۔ گھر آ کر بھی وہ کتنی دیر اسے دیکھتی اور سوچتی رہی۔

خوش لباسی بے شک کسی بھی انسان کی شخصیت کا خاصا ہو لیکن پہناووں کا سارا کا سارا تعلق دیکھنے والے کی آنکھ سے ہوتا ہے۔ اگر کوئی آپ کو دیکھ کر خوش ہو اور اس خوشی کا آپ کو احساس دلائے تو پہناوے پہننے، رنگوں میں لپٹنے اور زیوروں سے سجنے

میں ایک خاص قسم کی تسکین ملتی ہے۔ روح اندر تک جگمگا اُٹھتی ہے۔ خود پہ دھیان دینے کو من کرتا ہے۔ اپنا سراپا آئینے میں دیکھنے کو دل کرتا ہے۔ اپنے سراپے میں ایک مخصوص قسم کی دلکشی کا احساس ہوتا ہے۔ اس دلکشی کو دیکھ کے اِک حیرانی سی جاگ اُٹھتی ہے۔ اپنے خدوخال بہت نئے نئے، اچھے اچھے سے لگتے ہیں۔

جسم کے اوپر لپٹے جھلملاتے رنگ اپنے عکس کا حصہ لگتے ہیں۔ اپنی ذات پر جھلملاتی آسمان پہ بکھری دھنک کا گمان ہوتا ہے۔ اپنے چہرے پہ مکمل روشن چاند کے سراپے کا گمان ہوتا ہے۔ اپنی آنکھوں کی پُتلیوں پہ ٹمٹماتے منور ستاروں کا احساس ہوتا ہے۔ پہناوے بے شک رنگین وخوبصورت ہوں لیکن اگر شوق بھری نگاہیں انہیں دیکھنے کو نہ ہوں تو ان کی رنگینی اور خوبصورتی کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا اور عورت کا روپ تو یوں بھی محبوب کی آنکھوں سے مشروط ہوتا ہے۔ گوری کلائیوں میں رنگ برنگی چوڑیاں چڑھانے والا، نازک ہتھیلیوں میں مہندی کے پھول بکھیر دینے والا، خالی گردن پہ خوبصورت موتی پہنا دینے والا اگر ساتھ نہ ہو تو سولہ سنگھار کا مزہ نہیں آتا۔ سجاوٹ میں وہ رونق، رمق، خوبصورتی باقی نہیں رہتی۔

ماہا کے اندر نجانے کہاں سے اِک کرن دوبارہ زندہ ہوئی تھی۔ وہ سجنا سنورنا، خوبصورت لگنا چاہتی تھی۔

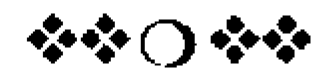


سالگرہ کے دن سبھی مہمانوں کی آمد ہو چکی تھی لیکن ماہا کی آنکھیں ابھی تک منتظر تھیں۔ وہ لاشعوری طور پر بار بار دروازے کی جانب دیکھ رہی تھی۔ شائل علی کی آمد کا ابھی تک کوئی پتہ نہ تھا۔ وہ آج خوب دل لگا کے تیار ہوئی تھی۔ خوشنما جوڑے میں لپٹی بالوں کو کھولے، ہاتھوں میں چوڑیاں پہنے وہ بہت پیاری لگ رہی تھی لیکن اس کی آنکھیں بار بار صدر دروازے کی طرف جا رہی تھیں۔ انتظار کی اذیت سے دوچار تھیں اور وہ خود اس خود اذیتی پہ ناراض ہو رہی تھی۔ بار بار خود کو سلجھا رہی تھی۔ بھلا کون ہوتا ہے یہ شائل علی۔ معمولی سا، عام سا، غیر سنجیدہ لڑکا جس نے زندگی کو بالائی سطح سے دیکھا ہے۔ جو خوابوں کی کھڑکی پر پڑتی برف سے آشنا تو ہوگا لیکن حقیقت میں جلتے ہوئے دلوں کی آگ کی آگہی سے نا آشنا۔ وہ کم عمر، جذباتی سا لڑکا ماہا جیسے سنجیدہ دل میں جگہ کیسے بنا سکتا ہے؟ نہیں، نہیں، نہیں۔

وہ نہیں میں زور زور سے گردن ہلاتی اور محفل کے باقی لوگوں میں شامل ہونے کی کوشش کرتی۔ لیکن بے قرار آنکھیں بار بار دروازے میں جا کے اٹک جاتی تھیں۔

اور پھر شائل علی کیک کٹنگ سیریمنی سے کچھ پہلے آ گیا تھا۔ گرے کلر کے ٹو پیس سوٹ میں وہ ہمیشہ کی طرح خوبصورت لگ رہا تھا۔ پہلی نظر میں ہی ماہا کو دیکھ کے وہ مبہوت رہ گیا۔ کتنی پیاری لگ رہی تھی وہ۔ کتنا حُسن، کتنا اُجلا پن تھا اس کے چہرے پر۔ اسے اپنے دل کے اندر محبت دھڑکتی محسوس ہوئی۔ اور پھر سارا وقت شائل کی آنکھوں میں وہی محبت مسکراتی رہی۔ وہی محبت کا نغمہ اس کے اندر سر اٹھاتا رہا۔ وہ نغمہ جو دل کے تپتے صحرا جیسی رات میں بھی اک جھونکا بن کے آئے اور ٹھنڈے چاند کی روشنی صحرا کی ریت پہ پھیلا کے صحرا کو بھی نخلستان بنا دے۔

محبت ایسا نغمہ ہے
ذرا بھی جھول ہو لے میں
تو سر قائم نہیں ہوتا
محبت ایسا شعلہ ہے
ہوا جیسی بھی چلتی ہو
کبھی مدھم نہیں ہوتا
محبت ایسا پودا ہے
جو تب بھی سبز رہتا ہے
کہ جب موسم نہیں ہوتا



''بہت عرصہ ہو گیا یار! میرا کسی پٹاخے سے واسطہ پڑے۔ زندگی بہت ادھوری ادھوری، بہت بے مصرف لگنے لگی ہے۔'' سلمان نے گاڑی چلاتے ہوئے اپنی ہی طرح کے عیاش دوست آذر سے کہا اور پھر سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا۔

''اس گوری چڑیا مارگریٹ کا کیا بنا؟........ پنجرے میں آئی یا پَر پھڑ پھڑا کے فرار ہو گئی؟'' آذر نے مسکرا کے کہا۔

''یار میرے! یہ گوریاں کبھی کسی کی نہیں ہوتیں۔ ان کا لہو بھی ان کی چمڑی کی طرح سفید ہوتا ہے۔ محبت اور وفا نام کی کوئی شے نہ ان کے اندر پنپ سکتی ہے نہ زیادہ دیر قائم رہ سکتی ہے۔ ان کی قوم یوں بھی جذباتیت سے ناآشنا ہے۔'' سلمان کے چہرے پہ نفرت کے تاثر اُبھرے۔

''لگتا ہے مارگریٹ سے تعلقات ختم ہو گئے۔'' آذر مسکرایا۔

''سالی اپنے شکنجے میں جکڑ لینا چاہتی تھی۔ اسے پتہ نہ تھا کہ وہ کس کو قید کرنے کے خواب دیکھ رہی تھی۔ چوہدری سلمان ساجد نہ کسی کے شکنجے میں پھنسا ہے، نہ پھنس سکتا ہے۔ پارسل کر دیا اس کے ملک واپس۔ چار ماہ بہت ہوتے ہیں ایک عورت کے نخرے اٹھانے کے لئے۔''

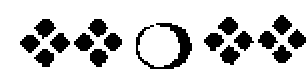
''چھوڑ یار! ان گوریوں کا پیچھا۔ تجھے کس چیز کی کمی ہے؟ اپنا وقت، پیسہ اور عمر لٹا

تو کسی ڈھنگ کی کڑی پر۔ یوں بھی جو بات دیسی مرغیوں میں ہے وہ فرنگیوں میں کہاں........ کسی لوکل لڑکی کی زلفوں کا اسیر ہو جا۔'' آذر نے اپنی طرف سے مفید مشورہ دیا۔

''ابا اور امی شادی پر اصرار کر رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ تیس برس کا ہونے سے پہلے پہلے شادی کر لینا میرے حق میں بہتر ہے۔'' سلمان نے اک اور اطلاع دی۔

''تو پریشانی کی کیا بات ہے یار میرے! ایک، دو، تین، چار شادیاں کرنی ہیں، کر ڈال۔ گھر بیٹھی بیوی کے کانوں تک خبر بھی نہیں پہنچتی کہ امیر زادے کس کی بانہوں میں سر رکھے سو رہے ہوں گے۔ اگر کبھی بولے تو اس کا منہ پیسے سے بند کر دینا۔ یوں بھی عورت کو دو ہی چیزوں سے مفلوج کیا جا سکتا ہے۔ یا بے پناہ محبت سے، یا بے پناہ دولت سے۔ محبت نہیں تو اس کا منہ پیسے سے بھرتے جاؤ۔ اتنا بھرو، اتنا بھرو کہ نہ تو وہ بول سکے اور نہ منہ کھول سکے۔ عمر بھر کے لئے مفلوج و معذور بنی آپ کے قدموں میں پڑی رہے۔'' آذر نے مکاری سے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ٹپس تیری بڑے کام کی ہوتی ہیں۔'' سلمان بھی اسی عیاری سے مسکرایا اور سگریٹ کا ایک اور کش لیا اور گاڑی آگے دوڑا دی۔



''اس عورت کا ذہنی توازن درست ہے ہمایوں! رپورٹس نیگیٹو آئی ہیں۔'' شہرین نے رپورٹس والا لفافہ ہمایوں کی طرف سرکایا۔

''کیا واقعی........؟'' ہمایوں نے حیرت سے شہرین کو دیکھا۔ شہرین نے گردن اثبات میں ہلائی۔ پریشانی، تفکر اور حیرت کے تاثرات اس کے چہرے سے عیاں تھے۔ ہمایوں رپورٹ کے پیپر اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔

''تو پھر اتنے سالوں سے اسے کس بناء پر پاگل خانے میں رکھا گیا ہے؟ ایک نارمل انسان کو پاگل خانے میں رکھوانا اسے پاگل کر دیتا ہے۔'' ہمایوں نے بھی اسی تفکر کے زیر اثر کہا۔

''مجھے تو یہ سارا کچھ ایک بنی بنائی پلاننگ کا حصہ لگ رہا ہے۔ وہ عورت مجھے کوئی معمولی عورت نہیں لگتی۔ وہ سردار واجد، اس کی بیوی زیب اور بہت ساری مشہور

ہستیوں کے متعلق ایسی باتیں جانتی ہیں جو کسی کو پتہ نہیں۔ اتنے سال پاگل خانے کے اندر رہنے کے باوجود بھی وہ اپنی پراپرٹی کے متعلق بے حد حساس ہے اور پوری معلومات رکھتی ہے۔ ہمایوں! یہ کیس اتنا سیدھا نہیں جتنا ہم سمجھے تھے۔ اس کیس میں بہت سی پیچیدگیاں ہیں۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ سچائی پہ جو پردہ ہے، اس کے اٹھنے سے قبل کوئی بھی بات ڈس کلوز کرنا بے وقوفی ہوگی۔ وہ بھی اس صورت میں کہ جب سردار واجد الیکشن میں کھڑے ہوئے ہیں اور ہفتے بعد ووٹنگ ہے۔'' شہرین نے سوچتے ہوئے ہمایوں کو تفصیل بتائی۔

''میرا تو خیال ہے تمہیں سیدھے سردار واجد سے رابطہ کرنا چاہئے۔ آخر کو وہ اس کیس کا لازمی جزو ہیں۔ اور پھر بقول اس عورت کے جس طرح سے سردار کی بیوی اداکارہ زیب کی موت ہوئی، اس کا علم خود سردار کو بھی نہیں۔ اور یہ پردہ دنیا کے ساتھ ساتھ سردار کی اپنی آنکھوں پہ بھی ہے۔ میں تو کہوں گا سردار واجد سے ملاقات کرو۔'' ہمایوں نے سوچتے ہوئے کہا۔

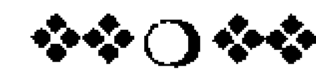
''یہی تو مسئلہ ہے ہمایوں!'' شہرین نے ہاتھ بال پوائنٹ رکھی فائل پہ دے مارا۔

''اس عورت نے مجھ سے قسم لی ہے تمام راز بتانے سے قبل کہ میں سردار واجد سے نہ ملوں۔ رابطہ کروں بھی تو صرف سردار کی بیٹی مہر النساء سے اور اسے اس کی ماں کے متعلق سارا کچھ بتاؤں۔'' شہرین نے کہا۔

''تو پھر ملو مہر النساء سردار سے۔ اور اسے بتاؤ سب کچھ۔''

''ٹھیک ہے...... میں رابطہ کرتی ہوں اس سے۔ امید ہے کوئی نہ کوئی حل نکل ہی آئے گا۔'' شہرین نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ اس کی نظر غیر مرئی نقطے پر ٹکی تھی اور ذہن پورا کا پورا مہر النساء کی طرف۔ کہانی سلجھنے کی بجائے اُلجھتی نظر آتی تھی۔

ریشم کی ڈوری جتنا کھولنے کی سعی کی جا رہی تھی، دھاگے آپس میں جڑ رہے تھے، اُلجھ رہے تھے۔



پس ہر آرزو آنکھیں تیری ہیں
ہمارے چار سُو آنکھیں تیری ہیں

ستارے جھک کے باتیں کر رہے ہیں
کہ محوِ گفتگو آنکھیں تیری ہیں
گل و شبنم میں تیرا عکس لرزاں
میانِ آب جُو آنکھیں تیری ہیں

ڈرائیو کرتے ہوئے وارث نے بیک ویو مرر میں دیکھا جس میں مہرو کی آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ ان سیاہ بڑی بڑی چمکدار اور پُر امید آنکھوں کو دیکھ کر لحہ بھر وارث سب کچھ بھول بیٹھے۔ بس ان آنکھوں کا نظارہ اور ان کا حُسن ذہن پہ چھایا رہا۔

بدن سے روح تک پھیلی ہے خوشبو
کچھ ایسی مشکبو آنکھیں تیری ہیں
میرے زخموں کو نیند آنے لگی ہے
بہت تسکین خُو آنکھیں تیری ہیں
وہ کیا منظر ہے جس کے دیکھنے کو
بھٹکتی کُو بہ کُو آنکھیں تیری ہیں

وارث کی پیشانی پہ ہلکے ہلکے پسینے کے قطرے نمودار ہوئے۔

اُف میرے خدایا!...... کیا کسی کی آنکھیں اس قدر خوبصورت ہو سکتی ہیں؟ اس قدر سیاہ، اس قدر روشن، چاند ستارے جن آنکھوں میں چمکتے دکھائی دیں اور اس کے اوپر لمبی لمبی پلکوں کی سیاہ جھالر اور کاجل کی موٹی سی لکیر، کیا یہ آنکھیں ہیں یا جنت کی طرف کھلنے والے دو دروازے ہیں؟...... دل کی طرف جانے والے دو راستے ہیں؟ دل کے بھید کھول دینے والے دو رازداں ہیں؟...... کیا یہ آنکھیں ہیں یا خواب ہیں؟ سراب ہیں یا دیوانگی کے عالم میں لے جانے والی سچائی ہیں؟...... یہ کیا ہیں؟

یہ بادل ہیں تیری پلکوں کے سائے
ستارے ہوبہو آنکھیں تیری ہیں
اُجالے ہی اُجالے ہر طرف ہیں
بہت خورشید رُو آنکھیں تیری ہیں
کہ جیسے ابر سے دریا کا رشتہ

ہماری جان تو، آنکھیں تیری ہیں
جو تُو دیکھے تو ہم بھی جگمگائیں
ہماری جستجو آنکھیں تیری ہیں

ان آنکھوں میں کتنے راز پوشیدہ ہیں........ کتنی اُمیدیں بسی ہیں........ کیسی والہانہ محبت جھانکتی نظر آتی ہے ان میں........ کس قدر ٹوٹ کر چاہنے والی ہیں یہ آنکھیں۔ کتنی سچائی، کتنی پاکیزگی ہے ان آنکھوں میں........ کیا یہ آنکھیں میری ہو سکتی ہیں؟ یہ آنکھیں میرے خواب تو دیکھتی ہیں مگر کیا ان آنکھوں کے روبرو ہو کر میں اپنا عکس، اپنی تصویر دیکھ سکوں گا؟........ کیا یہ خواب ممکن ہے؟........ کیا بجھتے سورج کی کرنوں اور چڑھتے چاند کی چاندنی میں ان آنکھوں کے ہمراہ دیکھ سکوں گا؟........ کیا میں کل کی دھندلاہٹ اور اُجلے آج کی سچائی ان روشن آنکھوں سے بانٹ سکوں گا؟........ کیا جھلملاتے جھلملاتے یہ دو نرگس دروازے مجھے جنت میں جانے کا راستہ دے سکیں گے؟........ کیا جنت میرے مقدر میں ہے؟ .... کیا رات کو ان آنکھوں کی نیند سے بوجھل پلکیں اپنے شانے پہ اس کا سر رکھے انہیں نیند کی گود میں جاتے دیکھ سکوں گا؟........ کیا صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ان آنکھوں کا کھلنا اور اک نئی جگمگاہٹ کا آنا دیکھ سکوں گا؟........ کیا ان میں نئے خواب، نئی اُمنگیں پرو سکوں گا؟........ کیا میں یہ سب کر سکوں گا؟........ ہزاروں سوال تھے جو ان آنکھوں کو دیکھ کر وارث حسن خان کے دل میں سر اٹھا رہے تھے۔ جاگ رہے تھے۔ کیا چڑھتا چاند مجھے ان آنکھوں کو پیار کرتا پائے گا؟........ کیا اُگتا سورج ان آنکھوں میں میری محبت کے دیے جلا پائے گا؟........ کیا ایسا ہو سکے گا جو میں چاہ رہا ہوں؟........ وہ شفاف ہائی وے پہ گاڑی چلاتے خود سے محوِ کلام تھے۔ مہرو آنکھیں موندے گاڑی میں چلتے ہوئے ہلکے میوزک سے لطف اندوز ہوتی رہی۔ وارث اپنے دل سے باتیں کرتے رہے۔

''وارث! ہم لاہور جہاز کے ذریعے بھی جا سکتے ہیں۔ اتنی دور کا سفر بائی روڈ کرنے کا کیا مطلب ہے؟'' اچانک مہرو نے آنکھیں کھول کر اس سے پوچھا اور وہ مسکرا دیئے۔

''وہ اس لئے کہ راستے میں آپ کے بابا جانی کے بہت سے کام نمٹانے ہیں۔

پہلے حیدرآباد میں ڈی سی صاحب سے بات چیت کرنی ہے، ایک رات ہم لاڑکانہ میں آپ کے بابا کے دوست کے گھر رکیں گے اور پھر کل صبح دوبارہ اپنا سفر شروع کریں گے اور کل رات تک لاہور پہنچ جائیں گے۔'' وارث نے پروگرام بتایا۔

''ارے واہ........ یہ تو بڑا ایڈونچر والا سفر ہو گا۔ میں یہ سفر کبھی نہیں بھولوں گی وارث!'' وہ مسکرائی۔

''انشاء اللہ میرے ساتھ گزرے یہ تین دن آپ کبھی نہیں بھولیں گی۔'' انہوں نے کہا۔

'تمہارے ساتھ گزرا کوئی لمحہ میں نہیں بھولوں گی وارث!' مہرو کے دل سے آواز آئی لیکن وہ خاموش رہی۔

''وارث! کیا حیدرآباد میں آپ مجھے المنظر کے کنارے لے جائیں گے؟'' وہ اچانک پھر بولی۔

''المنظر؟........ وہ کہاں ہے؟'' وارث نے پوچھا۔

''ہے ایک خوبصورت، پُرسکون گوشہ۔ اسی دنیا میں جہاں کوئی ایک بار چلا جائے تو بار بار جانے کا دل کرتا ہے۔ جو وہاں چند لمحے اپنے من پسند دوست کے ساتھ گزارے وہ ساری عمر اسی کا ہاتھ تھامے وہاں گزار دینا چاہتا ہے۔ کنارہ ہے ایک پانی کے بہاؤ کا۔ جسے المنظر کا نام دیا گیا ہے۔ جامشورو میں ہے۔ ایک بار جانا ہوا تھا میرا کالج کے ٹرپ پہ۔ ارادہ کیا تھا کہ دوبارہ جاؤں گی لیکن آج تک نہیں جا سکی۔ اگر آپ کے پاس وقت ہو اور آپ مجھے لے چلیں تو میں آپ کی بہت مشکور رہوں گی۔'' مہرالنساء نے تفصیل بتائی۔

''آپ کی خواہش ہو اور پوری نہ ہو، ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟........ ہم حیدرآباد کی حدود میں داخل ہو چکے ہیں اور میں اب سیدھا جامشورو کی طرف جاؤں گا۔ بائی پاس کی طرف سے۔ اور ہم کچھ دیر المنظر پہ رکیں گے۔'' وارث نے مسکرا کے کہا۔



عصر کا وقت تھا اور دھوپ کے سائے زیادہ چبھن والے نہ تھے۔ سنہری ستمبر کی دھوپ اس وقت بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ مہرو کا روم روم اپنے محبوب کے ساتھ

سے معطر تھا۔ اسی طرح کے لمحوں کی تو دعا کی جاتی ہے رب سے۔ محبت میں اسی طرح کے لمحے تو چرائے جاتے ہیں زندگی سے۔ سچ میں، محبت انسان کو کس قدر خودغرض بنا دیتی ہے۔ سب کچھ محبوب کو دے دینے کو دل کرتا ہے۔ محبت دان دیتی ہے اور زندگی کے لمحے بھی اسی دان کا حصہ ہوتے ہیں۔

گاڑی حیدرآباد بائی پاس تک پہنچی۔ بائی پاس کے دائرے کی شکل میں جاتی روڈ پہ دوڑتی گاڑیاں بہت خوبصورت لگ رہی تھیں۔

”ذرا دو منٹ گاڑی روکیے گا وارث!“ مہرو نے کہا اور وارث نے بنا کچھ دریافت کیے گاڑی کونے میں کھڑی کر دی۔ مہرو نے پیچھے کا دروازہ کھولا اور گاڑی سے اُتر گئی۔ وارث بھی اتر آئے۔

ہائی وے کی شفاف سڑک پر گاڑیاں تیز رفتاری سے جا رہی تھیں۔ ٹھنڈی تیز رفتار ہوا کے جھونکے مہرو کے بالوں کی لٹوں کو اُڑا رہے تھے۔ کچھ کچھ بادل بھی آسمان پر تیر رہے تھے اور کلاسیکل آرٹ کا نمونہ پیش کر رہے تھے۔ مہرو نے گردن اونچی کر کے ایک زور کی سانس اندر کھینچی اور باہر نکالی۔

وارث اسے حیرانی سے دیکھتے رہے۔ وہ کچھ دیر اسی طرح اونچی اونچی سانسیں لیتی رہی اور پھر وارث کے پاس آ کے مسکرائی۔

”میں نے بہت سے شہروں کے ہائی ویز دیکھے ہیں۔ لیکن جو بات حیدرآباد کے ہائی وے میں ہے وہ کہیں نہیں۔ یہ ٹھنڈی خوشگوار ہوا، یہ سکون۔ میرا بس چلے تو یہیں پاس کہیں ایک چھوٹا سا گھر بنا لوں جس کی گیلری سے یا کھڑکی سے پورے چاند کو دیکھوں۔“ مہرالنساء نے تخیلاتی منظر وارث سے شیئر کیا۔

”حیدرآباد سے آپ کا کوئی روحانی لگاؤ معلوم ہوتا ہے۔“ وہ بولے۔

”نہیں ...... ایسی کوئی بات نہیں۔ بس ایک بار آئی تھی تو بہت متاثر ہوئی تھی ان تمام چیزوں سے۔“

”میرا خیال ہے اب المنظر کی طرف چلا جائے۔ بادل جمع ہو رہے ہیں۔ مجھے تو موسم کے آثار ٹھیک نہیں لگ رہے۔“ وہ آسمان کی طرف دیکھ کے بولے۔

”دل کا موسم اچھا ہو تو باہر کے موسم اثرانداز نہیں ہوتے۔“ وہ مسکرا کے بولی اور

فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔ وارث نے بھی کچھ نہیں پوچھا اور گاڑی بائی پاس سے جامشورو کی طرف بڑھا دی۔

المنظر کے پُل تک آتے آتے ہلکی ہلکی بارش شروع ہو چکی تھی۔ گاڑی کی ونڈ اسکرین پر بوندیں ٹپ ٹپ گرتی تھیں۔ وائپر بوندوں کو صاف کرتے، پھر نٹ کھٹ بوندیں دوبارہ شفاف شیشے سے پانی کا کھیل کھیلتیں۔ مہرو خاموش آنکھوں سے وائپر اور بوندوں کا یہ تماشا دیکھتی رہی۔ آج اس کے چہرے پہ اک انوکھی قسم کی خوشی تھی۔ ایک ان کہی سی چمک تھی، ایک تازگی تھی۔

المنظر پہ لگے پُل پہ دونوں طرف سے پانی کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ پانی گو کہ زیادہ نہ تھا لیکن ساکت بھی نہ تھا۔ ننھی ننھی لہریں پانی میں خوبصورتی پیدا کر رہی تھیں۔ ہلکی ہلکی بوندیں آسمان سے ٹپک رہی تھیں۔ چند لکڑی کی کشتیاں تھیں جن پہ بیٹھے مچھیروں کو موسم کا ڈر نہیں ہوتا۔ آندھی ہو، بارش ہو، دھوپ کی چلچلاتی تپش ہو یا پھر سردی۔ ان کے دھندے نہیں رکتے۔ ان کے رزق میں طوفان بھی حائل نہیں ہو سکتے۔ دور آسمان سے کچھ پرندے اُڑتے پانی کی لہروں کو چھوتے اور دوبارہ اوپر کو اُٹھ جاتے۔ دوبارہ پانی کو چھوتے اور دوبارہ اُٹھ جاتے۔

کتنا سہانا تھا یہ منظر۔ مہرو یہ منظر عمر بھر کے لئے اپنی آنکھوں میں قید کر لینا چاہتی تھی۔ کبھی نہ نکالنے کے لئے۔ اس کا محبوب اس کے ہمراہ تھا۔ اتنا اچھا موسم تھا اور تنہائی تھی۔ وہ برستی ہلکی ہلکی بارش میں دعا کرنا چاہتی تھی۔ کہتے ہیں بارش میں کی گئی دعائیں پوری ہوا کرتی ہیں۔ اس نے آنکھیں بند کیں اور دعا کی۔

”میرے مالک! مجھے اس شخص کا ساتھ ہمیشہ کے لئے دے دے...... اسے میری محبت کا ادراک ہو اور میری ذات کو اس کا مضبوط سہارا دے دے۔“

”کس طرف جانا ہے؟ پُل تو ختم ہونے والا ہے۔ دائیں اور بائیں طرف دو کچے راستے جاتے ہیں۔ جہاں کہیں، لے چلوں۔“ وارث نے اس کے دھیان کو توڑا۔ وہ جو گوتم بدھ کے گیان جنگلوں میں بھٹک رہی تھی، پلٹ آئی۔

”جس طرف زیادہ بھیڑ نہ ہو اس طرف چلیں۔“ وہ بولی۔

وارث نے گاڑی بائیں طرف کے کچے راستے پر موڑ لی۔ کچی سڑک کے دونوں

طرف کچھ ٹھیلے والے تھے، کچھ لوگ تھے جو لکڑیوں کی بنچوں پر بیٹھے تھے۔ ذرا آگے آ کے وارث نے گاڑی روک دی۔

''واقعی بہت خوبصورت جگہ ہے۔'' وارث بے اختیار بولے۔

''میں اس کے کنارے پر بیٹھنا چاہتی ہوں۔'' وہ بولی۔

''راستہ بہت خطرناک ہے...... بہت نیچا ہے۔''

''مجھے خطروں سے ڈر نہیں لگتا۔'' اس کا ارادہ اٹل تھا۔

وارث نے اتر کے اپنی طرف کا دروازہ لاک کیا۔ وہ بھی اتر گئی۔ ہوا میں خنکی تھی۔ سیاہ بادل دھیرے دھیرے جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ فیروزی شرٹ اور بلیک جینز میں ملبوس وارث نے آسمان کو دیکھا۔ کچھ بوندیں اس کے چہرے پر گریں۔ مہرو اس سے آگے آگے نیچے اُترنے لگی۔ اس نے ہائی ہیل والی سینڈل پہنی تھی مگر اسے گویا کوئی پرواہ نہ تھی۔ وارث اس کے پیچھے پیچھے تھے۔ وہ لحہ بھر کو لڑکھڑائی۔ وارث نے اسے بازو سے تھام لیا۔ کسی طرح اونچا نیچا، ٹیڑھا میڑھا راستہ گزر کے وہ لوگ عین پانی کے پاس آ پہنچے۔ مہرو وہیں مٹی پر بیٹھ گئی اور گھٹنوں پہ ٹھوڑی ٹکائے وارث کو دیکھنے لگی۔ دونوں خاموش تھے۔ کچھ کہہ نہ پاتے تھے۔ کتنا مشکل تھا دل کے اصولوں کے آگے ہتھیار ڈال دینا۔ وارث حسن خان کے لئے امتحان کا مرحلہ تھا اور دل کی خواہش دبا کے محبت کی روح کو پامال کرنا مہرالنساء سردار کے لئے مشکل۔ دونوں امتحان میں تھے۔ سو دونوں چپ تھے۔

المنظر کے پانی کی چھوٹی چھوٹی لہروں میں
میں نے اک نام لکھا تھا
اس نام کے سارے حروف میرے پیاسے دل سے نکلے تھے
میرے اشکوں نے اس نام کو کتنی شمعیں دیں، روشن رکھا
تم ساتھ تھے میرے المنظر کے ساحل پر
ہونٹ تمہارے ساکت تھے پر
آنکھوں میں چاہت کے کتنے سائے بولتے تھے
کچھ جملے تھے، کچھ باتیں تھیں

جو زباں سے زباں تک آنے کو ترستے تھے
جو کہنا تھا وہ بند ہونٹوں سے کہتے تھے
ہاتھوں میں جو لرزش تھی تیرے وہ سچی تھی
آنکھوں میں جو تاثر آیا تھا وہ سالم تھا
پر وقت بھی کتنا ظالم تھا
جو بیت گیا
پانی پہ لکھے وہ لفظ میرے تم پڑھ نہ سکے
جو دل میں بات مچلتی تھی میں کہہ نہ سکی
ساحل پہ بیٹھ کے ہم چپ چاپ
اُٹھتی گرتی لہروں کو دیکھتے تھے
ساحل کی ہوا دونوں کے دل کو ہلاتی رہی
کوئی بات سی دل میں آتی رہی
کوئی لفظ تھا جو کہ تڑپتا رہا
وہ بات تھی ایک محبت کی
وہ لفظ تھا ایک محبت کا

''میں کچھ سننا چاہتی ہوں وارث!'' وہ اپنے ذہن میں لفظ تلاشتی رہی۔

''میں کچھ کہنا چاہتا ہوں مہرو!'' وہ بھی خاموش آنکھوں سے دیکھے گئے۔

''تمہاری محبت نے میرے اندر ایک اشتعال سا برپا کر رکھا ہے...... تمہاری ضرورت، تمہاری چاہت میرے اندر بڑھتی جا رہی ہے۔'' وہ خاموشی سے دیکھے گئی۔ اس کے دل کی طرح اس کی زبان سے نکلنے والے لفظ بھی بے بس تھے۔ کوئی بے اختیاری سی بے اختیاری تھی۔

''مہرو! میں بھی اپنی ذات کے بنائے اصولوں اور دنیا کے بنائے رواجوں میں جکڑا ہوں۔ سوچتا ہوں ایک مالک اور نوکر کا ملن کیسے ممکن ہے؟...... بھلا آسمان کبھی زمین سے مل سکتا ہے؟'' وہ بے بسی سے بولے۔

''کیوں نہیں مل سکتا وارث!...... دنیا کا ایک کونا ضرور ایسا ہوتا ہے جہاں زمین

اور آسمان ایک دوسرے سے گلے ملتے ہوں گے، کبھی نہ بچھڑنے کے لئے...... یہاں سے دور دیکھیں المنظر کے پانی کو، وہ آپ کو آسمان سے ملتا ہوا نظر آئے گا۔ آسمان اس کے اوپر جھکا ہوا دکھائی دے گا۔ اگر یہ پانی آسمان سے مل سکتا ہے تو مہرو، وارث کی کیوں نہیں ہو سکتی؟"

"میں آپ سے عمر میں بیس برس بڑا ہوں مہرو!...... آپ کا نمک کھا کھا کے بڑا ہوا ہوں...... آپ کے والد کی وجہ سے آج اپنے پاؤں پہ کھڑا ہوں۔" وہ مجبوری سے بولے۔

"محبت عمروں کے تضاد، کلچر اور کلاس کے تفرقات کو نہیں دیکھتی وارث!...... اگر دیکھتی تو وہ محبت نہ کہلاتی۔ محبت تو دلوں سے، روحوں سے اندر کی پرچھائیوں سے کی جاتی ہے۔"

"لیکن کیا شادی روحوں اور پرچھائیوں سے ہو سکتی ہے مہرو؟...... ٹھیک ہے، مانا اگر محبت روح کا رشتہ ہے تو روح کا رشتہ ساتھ رہے بغیر بھی قائم رہ سکتا ہے۔ اس کے لئے شادی کی شرط تو نہیں، جسموں کا ملن لازم تو نہیں...... نہیں مہرو! نہیں...... میں ایسا کچھ نہیں چاہتا۔" وہ عجب کشمکش میں تھے۔

"کیا آپ مجھ سے محبت نہیں کرتے؟" وہ ان کے ہاتھ کو تھام کے سوال کرنے لگی۔ اپنی آنکھیں ان کی آنکھوں میں گاڑ دیں۔ وہ آنکھیں چرانے لگے۔

"مہرو! میری بات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔"

"آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں یا نہیں......؟" وہ چلا کے بولی۔ المنظر کے ساحل کا پانی، آسمان کے پرندے، لہریں، بادل، بارش اس شدت پسند لڑکی پہ حیران ہو رہے تھے۔

وارث خاموش رہے۔

"میرے سوال کا جواب دیں وارث!...... آپ کو مجھ سے محبت ہے یا نہیں؟" وہ بضد تھی۔ مصر تھی۔ اس نے قیامت سے شرط لگا لی تھی۔ اس کی سرخ آنکھوں میں اک کربناک طوفان تھا۔ دریا کے کنارے اک سمندر جیسے پُر شور دل والی لڑکی آ بیٹھی تھی۔ سمندر ٹھاٹھیں مار کے پتھر سے ٹکرا رہا تھا۔

"ہاں...... مجھے آپ سے محبت ہے مہرو!...... بہت شدید، بہت مضبوط، بہت گہری...... ہاں مہرو! مجھے آپ سے بے پناہ محبت ہے۔" وہ اپنے دل سے مجبور ہو کے بولے۔ پتھر پہ اک ضرب پڑی۔

مہرو نے اپنی تھکی ہوئی گردن ان کے شانے پہ ٹکا دی اور کتنے عرصے کے جمع کئے آنسوؤں کو آنے کا راستہ دیا۔ وہ بھی اس کے بالوں میں ہاتھ پھیر کے آنسو بہاتے رہے۔ وہ پہاڑوں سے مضبوط شخص، لمبی قامت اور سخت ڈیل ڈول والا انسان نازک سی لڑکی کی محبت میں آنسو بہا رہا تھا...... سمندر کی ایک طوفانی لہر پتھر سے ٹکرائی اور پتھر کے اندر سوراخ ہو گیا۔ لہو کے آنسو پتھر کے سینے میں سمانے لگ گئے۔

وہ وارث کے کندھے سے لپٹ گئی۔ وارث نے پہلے کی طرح ایک بار بھی اسے روکا نہ تھا۔ اب ان کے درمیان وہ رشتہ نہ تھا جو پہلے تھا۔ جھجک، ڈر، خوف کی جگہ ایک بہادر اور بڑے دل والے جذبے نے لے لی تھی۔

وہ جذبہ جو آندھیوں کی سی شدت رکھتا ہے۔ ٹھوس سے ٹھوس اور جامد سے جامد درختوں کی جڑیں لمحوں میں ڈھیر کر سکتا ہے۔ جو موسلادھار بارشوں کا روپ رکھتا ہے۔ دنیا کے جنگل میں لگی آگ کو بھی لمحوں میں بجھا سکتا ہے۔ جو بے خوف و خطر آگ کے دریا میں ننگے پاؤں چل سکتا ہے۔ جھلس سکتا ہے، جھلسا سکتا ہے۔ تڑپ سکتا ہے، تڑپا سکتا ہے۔ کٹ سکتا ہے، کاٹ سکتا ہے۔

وہ جذبہ جو موم سے زیادہ نرم بھی ہے اور آگ سے زیادہ گرم بھی۔ جو پھول کی طرح نفیس و نازک بھی ہے تو لوہے کی طرح ٹھوس و جامد بھی۔ جو دھوپ کی طرح آنکھوں کو جلانے والا بھی ہے تو چھاؤں کی طرح ٹھنڈک پہنچانے والا بھی۔

وہ جذبہ جو عشق کہلاتا ہے۔ جسے محبت کہتے ہیں۔ جو ابتداء میں بھی انتہاؤں پہ ہوتا ہے۔ جو لمحوں کی جان پہچان کو بھی عمروں پہ محیط کر دیتا ہے اور عمروں کے رشتوں کے بیچ دراڑیں ڈال دیتا ہے۔ جو زمانے والوں کی ٹھوکروں سے بہت کچھ سیکھتا ہے اور زمانے کو بہت کچھ سکھاتا بھی ہے۔ جو لٹتا بھی ہے اور لوٹتا بھی ہے۔ جو پائمال کرتا بھی ہے اور پائمال ہوتا بھی ہے۔ وہ جذبہ جو جلتا بھی ہے اور جلاتا بھی ہے۔ ٹوٹے ہوئے پتوار کے سہارے منزل پہ پہنچاتا ہے۔ کچے گھڑے پہ سوار ہو کے منزل تک

پہنچاتا ہے۔

وہ جذبہ جو سسی کو پنوں کی تلاش میں ننگے پاؤں صحرا میں دوڑاتا ہے...... جو کیدوؤں کی بستی میں ہیر کو طاقتور بنا دیتا ہے۔ جو ٹوٹ جاتا ہے لیکن جھکتا نہیں۔ جو انارکلی کے عشق کا مقدر دیوار میں بنی قبر کو بنا دیتا ہے۔ وہی نافرمان جذبہ ان دونوں کے دل میں بھی اک الاؤ بن کر بھڑک اٹھا تھا اور دل کی بستی کے تمام گھر اس آگ نے اپنی لپیٹ میں لے لئے تھے۔

المنظر کے کنارے بیٹھے وہ کتنی دیر باتیں کرتے رہے۔ وہ ہمیشہ کی طرح کبھی رو رہی تھی، کبھی بسور رہی تھی تو کبھی کھلکھلا رہی تھی۔ اور وارث اس کے پل پل رنگ بدلتے چہرے کو دیکھ کے خوش ہو رہے تھے۔

آدھے گھنٹے بعد آسمان نے بادلوں کی سازش کے آگے اپنا سر جھکا لیا اور زوروں کی بارش شروع ہو گئی۔ دونوں بھیگنے لگ گئے۔

اُف اللہ!......وارث! اس قدر شدید بارش شروع ہو گئی ہے۔'' وہ بولی۔

''ہاں......اور اندھیرا بھی ہونے لگا ہے۔'' وارث بھی گھبرا گئے تھے۔

''اب کیا کریں؟''

''فی الحال تو یہاں سے اُٹھیں گے اور گاڑی تک چلیں گے۔ بارش کے رکنے تک کہیں انتظار کر لیں گے۔'' وارث فوراً اٹھ گئے اور مہرو کو سہارا دینے کے لئے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ وہ سہارا لے کر اٹھ گئی۔

''میرا خیال ہے آپ اپنا جوتا اتار کر ہاتھ میں پکڑ لیں۔ راستہ پہلے ہی خطرناک تھا، اب پھسلن بھی ہو گئی ہے۔''

وارث کے کہنے پہ اس نے اپنی اونچی ہیل والی سینڈل اتار کے ہاتھ میں تھام لی۔ گلابی جارجٹ کا سوٹ مکمل طور پر بھیگ چکا تھا۔ وہ وارث کا ہاتھ تھامے ننگے پاؤں پتھروں اور خودرو پودوں سے بھری چڑھائی پہ چڑھنے لگی اور وہ دونوں کسی کوہ پیا کی طرح ہاتھوں میں ہاتھ دیئے، زوروں کی بارش میں اوپر چڑھتے رہے۔ ذرا اوپر کو ایک پتھر پہ جیسے ہی مہرو نے پاؤں رکھا تو وہ بری طرح سے پھسل کے گر پڑی......

وارث نے ہاتھ سے اسے تھامنے کی بھرپور کوشش کی لیکن وہ یہاں تک کامیاب

ہوئے کہ اسے پانی کے اندر گرنے سے بچا لیا۔ نیچے پڑے ایک نوکیلے پتھر سے مہرو کا سر ٹکرایا۔ چوٹ شدید تھی جس کی وجہ سے بھیگی اور ٹھنڈی پیشانی میں سے بھی خون کا فوارہ اُبل پڑا۔

''اوہ مائی گاڈ......!'' وارث خود کو سنبھالتے ہوئے ذرا نیچے اُترے اور مہرو کو تھام کے اٹھانے لگے۔ اسے دونوں کندھوں سے تھامتے، بمشکل اسے اس کے پاؤں پہ چلاتے وہ کسی طور گاڑی تک آئے۔ فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول کر اسے بٹھایا۔ دونوں مکمل طور پر بھیگ چکے تھے۔ وارث نے ڈیش بورڈ کے اوپر رکھے ٹشو پیپر باکس سے دو چار ٹشو پیپر نکالے اور مہرو کے زخم پہ رکھ دیئے۔ خون مسلسل بہہ رہا تھا اور ٹپکتے ٹپکتے اک دھاری سی گال پہ بن گئی تھی۔

وارث فوراً ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھے اور گاڑی چلا دی۔ اس قدر تیزی سے برستی بارش میں پہلے کچا راستہ عبور کرنا تھا اور پھر پل کا پکا راستہ۔ تیز کڑکڑاتی بوندیں شیشوں پہ برس رہی تھیں۔ وائپر انہیں صاف کر رہے تھے۔

''آپ ٹھیک تو ہیں نا مہرو؟'' وارث کے چہرے پہ شدید تفکر کے آثار تھے۔ مہرو نے نیم وا آنکھوں سے وارث کو دیکھا، ہلکے سے مسکرائی اور آنکھیں موند لیں۔ وہ ہوش کی دنیا سے دور جا رہی تھی......

ایسی ہی کسی رُت میں
دو خواب سی آنکھوں نے اِک بات کہی مجھ سے
اس بات کے مطلب کے
مفہوم سلجھنے میں کیا شام و سحر گزرے!
اس رمز کی رم جھم میں، میں روح تلک بھیگا
سرسبز ہوا ایسا، موسم میری گلیوں میں
خوشبو کی طرح پھیلے
وہ بات رہی روشن یوں بھیڑ میں لمحوں میں
جگمگ سے ستاروں سے جس طرح قمر گزرے
وہ سامنے بیٹھا تھا اور اس کی گھنی پلکیں

جس وقت میری جانب اُٹھنے کو لرزتی تھیں
اِک پل کے لئے جیسے موقوف سا ہو جاتا
اس دل کا دھڑکنا بھی
لمحوں کا گزرنا بھی، دریاؤں کا چلنا بھی
زلفوں کے اندھیرے میں چہرے کا اُجالا تھا
بانہوں کا یہی حلقہ اِک چاند کا ہالہ تھا
سازِ دلِ مضطر کو چوڑی کی کھنک جیسے مضراب کی صورت تھی
انگلی سے اگر انگلی چھو جائے کبھی یونہی
وہ لمس کی لذت سے سرشار سا ہو جانا
ہلکی سی کسی رنجش، چھوٹی سی جدائی سے
نیندوں سے بگڑ جانا، تکیوں کو بھگو جانا
اس وقت یہ لگتا تھا دھرتی کے خزانوں میں
امبر کے تلے جو کچھ موجود ہے اپنا ہے
اس وقت جو سپنا ہے، تا صبح ابد اب تو اس کا ہی زمانہ ہے
سنسار کا ہر کونہ چاہت کا ٹھکانہ ہے
ہر نقش وفا جیسے رنگوں کی کہانی ہے
خوشبو کا فسانہ ہے!
اِک وصل کے رستے پہ
ہر خواب روانہ ہے



دوسری بیل پر فون کسی ملازم نے اٹھایا۔

''ہیلو!'' شہرین متوجہ ہوئی۔

''جی کون بول رہی ہیں؟''

''مجھے مہر النساء سے بات کرنی ہے۔'' مختصراً کہا گیا۔

''آپ کون جی؟''

''میں........ میں اس کی اسکول کی پرانی دوست عالیہ بات کر رہی ہوں۔'' شہرین نے فوراً جھوٹ گھڑا۔

''وہ جی........ مہر النساء بی بی تو کچھ دنوں کے لئے لاہور گئی ہیں۔'' ملازم نے جواب دیا۔

''لاہور؟........ کیوں، خیریت؟''

''بس جی گھومنے پھرنے۔ ادھر بھی ان کی کوٹھی ہے، گاڑی ہے۔ یوں بھی اکیلی یہاں رہ کر کیا کریں؟ نہ کوئی بہن نہ سہیلی۔'' ملازم شاید لمبی گپ لگانے کے موڈ میں تھا۔

''اچھا وہ کب آئیں گی؟''

''یہ تو ہمیں معلوم نہیں۔ وارث صاحب کو پتہ ہوگا۔''

''وارث صاحب؟........ یہ وارث صاحب کون ہیں؟''

''آپ کو نہیں پتہ وارث صاحب کون ہیں جی؟........ وارث صاحب اس گھر کے سب سے ضروری فرد ہیں۔ رشتے میں تو وہ معلوم نہیں سردار صاحب کے کون لگتے ہیں لیکن وہ سب کے بہت قریب ہیں۔''

''اچھا میں پھر فون کر لوں گی۔'' شہرین کو وارث کی تفصیل سے کوئی سروکار نہ تھا۔

اس نے فون رکھ دیا۔

''کیا ہوا؟'' ہمایوں اس کے چہرے پہ اٹھتے بکھرتے عکس دیکھ رہا تھا۔

''بات نہیں ہو سکی مہر النساء سردار سے۔ لاہور گئی ہوئی ہے۔'' انداز افسردہ سا تھا۔

''تو وہیں لاہور کا کنٹیکٹ نمبر یا موبائل نمبر لے لینا تھا۔''

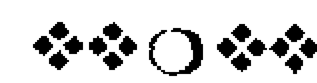
''اوہ...... یہ تو مجھے خیال ہی نہیں آیا۔'' شہرین نے دوبارہ فون اٹھایا اور نمبر ڈائل کرنا چاہا۔

''شہرین! ٹیک اِٹ ایزی۔ پچھلے ایک ڈیڑھ ہفتے سے تم صرف اسی کیس کے متعلق سوچ رہی ہو۔ دن ہو، رات ہو، کوئی وقت ہو تم نے تو اپنا آپ ہی بھلا دیا ہے اس کے پیچھے۔ اب ایسی بھی کیا وکالت کہ بندہ خود فراموش ہو جائے۔'' ہمایوں کے اندر سے ایک دوست بول پڑا۔

''اس کیس کا اُلجھاؤ میرے ذہن کو بھی اُلجھاتا جا رہا ہے۔ پرسوں الیکشن بھی ہے۔ میں دو دن کی چھٹی لے کر حیدر آباد جا رہی ہوں۔ ایک بار پھر بالی سے ملوں گی۔ مجھے مہر النساء کو اس کی ماں کی کہانی بتانی ہے جس کے لئے مجھے زیب کے متعلق کچھ اور معلومات اکٹھی کرنی ہیں۔'' شہرین نے کہا۔

''ابھی اگر ذرا سا وقت اپنے لئے نکالنا چاہو تو اپنے اس خوفناک چیمبر سے نکلو اور میری گاڑی میں بیٹھ کے میرے ساتھ ذرا تفریح کے لئے چلو۔ پلیز شہرین!'' ہمایوں نے التجا کی۔

''اچھا بابا! یہ لو، بند کر دی فائل۔ چلو!'' وہ فائل بند کر کے بیگ اٹھا کے کھڑی ہو گئی۔ ہمایوں مسکرا دیا۔



گاڑی چلاتے ہوئے ہمایوں نے ایک مسکراتی نظر شہرین پہ ڈالی تھی جو شہر کی سڑکوں کی طرف متوجہ تھی۔ ہمایوں نے ہاتھ بڑھا کے گاڑی کا سی ڈی پلیئر آن کر دیا۔ تیز میوزک نے شور ہنگامہ مچا دیا۔

''کیا ہومی! تم بھی نا...... یہ ریسلنگ کے گانے کیوں بجاتے ہو اپنی گاڑی میں؟ کبھی کوئی ڈھنگ کا گیت نہیں سن سکتے؟'' وہ زچ ہوئی۔

''میرا میوزک کے متعلق اک نظریہ ہے، ٹیسٹ ہے۔ تمہاری طرح میں ملکہ پکھراج کے پہاڑی راگ اور بڑے غلام علی کے پکے راگ نہیں سنتا۔ روتی بسورتی موڈ خراب کرتی آوازیں مجھے نہیں بھاتیں۔'' ہمایوں نے اسے چھیڑا۔

''خبردار جو میرے ٹیسٹ کو کچھ کہا تو۔ میوزک اور سنگیت کے متعلق میری اپروچ تم سے بہتر ہے۔ مشہور ریڈیو سنگر ثمین علی کی بیٹی ہوں۔ امی نے میرے اندر بھی وہ ذوق اور شوق پیدا کر رکھا ہے۔ مٹی میں بیج موجود ہو تو اسے پھلنے پھولنے سے کوئی روک نہیں سکتا۔'' وہ فخر سے بولی۔

''آنٹی کو لے کر کسی دن آؤ نا...... امی بہت یاد کرتی ہیں تم دونوں کو۔ میں نے تو ان سے کہہ دیا ہے کہ شہرین علی احمد کسی کو نہیں پہچانتی۔ وہ صرف ایک ڈیووٹڈ وکیل ہے جو اپنے پیشے سے انتہا درجہ تک ایماندار اور بندھی ہوئی ہے۔ اس کی زندگی میں کسی کے لئے کوئی جگہ نہیں۔'' ہمایوں نے گیئر بدلتے ہوئے نہایت سکون سے کہا۔

''ایسا کیوں کہتے ہو ہمایوں؟...... میں پوری کوشش کرتی ہوں سبھی کو وقت دینے کی۔ امی کو، تمہیں، سب دوستوں کو۔ لیکن پھر بھی سب کو مجھ سے شکایت رہتی ہے۔''

''شکایت دور کرنے کے لئے وہ طریقہ آزمایا کرو جو میں آزماتا ہوں۔ اپنے پیاروں، چاہنے والوں اور دوستوں کے لئے اچھے اچھے تحائف خریدا کرو۔ تحفے تحائف دینے اور لینے سے نہ صرف دل خوش ہوتا ہے بلکہ تحفے دینے والے پہ بے انتہا پیار بھی آتا ہے۔'' ہمایوں نے مسکرا کے کہا۔

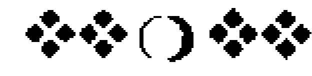
''آئیڈیا اچھا ہے تمہارا۔'' وہ مسکرائی۔

''میرے ساتھ رہو گی تو اسی طرح کے مفید مشورے حاصل کرو گی۔'' فرضی کالر جھاڑے گئے۔

''اچھا اب ذرا گاڑی کسی اچھے سے گفٹ شاپ کی جانب روکنا۔ شکایتیں کرنے والوں کی لمبی لسٹ ہے۔ سبھی کے لئے کچھ نہ کچھ خریدنا ہے۔'' وہ مسکرا کے بولی۔

''سب سے اچھا اور مہنگا گفٹ ہمایوں ظفر کے لئے خریدنا جو سارا دن تمہارے پاس رہ کر بھی انجان بننے کی اداکاری کرتا ہے اور پرانی دوست کو بھلا کر ایڈووکیٹ صاحبہ کو ڈیل کرتا ہے۔''

ہمایوں کے کہنے پر شہرین نے مصنوعی غصے سے اس کی جانب دیکھا۔



گونگے لبوں پہ حرفِ تمنا کیا مجھے
کس کور چشم شب میں ستارا کیا مجھے
زخمِ ہنر کو سمجھے ہوئے ہے گلِ ہنر
کس شہر ناسپاس میں پیدا کیا مجھے
جب حرف ناشناس یہاں لفظ فہم ہیں
کیوں ذوقِ شعر دے کے تماشا کیا مجھے
خوشبو ہے، چاندنی ہے، لب جو ہے اور میں
کس بے پناہ رات میں تنہا کیا مجھے
دی تشنگی خدا نے تو چشمے بھی دے دیئے
سینے میں دشت آنکھ میں دریا کیا مجھے

پاگل خانے کے خاموش اور ویران در و دیوار کو بنجر آنکھوں سے دیکھتی وہ غزل کے لفظ ذہن میں دوہرائے جا رہی تھی۔

کتنی غزلیں، کتنی نظمیں، کتنے شاعروں کی بیاض اسے ازبر تھی۔ بہت کم عمر سے وہ شاعری پڑھتی تھی۔ کیا کرتی تھی۔

جس طرح اپنے بستر کے پاس رکھے اسٹیل کے تھال میں ہاتھ ڈال کے وہ پانی میں رکھے تازہ گلاب چنا کرتی تھی، ہاتھوں کے پیالوں میں اٹھایا کرتی تھی، ٹھیک اسی طرح وہ لفظوں کی پنکھڑیاں چنا کرتی تھی اور نظمیں بنایا کرتی تھی۔

اچانک یادوں کے کھنڈر سے اک اُڑتا ہوا جملہ اس کی سماعتوں میں گونجا۔

''تمہاری نظمیں کتنی خوب صورت ہوتی ہیں....... نجانے کہاں سے چنتی ہو تم یہ الفاظ؟....... اتنی معصومیت کہاں سے آ سکتی ہے دنیا کی کسی بھی زبان میں؟........ کیسے لکھ لیتی ہو تم یہ نظمیں؟''

یادوں کے کھنڈر سے آتی کسی پرانی روح کی آواز پہ وہ چونک اُٹھی۔

کھنڈر کتنے عجیب ہوتے ہیں۔ کتنی کہانیاں دفن ہوتی ہیں ان میں۔ عظیم الشان۔

مگر ٹوٹے پھوٹے، شان سے تن کے کھڑے ہوئے مگر ویران، خوبصورت مگر بھیانک۔ پُرکشش مگر بے رنگ۔ آسودہ مگر بے جان....... کبھی کسی کھنڈر میں چلے جاؤ تو کئی کردار ٹوٹے پھوٹے در و دیوار سے بھاگتے دوڑتے محسوس ہوتے ہیں۔ کئی کہانیاں گونجتی ہیں۔ کسی جگہ سے کسی کہانی کی شروعات ملتی ہے اور کسی جگہ سے اس کا انت۔

کسی پرانے قلعے میں جاؤ تو کبھی شاہ زادیوں اور ان کی کنیزوں کی قلقاریاں اور شوخیوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں تو کبھی درباریوں کی آوازیں۔ پرانے گھروں کی ٹوٹی پھوٹی دیواروں میں جلتی ہوئی لکڑیوں کی چرچراہٹ سنائی دیتی ہے تو کبھی بہتے پانی کی آواز۔

کھنڈر بے جان ہو کے بھی جاندار ہوتے ہیں اور کچھ انسان بھی کھنڈر ہی کی طرح ہوتے ہیں یا بن جاتے ہیں یا بنا دیئے جاتے ہیں۔

جن کے بولنے سے بھی خاموشی ہوتی ہے۔ جن کی خاموشی میں بھی راز ہوتے ہیں۔ جن کی ہنسی میں بھی آنسو ہوتے ہیں۔ جن کی آنکھوں میں خزاں کے موسم ہوتے ہیں۔

جو خوبصورت تو ہوتے ہیں مگر ویران ہوتے ہیں۔
جو پُرکشش تو ہوتے ہیں مگر بے جان ہوتے ہیں۔
جو جاذب تو ہوتے ہیں مگر ڈراؤنے لگتے ہیں۔
جو عظیم تو ہوتے ہیں مگر ٹوٹے پھوٹے سے محسوس ہوتے ہیں۔
کھنڈروں اور انسانوں میں بہت کم فرق ہوتا ہے۔

اتنے سال پاگل خانے میں گزار دینے کے بعد وہ بھی کھنڈر بن گئی تھی۔ کھنڈروں کی طرح ویران ہو گئی تھی۔ کوئی بھی تو پاس نہ تھا۔ نہ کوئی اپنا، نہ کوئی دوست، نہ غمگسار۔ کوئی تنہائی سی تنہائی تھی۔ لیکن کیا اس کا دنیا میں کوئی اپنا نہ تھا؟....... کوئی خونی رشتہ نہ تھا؟....... کوئی ساتھی نہ تھا؟....... ساتھی کا سوچ کر دل کے کھنڈر سے اک اور آواز گونجی۔

''میں تمہارا ساتھ کبھی نہیں چھوڑوں گا....... تم میری ہو، میری رہو گی....... دنیا کی کوئی طاقت تمہیں مجھ سے الگ نہیں کر سکتی۔ کبھی بھی ہمارے درمیان کوئی دوری پیدا

نہیں کر سکتا۔"

کوئی بہت نرم لہجے میں دل کے نزدیک کھڑا ہو کے کہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

'جب اتنے وعدے کیے تھے تو پھر ساتھ کیوں چھوڑا؟........ جب میں تمہاری تھی تو پھر اپنے سے دور کیوں کیا؟........ رُسوا کیوں کیا؟........ ساتھ تو زندگی بھر پہ محیط تھا نا، زندگی جب ختم نہیں ہوئی تو ساتھ کیوں چھوڑ دیا؟........ دنیا کی ایسی کون سی طاقت تھی کہ جس نے الگ کر دیا؟........ ایسا کون سا پہاڑ تھا جو محبت کی طاقت سے زیادہ سخت تھا؟'

وہ روتی رہی، تڑپتی رہی۔ ایک بار پھر اس پہ دورہ پڑا اور وہ زور زور سے چیخنے لگی۔

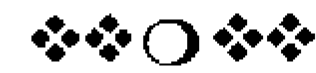
"ہائے اللہ!........ میرا کیا قصور تھا؟........ ہائے اللہ! مجھے کس جرم کی سزا ملی؟"

وہ اپنا سر آہنی پلنگ کی سیخوں سے ٹکرانے لگی زور زور سے۔ سر کے پیچھے والے حصے سے گاڑھا گاڑھا سرخ خون ٹپکنے لگا۔

"بالی!........ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی........ تُو نے مجھے برباد کر دیا........ میں نے تیرا کیا بگاڑا تھا بالی؟........ ہائے اللہ! میرا کیا قصور تھا؟" وہ چیخ چیخ کر سر ٹکرائے جا رہی تھی۔

نرس نے اس طرف دیکھا اور دوڑتی ہوئی ڈاکٹر کے پاس گئی۔ کچھ ہی دیر میں عملے کے لوگ اور ڈاکٹر اس کے گرد جمع تھے۔ اسے سکون کا انجکشن دیا گیا۔ اس کے بعد اس کے سر کے زخم پر ٹانکے لگائے گئے اور بینڈیج رکھی گئی۔ خون سے لت پت اس کے کپڑے بدلے گئے اور وہ محبت کی ماری، نیم پاگل، کھنڈر جیسی عورت آنکھیں موندے، زخم کھائے ایک بار پھر مدہوشی کی گود میں سو گئی۔ محبت اپنے انجام پہ آنسو بہانے لگی۔

اے محبت تیرے انجام پہ رونا آیا
جانے کیوں آج تیرے نام پہ رونا آیا

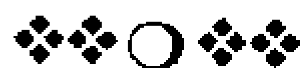


الیکشن کیمپین شروع ہو چکی تھی۔ دونوں پارٹیاں یکساں جوش اور جذبے کے ساتھ الیکشن کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ جلسے اور ان میں ہونے والے پُر جوش خطاب، جگہ جگہ

لگے ہوئے پوسٹر اور ہر علاقے سے نکلنے والی ریلیاں۔

دونوں حریف طاقت و شجاعت میں یکساں تھے۔ دونوں کی پوزیشن مضبوط تھی۔ دونوں کے ہی چمچے اپنے اپنے کام اور فرائض احسن طریقے سے انجام دے رہے تھے۔ دونوں حریف جہاں ایک طرف بایقین اور پُر اعتماد تھے کہ کرسی انہی کی ہو گی، وہیں ہلکا ہلکا ڈر اپنی ہار اور مقابل کی جیت کا بھی تھا کہ مقابلہ سخت تھا اور دونوں پارٹیاں کیل اور کانٹے سے لیس تھیں۔

الیکشن سے ایک دن پہلے سردار صاحب اور چوہدری ساجد مکمل طور پر الرٹ ہو گئے تھے۔ گھروں کی سیکیورٹی سخت کی گئی تھی۔ سوائے خاص لوگوں کے کسی کے بھی اندر آنے پر پابندی تھی۔ ٹیلی فون پر اعلیٰ شخصیات سے گفت و شنید جاری تھی۔ پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے حالاتِ حاضرہ کی خبر بھی رکھی جا رہی تھی۔ فیصلہ ہونے میں صرف ایک دن تھا اور فیصلے کا انتظار دونوں کو یکساں طور پہ تھا۔



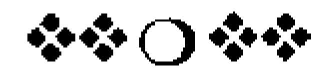
شدید بخار اور چوٹ نے اس کے اوپر بے ہوشی سی طاری کر دی تھی۔ وہ کئی گھنٹوں سے بے خبر سو رہی تھی اور وارث اس کے بستر کے قریب بیٹھے اسے دیکھ رہے تھے۔ سیاہ رنگ کی سادہ سی شلوار قمیض میں، کھلے بال سفید تکیے پہ بکھرائے وہ نیند کی آغوش میں بے خبر لیٹی تھی۔ باہر ہلکی ہلکی بارش ابھی بھی جاری تھی۔ نجانے یہ بے موسم برسات کہاں سے آرکی تھی اس بے سروسامان محبت کے ان دیکھے جزیرے پر۔

ہائی وے کے پاس بنے کاٹیج میں وارث نے اپنے ایک دوست کے گھر پناہ لی تھی۔ مہر النساء کی حالت سفر کے قابل نہ تھی۔ اس لئے آرام بے حد ضروری تھا۔ اس گھر میں آنے کے بعد وارث نے اسے فرسٹ ایڈ کے طور پر دوبارہ بینڈیج کیا، اس کا بخار چیک کیا، دوائی دی، کھانا کھلایا۔ اور پھر وہ سو گئی۔ تکلیف کے باعث وہ نیند میں ہلکے ہلکے کراہ رہی تھی۔ بڑی بڑی پلکوں والی ستارہ آنکھیں لرز رہی تھیں۔ پیشانی پہ بھنور سے آتے اور معدوم ہو جاتے۔ سفید رنگت پہ حرارت نے ایک گلابی سی تہہ بچھا رکھی تھی اور اوپر سے سیاہ بالوں کا حلقہ........ سیاہ آسمان میں چاند کا سفید دائرہ سا چمک رہا تھا۔ چاند جو بہت گہری نیند سو رہا تھا۔ چاند جو کسی بھی قسمت کو چمکا سکتا ہے۔

اس کے معصوم اور شفاف چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے وارث نے سوچا۔

'کتنا معصوم ہے یہ چہرہ...... کتنا شفاف، کتنا پاکیزہ۔ جیسے کہ دودھ سے دُھلا ہو۔ اتنے آنسو کیوں ہیں اس کی آنکھوں میں؟...... اتنی اُداس کیوں ہے یہ؟...... اتنا تنہا کیوں ہے اس کا دل؟...... یہ بھولی بھالی سی، نازک سی، ننھی سی پری کیوں اتنی بڑی دل دکھا دینے والی باتیں کرتی ہے؟'

'میرے مالک!...... اے مالکِ خیر وشر! تُو بے شک میری کوئی دعا نہ سن، بے شک تُو مجھے میرے خوابوں کی تعبیر نہ عطا کر، میں کبھی تجھ سے کوئی شکایت نہیں کروں گا۔ لیکن اس لڑکی کے خوابوں کے روشن دیے سلامت رکھنا...... اس کی آنکھوں کے چراغ بجھنے نہ دینا...... اسے جہاں رکھنا، ہنستا مسکراتا رکھنا...... یہ خوشیاں سمیٹتی سمیٹتی تھک جائے مگر خوشیاں کم نہ ہوں...... گیت ہمہ وقت اس کے ہونٹوں پر مچلتے رہیں...... ستارے ہمہ وقت اس کی آنکھوں میں چمکتے رہیں...... روشنی ہمیشہ اس کے دل کو منور رکھے۔ جگمگاہٹیں اور رنگینیاں ہمیشہ اس کی ذات کو شادماں رکھیں۔ یہ ہنسے، مسکرائے، کھلکھلائے...... تتلی، جگنو، پھول، ستارے، برف، جھرنے اس کے دوست رہیں۔ گیت اس کے رازداں رہیں...... نظمیں اس کی سہیلیاں ہوں۔ میرے مالک! اس لڑکی کو زندگی کی ہر خوشی دے دے...... اسے ایک خوبصورت زندگی دے دے۔''



صبح کی کرنیں کمرے کی کھڑکی سے اندر آئیں تو اس تازہ روشنی کے ساتھ مہر النساء نے آنکھیں کھولیں۔ پرندوں کی چہچہاہٹ کی آواز کانوں سے ٹکرائی۔ نامانوس ماحول کو دیکھ کر اس نے ذہن پر زور ڈال کے کچھ یاد کرنے کی کوشش کی۔ سر میں چوٹ والی جگہ پہ درد کی ایک ہلکی سی ٹیس اُٹھی۔ بے اختیار اس کا ہاتھ پیشانی تک گیا اور اسے کل شام کی بارش اور المنظر پہ وارث کا ساتھ ہونا یاد آیا۔ وہ بستر سے اُتری اور نیلے رنگ کے دبیز قالین پہ چلتی ہوئی چھوٹے سے کمرے کی کھڑکی میں آ کے ٹھہر گئی۔

''میں کہاں ہوں؟...... کراچی یا پھر لاہور میں؟'' خود کلامی کی کیفیت میں خود سے سوال کیا اور کھڑکی پہ لگا دبیز پھولدار پردہ ہٹایا۔ شیشے والا سلائیڈ کرتا پٹ کھولتے

ہی ٹریفک کی آواز آنا شروع ہوئی۔ سامنے ہائی وے نظر آ رہا تھا جہاں بس، ٹرک، گاڑیاں اور ہر طرح کا ٹریفک اپنی مخصوص رفتار میں چل رہا تھا۔ بائی پاس کا وہی دائرہ جہاں کل مہرو پیدل چلی تھی، نظر آ رہا تھا۔

''کیا میں ابھی تک حیدر آباد میں ہوں؟'' ایک اور سوال اس نے خود سے کیا۔

تبھی کمرے کا دروازہ کھلا اور وارث چائے کے کپ، ڈبل روٹی، مکھن اور جوس کے گلاس پہ مشتمل ناشتے کی ٹرے اٹھائے اندر آئے۔

''السلام علیکم!...... شکر ہے آپ اٹھ گئیں۔'' وارث کے چہرے پہ تازگی بھری مسکراہٹ تھی۔

''وعلیکم السلام وارث!...... یہ کس کا گھر ہے؟ ہم کہاں ہیں؟'' وہ بولی۔

''مجھے معلوم تھا آپ اٹھنے کے بعد پہلا سوال یہی کریں گی کہ ہم کہاں ہیں؟ آپ بے فکر ہو جائیں۔ ہم ایک محفوظ جگہ پہ ہیں۔ یہ میرے دوست کا گھر ہے آپ کی پسندیدہ جگہ حیدر آباد ہائی وے پر۔ کل آپ کی طبیعت بہت خراب تھی لہٰذا بارش میں آگے سفر کرنا ممکن نہ تھا اس لئے یہاں لے آیا آپ کو۔'' وارث نے اسے تسلی دی۔

''لیکن وارث! کیا بابا کے علم میں یہ بات ہے کہ ہم کہاں ہیں؟''

''سردار صاحب اوّل تو بہت مصروف ہیں الیکشن کے امور میں۔ میں نے کل رات کو فون پہ اطلاع دے دی تھی کہ بارش کی وجہ سے ہمیں اپنا سفر روکنا پڑ رہا ہے اور موسم ٹھیک ہوتے ہی ہم دوبارہ روانہ ہو جائیں گے۔'' وہ ٹیبل پر ٹرے رکھ کے اطمینان سے صوفے پر براجمان ہو گئے۔ ''آیئے، ناشتہ کر لیجئے۔ کل رات بھی کچھ نہیں کھایا آپ نے۔''

وہ خاموشی سے وارث کے سامنے بیڈ پر بیٹھ گئی اور وارث نے جوس کا گلاس اس کے سامنے کیا۔ اس نے لے لیا اور وارث کی جانب دیکھا۔

''مجھے شاید گہری چوٹ آئی تھی۔ مجھے ٹھیک سے کچھ یاد نہیں آ رہا۔'' وہ بولی۔

''ٹھیک کہا آپ نے۔ بارش تیز ہوتے ہی جب آپ کے پسندیدہ دریا کے کنارے سے ہم اُٹھنے لگے تو آپ کا پاؤں نامعلوم وجوہات کی بناء پر پھسل گیا۔ بارش میں بھیگنے اور چوٹ کھانے کے باعث آپ بخار سے بھی نبرد آزما ہوتی رہیں۔'' اسے

تفصیل بتائی گئی۔

"اب آگے کیا ارادہ ہے؟"

"آگے کا یہ ارادہ ہے کہ آج ہر حال میں لاہور پہنچنا ہے۔ کل الیکشن ہے اور مجھے واپس دو دن تک کراچی پہنچنا ہے۔"

وہ مسکرا دی۔ پہلی بار وارث کو اس قدر بولتے ہوئے سنا تھا۔ اوپر سے پچھلی شا والا اقرار ابھی بھی ذہن پہ چھایا تھا، اپنی تمام تر تازگیوں کے ہمراہ...... وہ جوس کے چھوٹے چھوٹے سپ لیتی ہوئی وارث کو دیکھتی رہی۔



شائل کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب عادل بھائی نے سیدھا اسے لائٹ ہاؤس پرانے کپڑوں کے ٹھیلے کے سامنے کھڑا کر دیا۔ لنڈے کے سیکنڈ ہینڈ کپڑوں سے بھرے پڑے برانڈڈ کپڑے دیکھ کر شائل حیرت سے عادل کو دیکھتا رہا۔

"یہ کہاں لے آئے مجھے عادل بھائی؟...... میں نے تو آپ کو وہاں جانے کے لئے کہا تھا جہاں سے آپ نے اپنے کپڑے خریدے تھے۔"

"تو بھائی میرے! یہ وہی جگہ تو ہے۔" عادل نے شانِ بے نیازی سے کہا۔

"یہ تو لائٹ ہاؤس ہے...... استعمال شدہ مال، لنڈا ہے۔ آپ نے تو جو کپڑے پہنے تھے۔ نائیک اور ایڈیڈاس کی شرٹیں۔ اور آپ نے کہا تھا کہ سستے داموں پر لنڈن سے منگوائی ہیں۔" شائل نے وضاحت کی۔

"اپنے لئے تو یہی لنڈہ، لنڈن کی حیثیت رکھتا ہے...... دیکھو کتنی ورائٹی ہے، کیا مال ہے اور کس قدر سستی برانڈڈ شاپس ہیں۔ جو پسند کرتا ہے کرو۔ چند سال چل جانے کی گارنٹی مجھ سے لے لو۔ میں تو ان کا ریگولر کسٹمر ہوں۔" عادل نے کالر جھاڑا۔

"لے لو بھائی!...... لے لو بھائی!...... سو کی دو...... سو کی چار۔" ٹھیلے وا بدبودار شرٹیں ہلا ہلا کے کہتا رہا۔

بات صرف اتنی سی تھی کہ چند دن پہلے جب عادل بھائی نے اپنی نئی نوکری پہ جا شروع کیا تو روزانہ اچھی اچھی، نئی نئی شرٹوں کے پہننے کا ایک سلسلہ شروع ہوا۔ شائل کو وہ رنگ برنگی، صاف شفاف شرٹیں بڑی اچھی لگیں۔ دو ایک بار ادھار مانگ کے

پہن لیں، پھر عادل سے پوچھ ہی بیٹھا کہ یہ کہاں سے لیں۔ بس پھر جو تعریفوں کے پل عادل بھائی نے باندھے ان کی کوئی انتہا نہ تھی اور پھر وہ سیدھا اسے لائٹ ہاؤس لے آیا۔

لائٹ ہاؤس سے کئی طرح کی ٹی شرٹیں، جینز اور فارمل شرٹیں پسند کرنے اور خریدنے کے بعد وہ لوگ سیدھا گھر آئے تھے اور گھر آنے کے بعد عادل بھائی کی کارروائیوں نے شائل کا منہ حیرانی سے کھلا چھوڑ دیا۔ اپنی تیئس چوبیس سالہ زندگی میں اس نے کبھی ایسی کارروائی نہیں دیکھی تھی۔ عادل بھائی نے کپڑے دھونے والا ٹب اٹھایا، اس میں پانی بھرا اور ڈیٹول کی آدھی شیشی انڈیل دی۔

"عادل بھائی! کیا کر رہے ہیں آپ؟"

"ارے میرے منے! تو دیکھتا جا۔ تو اُس دن میری خوش لباسی کا راز پوچھ رہا تھا نا۔ یہ وہی راز ہے۔ سالے گوروں نے پہن پہن کے تمام کپڑوں میں اپنے گوشت کی بدبو پھیلا دی ہوگی۔ اس لئے یہ تمام کپڑے دس پندرہ منٹ ڈیٹول میں اشنان کریں گے، اس کے بعد دُھلیں گے۔" عادل بھائی ڈیٹول والے پانی میں شرٹیں بھگونے لگے۔

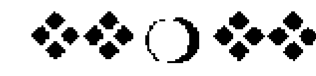
"لیکن اتنا سارا ڈیٹول...... ہم لوگ مہینہ نہا لیتے اس سے۔" شائل گھبرا گیا۔

"ارے میرے چکنے! ہم لوگ سال بھر بھی نہ نہائیں تب بھی اتنی بدبو نہیں ہوتی جتنی ان گوروں کی شرٹوں میں ہوتی ہے۔ قسم سے مرے ہوئے کتے کا گمان ہوتا ہے۔ شکر کر کہ میں نے فنائل میں نہیں ڈبوئے یہ جراثیم زدہ کپڑے۔" عادل بھائی نے مسکرا کر کہا۔

اور پھر ڈیٹول میں نہانے اور اچھے سے واشنگ پاؤڈر میں دھلنے، اچھی طرح خشک ہونے اور پریس ہونے کے بعد وہ کپڑے کہیں سے بھی لنڈے سے آئے معلوم نہ ہوتے تھے۔ نکھرے نکھرے رنگ، اعلیٰ کوالٹی کا میٹریل اور جراثیم سے پاک کپڑے۔ شائل واقعی حیران ہو گیا یہ برانڈ دیکھ کے۔ اس نے واقعی عادل بھائی کی کفایت شعاری اور سمجھ داری کی داد دی۔

اگلے ماہ اس کی اکلوتی بہن کی شادی تھی لہٰذا ابھی اس نے کچھ اور کپڑے بھی

خریدنے تھے۔



اور پھر خوشبو کی ایک کہانی کا آغاز ہو پڑا۔

اسے پتہ ہی نہ چلا کب شائل علی اس کی زندگی کے ہر ہر موڑ پہ شامل ہونے لگ گیا۔ پہلے وہ کبھی کبھار شام میں آتا تھا، اب اکثر رات کا کھانا بھی ماہا اور بچوں کے ہمراہ کھانے لگا۔ اکثر یونیورسٹی کی چھٹی کے بعد وہ شائل کو اپنے ساتھ ہی گھر لانے لگی۔ تکلفات اور فاصلوں والا یہ انجان رشتہ آہستہ آہستہ اپنی اجنبیت گھٹانے لگا اور دوستی میں تبدیل ہونے لگا اور دوستی بھی ایسی جس نے ماہا کو تنہائی کی خوفناک چڑیل کی قید سے آزاد کروا دیا۔

تنہائی وہ زہر بجھی تلوار ہے جس کے چنگل سے
بعض اوقات تو دشمن کو بھی زندہ رکھنا پڑتا ہے
مانا وادیٔ عشق میں پاؤں اندھا رکھنا پڑتا ہے
لیکن گھر کو جانے والا رستہ رکھنا پڑتا ہے

شائل کے قہقہوں، اس کی باتوں، اس کی نظموں نے ماہا کی تنہائی دور کر دی تھی۔ اس کے دل کے اندر اکیلے پن کے جتنے چھید تھے، وہ بھر دیئے تھے۔

آج بھی یونیورسٹی سے واپسی پر وہ شائل کے ہمراہ بچوں کی شاپنگ کیلئے نکل گئی تھی۔ بہت دن ہو گئے تھے، عاشر اور ضحیٰ کے لئے اس نے کوئی کھلونا نہیں خریدا تھا۔

سب سے پہلے وہ شائل کو ساتھ لے کر کھلونوں کی دکان میں آئی۔ ڈھیروں ڈھیر کھلونوں میں سے ضحیٰ کے لئے باربی ہاؤس لیا اور عاشر کے لئے کچھ ویڈیو گیمز کی سی ڈیز۔ کچھ ننھی ننھی باربیز بھی لیں۔ ضحیٰ کو گڑیوں کا بے حد شوق تھا اور ماہا ہمیشہ ایک نئی گڑیا لیا کرتی تھی اس کے لئے۔ ضحیٰ کا پورا کمرہ خوبصورت کپڑوں اور معصوم صورت والی گڑیوں سے بھرا پڑا تھا۔ اور عاشر کے شوق لڑکوں والے تھے۔ ویڈیو گیمز، پلے اسٹیشن، کرکٹ، فٹ بال۔

کھلونے خریدنے کے بعد وہ کپڑوں کی دکان میں تھے۔ ماہا نے پہلے ضحیٰ کے لئے اچھی اچھی فراکیں خریدیں جن پر خوبصورت سے ننھے سے پریوں والے پَر تھے۔ جن

کے ساتھ ننھا سا ستارا تھا جیسے پریاں جادوئی ستارہ ہاتھ میں لیتی ہیں۔ ماہا نے بڑے شوق سے اپنی پریوں سی بیٹی کے لئے وہ خریدے۔ پھر عاشر کے لئے شرٹس خریدنے کی باری آئی۔ ماہا نے شائل سے مدد مانگی۔

''شائل! تمہارے کپڑے ہمیشہ بہت اچھے ہوتے ہیں۔ رنگوں کی چوائس، مٹیریل کا سلیکشن ہمیشہ بہترین ہوتا ہے۔ کہاں سے خریدتے ہو تم؟''

''بس میم! کچھ برانڈڈ شاپس ہیں جہاں بہت اچھے کپڑے ملتے ہیں۔ بس کچھ اصول ہوتے ہیں وہاں کے۔'' شائل نے مسکرا کے کہا۔

''اصول؟........کیا مطلب؟ میں سمجھی نہیں۔''

''مطلب یہ کہ ان دکانوں پہ جو بھی چیز یا پھر جو بھی اسٹاک آتا ہے وہ پہلے آؤ، پہلے پاؤ کی بنیاد پہ آتا ہے۔ ذرا کھوج تلاش کے بعد وہاں سے پسندیدہ چیز دریافت کی جاتی ہے اور اس کی دریافت یا Discovery ایسی ہی ہوتی ہے جیسے نیل آرم اسٹرانگ نے چاند کی سرزمین دریافت کی تھی۔'' شائل نے ٹھہر ٹھہر کے بہت مزاحیہ انداز میں کہا۔

''ایسی کون سی دکان ہے یہاں شائل؟........میں تو اتنے سالوں سے وہاں نہیں گئی۔ اور یہ اتنی مہنگی برانڈڈ شرٹس تم کیسے افورڈ کر سکتے ہو؟'' ماہا حیران تھی۔

''یہی تو بات ہے میم! کہ وہاں یہ تمام برانڈ بہت سستے ملتے ہیں۔ وہ کوئی شیشے کی دکان نہیں، لکڑی کی ریڑیاں یا پھر ٹھیلے ہوتے ہیں جہاں ہر جانب سے سو کی تین، سو کی چار کی آوازیں آتی ہیں۔'' شائل کا لہجہ مزید شرارتی ہو گیا۔

''کہیں تم لنڈے کی بات تو نہیں کر رہے؟'' وہ محظوظ ہوئی۔

''Exactaly........اب بوجھی آپ نے یہ پہیلی۔ لیکن لنڈا کہہ کے آپ امیج نہ خراب کریں۔ لائٹ ہاؤس کہا کریں، لائٹ ہاؤس۔'' شائل نے مزید کہا اور وہ بہت ہولے سے مسکرا دی۔



اس دل کے چند اثاثوں میں اِک موسم ہے برساتوں کا
اِک صحرا ہجر کی راتوں کا، اِک جنگل وصل کے خوابوں کا
اس چودھویں رات کے سائے میں جب آخری بار ملے تھے ہم
یہ دل پاگل کب بھولتا ہے وہ باغ سفید گلابوں کا
میرے خیمۂ دل کے پاس کہیں اِک جگنو ٹھہر گیا اور پھر
سیلاب تھا ساری بستی میں اندازوں کا، آوازوں کا
ہم لوگ جنوں کے عالم میں منزل کی طلب بھی بھول گئے
اب دل کو بھلا سا لگتا ہے، صحرا میں عکس سرابوں کا
جن لفظوں کے کچھ معنی تھے وہ لفظ تو خواب ہوئے لیکن
اب شہر میں لگتا جاتا ہے اِک میلہ نئی کتابوں کا

عقیقہ عثمان کے دل پہ گراں گزر رہے تھے ٹھکرائے جانے کے احساس، رائیگانی کے اذیت ناک پل، بے اعتباری کے رونگٹے کھڑے کر دینے والے منظر۔

وہ مسلسل ماہا کو شائل کے قریب سے قریب تر ہوتے دیکھ رہی تھی۔ پہلے کلاس میں، پھر کینٹین میں، پھر لائبریری میں اور پھر پکنک میں وہ ساتھ ساتھ نظر آتے تھے۔ اب شائل، ماہا کے ہمراہ اسی کی گاڑی میں یونیورسٹی سے جانے لگا تھا۔ دونوں ساتھ ساتھ کیفے میں چائے کا کپ یا ملک شیک پیتے نظر آتے تھے۔ ساتھ ساتھ گاڑی میں مسکراتے جاتے تھے اور ساتھ ساتھ کلاس میں داخل ہوتے تھے۔

ان دونوں کا یہ ساتھ عقیقہ کے دل میں جلن اور توہین کے جذبات پیدا کر دیتا تھا۔ وہ اندر سے ٹوٹتی تھی، تڑپتی تھی۔ اس نے شائل کی توجہ حاصل کرنے کے لئے ہزار طرح

کے طریقے آزمائے تھے۔ پہلے اس نے میم ماہا ہی کی طرح ہلکے رنگ پہننے شروع کئے، شیفون کے لہراتے دوپٹے اپنے کاٹن کے کپڑوں کے ساتھ پہننے شروع کئے۔ اور پھر کچھ ہی دنوں بعد اس نے اپنی دراز زلفیں کٹوا کے انہیں ماہا کے جیسا اسٹائل دے دیا۔ انہیں ماہا ہی کی طرح ہلکے گولڈن رنگ کا اسٹریک دے دیا۔ گو کہ وہ اس اسٹائل میں بھی اچھی لگ رہی تھی لیکن اس کے اصلی لمبے بالوں کا نعم البدل نہیں تھا یہ اسٹائل۔ گولڈن فریم والا زیرو پاور کا چشمہ بھی چڑھا لیا تھا اور آج شائل کو کلاس کے کاریڈور کے پاس اکیلے کھڑے پایا تو اس کے پاس آ گئی۔

”کیسے ہو شائل؟“

”ہوں........ میں ٹھیک ہوں........ تم کیسی ہو؟........ بدلی بدلی سی لگ رہی ہو۔“

انداز دوستی والا مگر ہمیشہ کی طرح تکلفانہ تھا۔

”ہاں........ بس، یونہی ہیئر کٹ کروایا ہے۔ کیسا لگ رہا ہے؟“ وہ مسکرائی۔

”ٹھیک لگ رہا ہے۔ لیکن تم اپنے اصلی کٹ میں بہتر لگتی تھیں۔“ وہ صاف گو تھا۔

”تو کیا تمہیں یہ پسند نہیں آیا؟“

”میں نے ایسا تو نہیں کہا۔“

”میم ماہا کا بھی تو اسی طرح کا اور یہی ہیئر اسٹائل ہے۔ تم ان کی تو بہت تعریف کرتے ہو۔“ لہجے میں اک چھپی ہوئی کاٹ تھی۔

”دیکھو عقیقہ! ہر انسان کی اپنی شخصیت، بناوٹ اور شناخت ہوتی ہے۔ کوئی بھی دوسرا انسان اسے چرا نہیں سکتا۔ تم جیسی تھیں، بہت اچھی تھیں۔ تمہیں میم ماہا کی نقل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“

بہت لاپرواہی اور اجنبیت سے کہتا وہ کلاس روم کی طرف بڑھ گیا تھا اور اس کے لہجے کے پتھر سے زخمی ہوتی وہ حساس لڑکی دیر تک اُداس رہی تھی۔



اسے لاہور والے گھر میں پہنچے کچھ ہی گھنٹے ہوئے تھے۔ وہ لاہور والے بنگلے کی تزئین و آرائش کو بھرپور طریقے سے انجوائے کر رہی تھی۔ یہ گھر بھی ”قصرِ زیب“ ہی کی طرح اعلیٰ ذوق کا ترجمان تھا۔ پورے گھر میں خوب صورت فرل والے پردے،

دبیز قالین بچھے تھے۔ پرانے لکڑی کے شوکیس میں اعلیٰ چینی اور شیشے کے برتن رکھے تھے۔ ڈائننگ ٹیبل اور صوفوں کو مٹی سے بچانے کے لئے سفید چادروں سے ڈھکا گیا تھا۔ جگہ جگہ بڑے بڑے جالے لگے تھے جو مکان میں مکین کی غیر موجودگی کے ترجمان تھے۔ وہ ابھی تمام کمروں کا جائزہ لے کر ایک کمرے میں اپنا سامان لے ہی آئی تھی کہ وارث انتہائی خوشی سے کمرے کے اندر داخل ہوئے۔

''مہر النساء! آپ کے بابا الیکشن جیت گئے ہیں۔'' وارث کے لہجے میں ایک عجیب سی خوشی در آئی تھی۔ مہر النساء بھی مسکرا دی۔

''واقعی وارث؟''

''مبارک ہو اپنے بابا کی جیت۔ ابھی ان کا فون آیا تھا مجھے۔''

''ان کا فون مجھے تو نہیں آیا۔ اپنی بیٹی کو؟'' لہجہ اُداس سا ہو گیا۔

''بہت مصروف تھے۔ آنے جانے، مبارک باد دینے والوں کا تانتا بندھا تھا۔ وقت کہاں تھا؟ مجھ سے بھی صرف ایک منٹ بات کی اور کہا کہ مہر النساء کو بتا دو۔ ایم این اے بن گئے ہیں آپ کے بابا۔ مستقبل کے منسٹر کی بیٹی ہیں آپ۔'' وارث کا لہجہ کھنک رہا تھا۔ مہرو بھی خوشی سے مسکرا دی۔

''اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے وارث! بابا کی بے انتہا خواہش تھی اس عہدے کی۔ اللہ نے پوری کر دی۔''

''ہاں........ اب آج کی رات یہاں ٹھہر کر صبح کی فلائٹ سے میں واپس کراچی جاؤں گا۔ بہت آنا جانا ہو گا لوگوں کا۔ اور پھر سردار صاحب بھی مصروف رہیں گے۔ کچھ فیکٹری کے کام بھی ہیں۔'' وارث نے اسی جوش و خروش سے کہا۔

''وارث!'' اس نے بہت آہستگی سے پکارا۔

''جی۔'' جواب بھی اسی دھیمے لہجے میں تھا۔

''آپ کچھ دن ٹھہر نہیں سکتے یہاں میرے ساتھ؟'' اس کی عجیب التجا پہ وارث ذرا سا حیران ہوئے۔

''پچھلے تین دنوں سے تو میں آپ کے ساتھ ہی ہوں۔ وہاں سارا کام رکا ہوا ہے۔ فیکٹری اور آفس کے میٹرز سنبھالنے والا کوئی نہیں ہے۔ میرا جانا بے حد ضروری

ہے۔'' وارث کے لہجے میں نرمی تھی، اپنائیت تھی۔

وہ کتنی دیر سے لفظ تلاش کر رہی تھی وارث سے کہنے کو۔ اس بارش والے پہلے اقرار کے بعد اقرار کا کوئی لمحہ اس کے ہاتھ نہیں آیا تھا۔ وہ لمحوں کے ٹمٹماتے جگنوؤں کے تعاقب میں تھی مگر وہ جگنو اپنی جھلک دکھاتے بھاگتے جاتے تھے۔

''وارث!'' اس بار آواز مزید آہستہ تھی۔

وارث نے جواب نہیں دیا۔

''بابا سے آپ بات کریں گے یا مجھے کرنی ہو گی؟'' عجیب سے سوال نے وارث کو مزید خاموش کر دیا۔ انہوں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ انہیں کبھی سردار صاحب سے ایسی بات کرنی ہو گی۔

''کون سی بات؟'' انہوں نے انجان بننے کی اداکاری کی۔

''ہماری شادی کے متعلق۔'' مہر النساء پُر اعتماد تھی۔ یقین آمیز لہجہ تھا اس کا۔

وارث لمحہ بھر خاموش رہے، پھر آہستگی سے ساتھ رکھے صوفے پر بیٹھ گئے۔

''کیا واقعی آپ کا فیصلہ اٹل ہے؟........ نا قابل تبدیل ہے؟'' مہرو حیرت سے وارث کی جانب دیکھتی رہی۔

''آپ کو ابھی تک یقین نہیں؟'' سوال کے جواب میں سوال تھا۔

''آپ جانتی ہیں کہ میں آپ سے عمر میں ایک نہیں، دو نہیں، دس نہیں، بیس سال بڑا ہوں۔'' ایک اور سوال آیا۔

''جی ہاں........ جانتی ہوں۔ جب میں قصرِ زیب میں پیدا ہوئی تھی تب آپ کی عمر غالباً بیس برس تھی۔'' لہجہ سنجیدہ تھا۔

''آپ یہ بھی جانتی ہیں کہ آپ کی والدہ کے انتقال کے بعد آپ کی پرورش میرے ہاتھوں میں ہوئی ہے۔''

''میں یہ جانتی ہوں کہ میں سات برس کی سمجھدار بچی تھی، جس وقت امی کا انتقال ہوا اور اس کے بعد میری پرورش پھپھو نے کی۔ آپ کا حصہ اتنا تھا کہ آپ میرے اور زین کے دوست رہے، ہمدرد اور غمگسار رہے۔ آپ میرے گارجین قطعاً نہیں تھے۔ آپ سے نکاح کی خواہش رکھنے کا جائز حق ہے مجھے۔'' اس کا لہجہ مزید پُر اعتماد ہو گیا۔

''آپ کو علم ہے کہ سردار صاحب انکار کر سکتے ہیں....... ان کے سامنے میں، ان کا سب سے قابل اعتماد انسان اپنی Credibility کھو سکتا ہوں۔ ان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچا سکتا ہوں۔'' وارث آنکھیں کارپٹ میں گاڑے بول رہے تھے۔

''اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ ان کے سب سے قابلِ اعتماد بندے ہیں تو آپ کو تو مزید یقین ہونا چاہئے کہ وہ اپنی اکلوتی اور پیاری بیٹی اپنے قابل اعتماد بندے کے ہی سپرد کریں گے۔''

''مہر النساء! میرے پوائنٹ آف ویو کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں افورڈ نہیں کر سکتا کہ سردار صاحب جیسے محسن کے اعتماد کو ٹھیس پہنچاؤں۔''

''اور مہر النساء جیسے اچھے دل کو توڑنا افورڈ کر سکتے ہیں؟'' وار پہ وار تھا اور وار بھی زوردار تھا۔

''آپ نے اس فیصلے کو کرتے ہوئے ایک بار بھی اپنے بابا کے متعلق سوچا ہے؟''

''اور کیا آپ نے ایک بار بھی میرے متعلق سوچا ہے؟'' مہر النساء پُرسکون تھی، مطمئن تھی، پُراعتماد تھی۔

''ہو سکتا ہے انہوں نے آپ کے لئے کوئی بہتر رشتہ تلاش کر رکھا ہو۔ دنیا وارث حسن خان پہ ختم تو نہیں ہوتی نا مہرو!''

''میری دنیا بہت چھوٹی ہے....... اور میں اس چھوٹی سی دنیا کو بڑھانا بھی نہیں چاہتی۔ ہوش سنبھالنے کے بعد میں نے اپنے ہر غم، ہر خوشی، ہر جیت، ہر ہار میں آپ ہی کو شامل پایا ہے وارث!....... میری چھوٹی سی دنیا کا محور و مرکز آپ ہی ہیں وارث! میری دنیا آپ سے ہی شروع ہوتی ہے اور آپ پر ہی ختم۔'' وہ وارث کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کے بولی۔

''وارث! ہر انسان کو زندگی اللہ تعالیٰ عطا کرتا ہے اور ایک ہی بار عطا کرتا ہے۔ راستے تو اس کی زندگی میں کئی آتے ہیں لیکن صحیح راستے کے تعین کا حق بھی خود اسی انسان کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ جیتی جاگتی حقیقتوں سے گھبرا کر ڈھونڈی ہوئی چیز ہوتی ہے فینٹسی۔ لیکن جسے سوچ سمجھ کر، اطمینان اور سکون سے ڈھونڈا جائے اس کا ذکر آگے ہوتا ہے Beyond Fantasy۔ اور وارث! آپ کو اپنانے کا فیصلہ میں نے سوچ سمجھ

کر کیا ہے۔ آئیڈیلزم اور فینٹسی پر مبنی نہیں ہے میرا فیصلہ۔ آپ یقین کریں۔ کیا آپ مجھے پسند نہیں کرتے وارث؟....... کیا آپ کی زندگی میں میرے لئے کوئی جگہ نہیں بن سکتی؟''

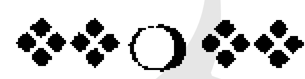
''ہمیشہ تنہا زندگی گزاری ہے میں نے....... کام، کام اور صرف کام۔ اپنے لئے سوچنے کی کبھی فرصت ہی نہیں ملی۔ آپ نے میرے متعلق سوچا، تب مجھے احساس ہوا کہ میرا بھی زندگی پہ کوئی حق ہے۔ تھوڑا سا ہی سہی، استحقاق ہے ضرور میرا۔ میں کوئی مشین نہیں جو صرف کام کرے۔ بٹن دبے اور وہ اپنا کام دکھانا شروع کرے۔ میں انسان ہوں۔ انسان جو کہ دیکھ سکتا ہے، سن سکتا ہے، اس وسیع دنیا میں سے خواب اکٹھے کر سکتا ہے۔ اپنی راہوں کو روشن بنا سکتا ہے۔ محبت کرنے کا پیدائشی حق رکھتا ہے۔ اس جذبے کی مکمل قوت رکھتا ہے۔ کسی ساتھی کو اپنا سکتا ہے، اس کے ساتھ زندگی گزار سکتا ہے۔ زندگی کے تمام رنگوں کا احساس آپ کے آنے کے بعد ہوا ہے مجھے مہرو! آپ نے....... صرف آپ نے مجھے زندگی کے رنگ و روپ دکھائے ہیں۔ آشنائی دی ہے۔'' وارث جو ہمیشہ خاموش رہتے تھے، ان کے منہ سے اظہار کے یہ روشن الفاظ سن کے مہرو بہت خوش ہوئی تھی۔

''تو کیا یہ تمام رنگ آپ میری اور اپنی آنکھوں سے چھیننا چاہیں گے؟'' وہ مسکرا کے بولی۔

''نہیں....... کبھی نہیں۔'' وہ بھی مسکرائے۔

''آپ بابا سے بات کریں گے؟''

''انشاء اللہ ضرور۔'' دل میں اک جگمگاتی اُمید زندہ ہوئی۔ مہرو نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ وارث نے اسے تھام لیا۔



چوہدری ساجد اپنی شکست پہ تلملا رہا تھا۔ بے حد، بے پناہ غصے میں کمرے کے کارپٹ پہ چکر کاٹ رہا تھا۔ ساتھ منہ سے گالیاں بھی نکل رہی تھیں سردار واجد کے لئے۔

''ہمیشہ....... ہمیشہ تُو نے مجھے ہرایا ہے واجد!....... کلاس میں ٹاپ پوزیشن تیری

آتی، تقریری مقابلے میں تجھ سے زیادہ محنت میں کرتا اور جیت تُو جاتا....... زیب علی پہ میرا بھی دل آیا، حالانکہ میں تجھ سے زیادہ خوبرو اور امیر تھا لیکن اس نے مجھے ٹھکرایا اور تجھ سے شادی کر لی۔ گارمنٹس فیکٹری اور فلور مل کی نیلامی میں مجھے شکست دینے کے لئے تُو نے مجھ سے زیادہ رقم دے کر انہیں خرید لیا اور اب یہ الیکشن کی ہار....... میں تجھے چھوڑوں گا نہیں سردار! میں تجھے نہیں چھوڑوں گا۔'' غصے میں بڑبڑاتا چوہدری صوفے پر بیٹھ گیا اور ٹیبل پہ رکھے گلاس میں شیشے کی بوتل سے امپورٹڈ برانڈی انڈیلی۔

''تباہ و برباد کر دوں گا میں تجھے سردار!....... تیری نسل کو ختم کر دوں گا....... چھوڑوں گا نہیں میں تجھے۔'' وہ برانڈی کا گلاس پہ گلاس پینے لگا۔

''تُو نے مجھ سے زیب چھینی۔ تُو نے مجھ سے فلور مل اور فیکٹری چھینی۔ تُو نے مجھ سے منسٹری کی سیٹ چھینی۔ میں تجھے نہیں چھوڑوں گا۔ نیست و نابود کر دوں گا تیرے گھر کو۔ تیرے مرنے پہ کوئی تیری فاتحہ پڑھنے والا بھی نہ ہو گا....... تیری لاش پہ کوئی تیری شکل دیکھنے والا بھی نہ ہو گا۔'' بڑبڑاتے ہوئے وہ مدہوشی کے عالم میں چلا گیا اور کرسٹل کے ٹیبل پہ گلاس کو زور سے دے مارا۔



آج ہر ہفتے کی طرح پاگل خانے میں چیک اپ کا دن آیا تھا اور تمام پاگلوں کو جنرل اور پرائیویٹ وارڈ سے نکال کے گراؤنڈ میں چھوڑ دیا گیا تھا۔ ہر پاگل کی الگ الگ نفسیات تھی۔ ہر کسی کا اپنا اپنا مزاج تھا۔ کسی کو اپنے کھوئے ہوئے بیٹے کے غم نے پاگل بنا دیا تھا تو کوئی عورت اپنی شادی ٹوٹنے پہ پاگل ہوگئی تھی۔ کئی تو ایسی تھیں جن کے پاگل ہونے کی کوئی وجہ بھی معلوم نہ تھی۔ کم و بیش تمام عورتیں بے حد ذہین اور پڑھی لکھی تھیں۔

ایک پاگل عورت اپنے پاگل پن سے قبل بائیولوجی کی پروفیسر تھی۔ اسے انسانی جسم اور اس سے متعلق تمام اعضاء کی معلومات تھی۔ اکثر دیواروں پر ری پروڈکٹو سسٹم یا پھر ڈائجیسٹو سسٹم کے ڈائیگرام بناتی تھی۔

دوسری عورت نے ہوم اکنامکس میں تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ پاگل خانے کے ہر وارڈ میں پھول پتے توڑ کے سجاتی تھی۔ بستروں پہ بچھی چادریں درست کرتی۔ ہر جگہ

اپنے دوپٹے سے جھاڑو مارنے بیٹھ جاتی۔

ایک عورت شاید پاگل پن سے قبل کسی فوجی افسر کی بیوی تھی اور فوجی کالونی میں تمام عمر گزاری تھی۔ وہ اکثر ڈاکٹروں اور وارڈ بوائز کو ڈانٹا کرتی تھی۔

''تم کو تمیز نہیں؟....... تم جانتے نہیں ہو میں کون ہوں....... میں مسز کرنل حفیظ ہوں۔ بوس ہے وہ تم سب کا....... کھڑے کھڑے چھٹی کرا سکتی ہوں میں تمہاری۔ جلدی سے یہ ڈرپ ختم کرو، مجھے بیٹ مین سے کھانا بنوانا ہے۔ بچوں کو اسکول سے لانا ہے اور لانڈری میں کپڑے بھی بھیجنے ہیں۔ شام کو میس میں ڈنر بھی اٹینڈ کرنا ہے۔''

وہ اکثر اپنی روٹین اس طرح بتایا کرتی۔

ایک عورت جو بہت چھوٹی عمر سے پاگل تھی اور آج تک خود کو آٹھ نو سال کا سمجھتی تھی اور باقی تمام عورتوں کو آنٹی یا بڑی بی کہا کرتی تھی۔ اکثر پاگل اشتعال میں آ کے ایک دوسرے کو مارا کرتے۔ پھر کبھی موڈ میں آ کے باتیں شیئر کرتے یا پھر پیار کرتے۔ سب کے ذہن و دل کی ایک محدود دنیا تھی جس کا جیتی جاگتی دنیا سے کوئی تعلق نہ تھا۔

کون سی ایسی طاقت ہوتی ہے جو اچھے خاصے سمجھدار انسانوں سے ان کے ہوش و حواس چھین کے انہیں بیگانگی عطا کرتی ہے۔ اپنے پرائے، اچھے برے، صحیح غلط کی تمیز مٹ جاتی ہے ان کے اندر سے؟

ان کے جسم تو پاگل خانے کی چار دیواری میں محدود ہوتے ہیں لیکن ان کے ذہن و دل اپنی من پسند دنیا میں ہوتے ہیں۔ ایسی دنیا میں جہاں وہ رہنا چاہتے ہیں۔ جہاں وہ تنہا نہیں، اپنے من چاہے لوگوں کے بیچ ہوتے ہیں۔

بیگانگی بھی ان پاگلوں کے اوپر روحانیت کے بے پناہ دروازے وا کرتی ہے۔ ہوش وخرد اور سمجھداری شاید کسی کو اپنی ذات سے اس قدر آگہی نہیں دیتی جتنا کہ پاگل پن کے عالم میں انسان اپنے اندر کے انسان کو پہچانتا ہے۔

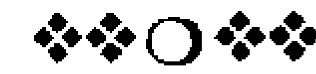
ان تمام پاگلوں کے درمیان وہ خاموش سی ایک کونے میں بیٹھی تھی۔ بڑی بڑی، اُداس اور مرجھائی آنکھوں سے وہ اردگرد ناچتے، گاتے عجیب و غریب حرکتیں کرتے ان پاگلوں کو دیکھ رہی تھی، درخت سے ٹیک لگائے۔ وہ خود بھی تو انہی میں سے ایک تھی۔ خود کو انہی میں سے ایک سمجھتی تھی۔ یہ اور بات تھی کہ حقیقتاً وہ ان کی طرح پاگل نہ تھی۔

ان کی طرح ہوش کی دنیا سے بیگانہ نہ تھی۔

گئے دنوں کی یادیں، اچھی یادیں، بری یادیں اس کے ذہن میں ایک جالہ سا بُن رہی تھیں۔ کچھ آوازیں، کچھ تصویریں، کچھ ڈھندلے ڈھندلے چہرے، کچھ عکس، اس کی زندگی کی کہانی کے کچھ کردار، کچھ گیت، کچھ پل۔

وہ تنہا ہوتے ہوئے بھی تنہا نہ تھی۔ آوازوں کا ایک میلہ سا تھا اس کے اندر۔ لوگوں کی زندگی کی جڑیں ان کے مستقبل میں ہوتی ہیں اور اس پگلی کی زندگی تمام کی تمام ماضی میں۔ جو ماضی کے دروازوں کے اندر مقید ہوں، نہ نکلنا چاہتے ہوں، نہ نکل سکتے ہوں، ایسے لوگوں کا کیا؟........ وہ ہولے ہولے اپنی میٹھی آواز میں کچھ گنگنا رہی تھی۔ کئی نظموں، غزلوں اور ماہیوں کی سطریں آگے پیچھے ملا رہی تھی۔

''عشق دی منزل اوکھی اے
کتھے سوکھی دیکھ نہ بھُل پوویں
سو کوہاں دے پینڈے ہن
کتھے پا پیادہ ناں جل پوویں
پردیسی نال ناں لاؤ یاری
بھلے ہو لکھ سونے دا ہووے
پر اِک گلوں پردیسی چنگا
جدوں یاد کرے تاں رووے''



''ہم نے تمہیں یہاں ایک خاص مقصد کے لئے بلایا ہے سلمان!'' چوہدری ساجد نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے اپنے لاڈلے فرزند سے کہا۔

''جی کہیے ڈیڈی!''

''ہم نے تمہاری شادی کا فیصلہ کر لیا ہے۔'' چوہدری نے جتنے اطمینان سے کہا، سلمان اتنے ہی شاک سے باپ کو دیکھنے لگا۔

''کیا؟........ میری شادی؟........ مگر کیوں؟''

''ضروری ہے بیٹے!........ ضروری ہے۔ شادی، بچے، طلاق، زر، زمین، جائیداد

ان تمام چیزوں کا حصول کبھی کبھی ضرورت بن جاتا ہے۔ تمہاری شادی بھی فی الوقت ہماری ضرورت بن گئی ہے۔'' چوہدری کا لہجہ مکار سا تھا۔

''تو آپ کر لیں ڈیڈی! اگر آپ کو ضرورت ہے تو مجھے گلے میں ڈھول ڈالنے کا کوئی شوق نہیں۔'' وہ انتہائی لاپرواہی سے بولا۔

''ہم جس سے تمہاری شادی کروانے جا رہے ہیں، قیامت کی چیز ہے۔ ہمیں علم ہے کہ تم نے سولڑکیوں کو دیکھا، چاہا اور چکھا ہوگا۔ لیکن ایسی فتنہ چیز تمہیں آج تک نہیں ملی ہوگی۔''

''ریئلی ڈیڈ؟........ کون ہے وہ لڑکی؟'' اب سلمان کو ذرا سی دلچسپی ہوئی۔

''مہر النساء سردار........ سردار واجد کی اکلوتی بیٹی۔ اس کی انڈسٹریز، اس کے شیئرز اور اس کی جائیداد کی آدھی حصہ دار۔'' چوہدری ساجد کی آنکھوں میں عیاری، چالاکی اور شیطانی چمک تھی۔

''واٹ؟........ لیکن یہ کیسے ممکن ہے ڈیڈی؟........ سردار واجد کی اور آپ کی سیاسی مخالفت ہے، ذاتی دشمنی ہے۔ وہ اپنی بیٹی مجھے کیسے دے سکتے ہیں؟''

''ناممکن کو ممکن بنانا میرا کام ہے........ تو بولو، تیار ہو کہ نہیں؟''

''اس سے مجھے کیا فائدہ ہوگا؟'' سلمان نے پوچھا۔

''تم میرے دشمن کی بیٹی گھر لے آؤ گے۔ اپنے دشمن کی جڑیں کاٹنے کی ابتداء میں کروں گا۔ اس کی فیکٹری، شیئرز اور جائیداد اپنے قبضے میں کروں گا۔ بیٹی کے بعد اس کا اکلوتا بیٹا زین مجھے اپنے بس میں کرنا ہے۔ لمحہ لمحہ رُلاؤں گا سردار واجد کو، تڑپاؤں گا اُسے۔ زندگی بھر کی اپنی شکست پہ خاموش نہیں بیٹھوں گا میں۔ اسی کا تھوکا ہوا چٹواؤں گا اُسے۔''

''اپنے ان ارادوں کے لئے آپ مجھے کیوں مُہرہ بنانا چاہتے ہیں؟ آپ کا بڑا بیٹا بھی تو ہے۔ میرا لائف اسٹائل آپ کو پتہ ہے۔ گھر بسانا، کسی عورت کا ہو جانا میرے لئے ممکن نہیں۔'' سلمان بہت صفائی سے بولا۔

''یہی تو ہم چاہتے ہیں کہ تم گھر نہ بساؤ۔ سردار کی اکلوتی بیٹی کو لمحہ لمحہ اذیت میں رکھو۔ اس کے سامنے دوسری عورتوں سے ملو، اس کی بیٹی کی آنکھ سے پانی بہے اور سردار

کی آنکھ سے خون۔ بڑے بیٹے میں وہ کچھ نہیں جو تم میں ہے۔ تبھی یہ سب میرے لئے کر سکتے ہو۔ وہ نہیں کر سکتا۔'' بولو! منظور ہے یہ سودا؟''

''اگر اس سودے میں میرا کوئی نقصان نہیں تو یہ سودا کیا جا سکتا ہے۔ اور یوں بھی آپ نے میرا تجسس بڑھا دیا ہے۔ میں اس فتنے کو اپنے گھر میں لانا چاہ رہا ہوں۔''



اُس نے آج پوری کوٹھی کی خوب دل لگا کر صفائی کی۔ ساتھ میں کام کرنے والی کو بھی شامل کیا اور اپنے گھر ہی کی طرح جت گئی۔ جالے اتارے، صوفوں کو ترتیب سے رکھوایا، شیشے کی ٹیبل اور کھڑکیوں کو کاغذ کی مدد سے صاف کیا، ڈیکوریشن پیسز ترتیب سے لگائے۔ کچھ بلب اور ٹیوبیں خراب تھیں، ان کو بدلوایا اور کھانا بنایا۔ گھر پہ صرف چار افراد ہی تھے۔ گیٹ پہ کھڑا گارڈ، کام والی، وارث اور وہ خود۔ لہٰذا چار افراد کے لئے مختصر کھانا ہی بنایا اور پھر وارث کے لوٹنے کا انتظار کرتی رہی۔ کشادہ سی بالکنی میں کھڑی وہ وارث کے متعلق ہی سوچ رہی تھی کہ جب گاڑی کے ہارن پہ گارڈ نے گیٹ کھولا اور وارث گاڑی اندر لے آئے۔ گاڑی سے اُترے۔ بے اختیار ہی ان کی نظر اوپر کھڑی مہرو پر پڑی۔ ان کے دل میں ایک خوبصورت سا احساس پیدا ہوا۔ وہ مسکرا دیئے اور صدر دروازے سے اندر کی جانب آنے لگے۔ کچھ ہی لمحوں بعد وہ اوپر بالکنی میں مہر النساء کے عین سامنے تھے۔ مہرو کے چہرے پر انہیں دیکھ کے ایک خاص چمک سی آ گئی۔

''آپ یہاں کھڑی کس کا انتظار کر رہی تھیں؟'' سلام جواب کے فوراً بعد وارث نے سوال کیا۔

''چاند کا...... بہت دیر سے منتظر تھی اس کی۔ بڑی دیر بعد نظر آیا ہے مجھے۔'' اس نے مسکرا کے ذومعنی بات کی۔ وارث نے بھی آسمان کے ایک کونے میں اٹکے چاند کو دیکھا۔

''بڑی دوستی ہے چاند کے ساتھ؟'' سوال میں ایک لطیف سا طنز تھا۔

''ابھی تو نئی نئی دوستی ہوئی ہے۔ شروعات ہے آشنائی کی۔ ہر احساس نیا نیا سا ہے...... انجانا انجانا سا...... مبہم مبہم سا...... ابھی تو یہ تعلق اور آگے بڑھے گا۔ ابھی

تو صرف میں نے چاند کو اور چاند نے مجھے دیکھنا شروع کیا ہے۔ ابھی تو باتوں کا، ملاقاتوں کا، دکھ درد کے بانٹنے کا، ساتھ ساتھ رہنے کا، ہجر میں انتظار کا جو تعلق بڑھے گا تو آسمان اور زمین دونوں حیران رہ جائیں گے چاند اور میرے بیچ کے رشتے پر۔''

مہرو کے لہجے میں ایک نیا پن سا محسوس کیا وارث نے۔ وہ نیا پن جو محبت دان کرتی ہے انسان کو۔

''اس کا مطلب آپ کے اور چاند کے بیچ میں آ کے غلطی کی ہے میں نے۔ میری Entry شاید چاند بھائی کو گراں گزری ہو گی۔'' وارث نے اسے چھیڑا۔

''ارے نہیں نہیں۔ یہ تو اس چاند کو بھی پتہ ہے کہ آپ کا اور میرا رشتہ بہت پرانا ہے۔ اس کے علاوہ اور رشتے بھی تو نبھانے ہیں نا میں نے۔'' وہ معصومیت سے بولی۔

''اوہو......'' وارث مسکرائے۔

''آپ کے لئے کچھ لایا تھا میں۔'' وارث نے ایک لفافہ اس کی جانب بڑھایا۔

''کیا ہے یہ؟'' اس نے مسکرا کے پوچھا۔

''وارث نے لفافہ کھولا تو خوشبو سی ہر جانب بکھر گئی۔ وہ تازہ گلاب اور چنبیلی کے پھولوں کے بھیگے بھیگے گجرے تھے۔ انہیں دیکھ کر مہرو کے چہرے پر حیرت، خوشی، محبت اور احسان مندی کے جذبات سے اُمڈ آئے۔ آنکھوں میں نمی کی ہلکی سی جھلملاہٹ بھی ٹھہر گئی۔ ہوا کا اِک الہڑ سا جھونکا اُڑا اور اس کی لمبی زلفوں کو اس کے چہرے پہ بکھرا گیا۔ اس نے گردن جھٹک کے بال چہرے سے ہٹائے اور پھر وارث اور وہ ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگے۔ مہرو نے خاموشی سے اپنی دونوں کلائیاں آگے کر دیں۔ وارث نے آہستگی سے گجرے کھولے اور باری باری اس کے دونوں ہاتھوں میں پہنا دیئے۔ وارث کے ہاتھوں کا لمس اور گجروں کا بھیگا بھیگا پن۔ اُجلی شفاف کنواری کلائیوں پہ جادو سا بکھیر گیا۔

کتنا نشہ، کتنا سرور تھا اس لمس میں۔
کتنی تازگی تھی اس احساس میں۔
کتنی مہک تھی ان پھولوں میں۔

مہرو نے آج تک کسی پھول میں ایسی مہک محسوس نہیں کی تھی۔ آج تک ایسا سرور،

ایسا احساس محسوس نہیں کیا تھا۔ کیا اس قدر جدت بھر دیتی ہے محبت سانسوں کے اندر؟ روح کے اندر؟ دل کے اندر؟ جذبات کے اندر؟

کیا ہو گیا تھا وارث اور مہرو کو؟........وہ دنیا کو فراموش کر کے ایک دوسرے کے ہو گئے تھے۔ سارے جہاں کو بھول بیٹھے تھے۔ کیسے، کیونکر مہرو کے گجروں والے دونوں ہاتھ وارث کے ہاتھ میں تھے اور مہرو کا نیا دوست چاند آسمان پہ کھڑا دونوں کی نئی نویلی محبت کے راز میں شریک ہو رہا تھا۔

کسی خواب سے فروزاں کسی یاد میں سمٹ کر
کسی حُسن سے درخشاں، کسی نام سے لپٹ کر
وہ جو منزلیں طلب کی میرے راستوں میں آئیں
وہ جو لذتیں وفا کی میرے شوق نے اٹھائیں
انہیں اب میں جمع کر کے کبھی دھیان میں جو لاؤں
تو ہجومِ رنگ و بو میں کوئی راستہ نہ پاؤں
کہیں خواہشوں کی جھلمل، کہیں خوشبوؤں کے ریلے
کہیں تتلیوں کی جگمگ، کہیں جگنوؤں کے میلے
یہی دلفریب منظر کہیں ٹھہرتا نہیں ہے
یہی چند ثانیے ہیں میری ہر خوشی کا حاصل
انہیں کس طرح سمیٹوں کہ سے کا تیز دھارا
سرِ موجِ زندگانی ہے فنا کا استعارہ
نہ کھلے گرہ بھنور کی، نہ ملے نشانِ ساحل
تیرا کیا بنے گا اے دل!
تیرا کیا بنے گا اے دل!



اپنی بہن کی شادی کا پہلا کارڈ شائل، ماہا کے پاس لایا تھا اور ماہا کو بے انتہا خوشی ہوئی تھی۔

''یہ تو بہت خوشی کی بات ہے شائل! تمہاری بڑی بہن کی شادی ہو رہی ہے۔'' ماہا نے کہا۔

''جی میم ماہا! آپی کی شادی میرے اوپر بہت بڑی ذمہ داری تھی۔ یوں تو ان کی منگنی آٹھ نو سال پرانی ہے مگر ابو کی ڈیتھ کے بعد شادی بہتر طریقے سے کرنے کا میرا وعدہ تھا راحیلہ آپی سے۔ کوشش تو کی ہے کہ ان سے کئے اپنے وعدے کو بہتر طور پر نبھا سکوں۔'' شائل کے چہرے پر بزرگانہ قسم کے تاثرات اُبھر آئے۔

''ہوں........تو تیئس برس کا شائل اپنی چھ برس بڑی بہن کا بڑا بھائی بن کے اس کی شادی کرا رہا ہے۔ بہت اچھے بھئی۔ بہت اچھے۔ میری مدد کی کوئی ضرورت ہو تو کہتے ہوئے شرمانا نہیں۔''

''شرمانا ہوتا تو آپ کے پاس آتا ہی کیوں؟ مجھے واقعی آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔''

''ضرور، ضرور........بولو کیا چاہئے؟''

''آپ کا ساتھ اور آپ کا وقت چاہئے۔'' وہ ماہا کی آنکھوں میں جھانک کے بولا۔

''کیا مطلب؟''

''میرا مطلب ہے کہ کچھ شاپنگ باقی رہتی ہے جو آپ نے مجھے کروانی ہے۔ دُلہن کے لئے جو روایتی چیزیں خریدی اور بنائی جاتی ہیں، انہیں بنانے میں آپ نے میری مدد کرنی ہے۔ امی شدید بیماری کا شکار ہیں اور گھر میں بڑا کوئی ہے نہیں۔ لہٰذا آپ

نے ہمارے گھر کی بڑی کے فرائض انجام دینے ہیں۔'' شمائل نے کہا۔

''شمائل! یہ میرے لئے بہت بڑی ذمہ داری ہو گی۔ بہت بڑا ٹاسک ہو گا۔'' وہ گھبرا کے بولی۔

''اور مجھے یقین ہے کہ اس ذمہ داری کو آپ بخوبی انجام دیں گی۔'' وہ پُر اعتماد تھا۔ ''اور آپ نے ہر فنکشن اٹینڈ کرنا ہے۔ بہت مزہ آئے گا آپ کو ہماری فیملی سے مل کے۔ بہت جلدی گھل مل جانے والے لوگ ہیں ہم لوگ۔''

''اس کا اندازہ تو مجھے تم سے مل کر ہو گیا ہے۔ شاپنگ وغیرہ میں تو میں تمہاری تمام مدد کر سکتی ہوں لیکن اتنی دور جا کے شادی کے تمام فنکشن اٹینڈ کرنا شاید ممکن نہ ہو۔'' وہ معذرت خواہانہ لہجے میں بولی۔

''دیٹس ناٹ فیئر میم! میں نے شادی کا پہلا کارڈ جسے دیا ہے اگر وہ ہی آنے سے انکار کر دے تو پھر شادی میں کوئی نہیں آئے گا۔'' شمائل نے معصوم سی شکل بنا کے کہا۔

ماہا ہنس دی۔

''یہ کیسی تھیوری ہے؟'' وہ بولی۔

''بس تھیوری ہے یا پریکٹیکل، یہ اصول ہے کہ جس کو پہلا کارڈ دیا ہے، اس نے ہر صورت میں آنا ہے اور بس۔'' اس نے حتمی طور پہ کہا اور ماہا کھلکھلا دی۔



''میں ایڈووکیٹ شہرین علی ہوں۔ مجھے اس بالی نامی عورت سے ملنا ہے۔'' شہرین نے انچارج خاتون سے اپنا تعارف کروایا۔

''جی، میں آپ کو جانتی ہوں۔ بیٹھئے۔'' خاتون نے اپنے سامنے رکھی کرسیوں کی طرف اشارہ کیا۔ شہرین بیٹھ گئی۔

''کیسی ہیں آپ شہرین؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ کیسی ہیں مس......''

''رومانہ۔ رومانہ طارق۔'' خاتون نے اپنا تعارف کروایا۔

''جی مس رومانہ! میں بالی کی وکیل ہوں۔ اس سے پہلے بھی دو بار ملنے کے لئے آ چکی ہوں۔ آج اس کے وارڈ کے باہر اسٹاف نے مجھے اندر جانے سے روک دیا اور کہا

کہ اس سے کسی کا ملنا خطرے سے خالی نہیں۔ وہ اپنے Senses میں نہیں۔ اس لئے آپ کے پاس آئی ہوں۔'' شہرین نے وضاحت کی۔

رومانہ مسکرا دی۔

''آپ کیا لیں گی، ٹھنڈا یا چائے کافی؟''

''نہیں، شکریہ۔ مجھے اپنی کلائنٹ سے ملنا ہے اور واپس جانا ہے۔ باہر میری گاڑی میرا انتظار کر رہی ہے۔'' شہرین نے کہا۔

رومانہ نے انٹرکام اٹھا کے ٹھنڈا لانے کا آرڈر دیا اور دوبارہ اسی طرح کی سادہ مسکراہٹ چہرے پہ سجا کے بولی۔

''آپ کو صحیح اطلاع دی گئی ہے کہ بالی اپنے Senses میں نہیں ہے۔ پچھلے تین دن میں اسے دو بار دورے پڑ چکے ہیں۔ اسے بستر سے باندھ دیا گیا ہے لیکن وہ پھر بھی اپنا سر بیڈ کے سنگلاخ لوہے سے ٹکراتی ہے اور زخمی ہو جاتی ہے۔ وہ کسی کو بھی نقصان پہنچا سکتی ہے۔'' رومانہ نے کہا۔

''نقصان پہنچا سکتی ہے؟...... ایکسکیوزمی مس رومانہ طارق! کیا پچھلے سولہ سال سے اس نے کسی کو نقصان پہنچایا ہے؟''

''مجھے یہاں کام کرتے ہوئے تقریباً چھ برس ہو گئے ہیں اور ان چھ برسوں میں پہلی بار اس نے ایسا کیا ہے۔'' رومانہ نے جواب دیا۔

''اور آپ اپنے آنے سے دس برس پہلے کا ریکارڈ بھی بے شک چیک کر لیں۔ اس نے پاگل پن والی کوئی حرکت نہیں کی۔ کیونکہ وہ پاگل نہیں ہے۔ نجانے اسے کس نے پاگل خانے میں داخل کروایا اور کس بناء پہ کروایا؟ اور اسے بستر سے باندھے رکھنا اس کے ساتھ غیر انسانی سلوک ہو گا۔'' شہرین نے غصے سے کہا۔

''یہاں پہ موجود ہر پاگل کے مشتعل ہونے پہ اسے بستر سے باندھا جاتا ہے یا پھر پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی جاتی ہیں تا کہ وہ نقصان نہ پہنچائے۔'' رومانہ کے لہجے میں بھی سختی تھی۔

''وہ عورت پاگل نہیں ہے مس رومانہ! میرے پاس اس کی تازہ ترین ٹیسٹ رپورٹس ہیں۔ اس کا ذہنی توازن بالکل درست ہے۔'' شہرین نے اپنے پرس میں سے

رپورٹس نکال کر رومانہ کو دیں۔

"کیا......؟" رومانہ حیرانی سے رپورٹس دیکھنے لگی۔ کچھ دیر دونوں کے درمیان خاموشی رہی۔ ٹیبل پہ رکھے کولڈ ڈرنکس کے اندر گیس کے بلبلے بنتے اور گھلتے رہے۔

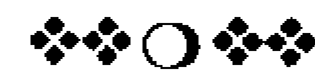
"میں اُسے اس عمارت سے باہر لے جانا چاہتی ہوں۔" اب کے شہرین نے بہت آہستگی سے کہا۔

"لیکن یہ کیسے ممکن ہے؟ اس کا کوئی رشتہ دار، کوئی جاننے والا نہیں اور آپ......"

"رشتہ دار عزیز نہیں ہیں لیکن میں بحیثیت ایک وکیل اور ایک انسان کے انہیں تحفظ دلوا سکتی ہوں۔ ان کے ساتھ غیر انسانی سلوک کئے بغیر، لیگل نوٹس اور پرمیشن پیپر میں بنوا کے آپ کو دے جاؤں گی اور دو دن تک میں اسے آ کے یہاں سے لے جاؤں گی۔ تب تک آپ برائے مہربانی اس کی زنجیریں کھلوا دیجئے۔" شہرین نے غصے سے کہتے ہوئے رپورٹس کے کاغذ بیگ میں ڈالے اور بیگ شانے پہ رکھتی اُٹھنے لگی۔

"میری بات تو سنئے وکیل صاحبہ!" رومانہ نے اسے روکنے کی کوشش کی۔

"پلیز مس رومانہ! جب تک میں اسے لے نہ جاؤں، آپ اس کا خیال رکھئے۔ وہ پاگل نہیں ہے۔ آپ اور میری طرح درست توازن رکھتی ہے۔ سوچنے سمجھنے کی قوت رکھتی ہے۔ اسے دوسرے پاگلوں کی طرح ٹریٹ مت کریں۔" شہرین روہانسے لہجے میں التجا کرتی وہاں سے چلی گئی۔ رومانہ دیر تک اسی طرح خاموش کھڑی رہی۔



وہ جو شب زاد تھے
دن کے مسلے ہوئے دائروں کی حدیں
کھینچتے کھینچتے شب تلک لے گئے
شام گم ہو گئی
شام نیلے پروں پر اُداسی کی شبنم سے
بھیگی ہوئی مورتی کی طرح
اپنے پیروں کی کالک پہ کڑھتی ہوئی
زرد ہوتی گئی

اور بکھرتی گئی
اور
گم ہو گئی

شام کے سہانے منظر زندہ دلوں کے اس شہر میں بنی عالیشان مگر بے روح کوٹھی میں اُترے تھے اور ہر طرف اُداسی سی چھا گئی تھی۔ نجانے کیوں مہرو کو اس گھر سے بے آباد کھنڈروں کی بو آتی تھی۔ موہنجوداڑو کی ٹوٹی پھوٹی دیواروں جیسی۔ یا پھر ٹیکسلا کی شاموں جیسی۔ یا پھر مصر کے پراسرار اہرامین کی ریت جیسی......صحرا کے بگولوں جیسی تو کبھی کچے گھروں کی مٹی جیسی۔

حالانکہ یہ گھر بناوٹ و تعمیر میں ہر زاویے میں منفرد تھا۔ جدید طرزِ تعمیر، اعلیٰ میٹریل، بہترین کنسٹرکشن۔ یہ اس کی مرحومہ ماں کی بہترین پسند کا اعجاز تھا یا پھر بابا جانی کی محبت اور Dedication کا عکاس، وہ نہیں جانتی تھی۔

عظیم الشان داخلی گیٹ۔ بنگلے کا داخلی حصہ بھی کسی محل نما بناوٹ پہ مشتمل تھا۔ اندر کار پورچ میں بیک وقت تین چار گاڑیاں با آسانی کھڑی کی جا سکتی تھیں۔ لکڑی کا منقش صدر دروازہ جس کے باہر ڈھیر سارے پودے ترتیب سے لگائے گئے تھے اور اوپر سے لچھے دار پھولوں کی بیل دروازے تک جھولتی تھی۔ سامنے بڑا سا لان جو نظر اندازی کے باعث مرجھا گیا تھا۔

اندر آتے ہی بہت بڑا اور کشادہ لاؤنج جہاں کا فرنیچر بھی قیمتی اور اعلیٰ تھا اور ہر کمرہ انتہائی نفاست سے سجا تھا۔ لیکن جو خاص بات مہرو نے اس گھر میں محسوس کی تھی، وہ تھیں کچھ پینٹنگز اور مجسمے۔ دائرے کی شکل میں اوپر جانے والے زینوں کے شروع ہونے سے قبل یونانی دیویوں سے ملتی جلتی شکل والی عورت کا مجسمہ تھا جس کے ہاتھ میں ایک ستار تھی۔ پینٹنگز میں بھی ساز اور موسیقی سے متعلق خیالات تھے۔

'شاید ممی کو موسیقی سے بھی دلچسپی تھی۔'

مہرو نے دل ہی دل میں سوچا تھا۔ گھر کے تمام کمرے اور حصے مہرو نے دیکھ لئے تھے سوائے ایک کمرے کے۔ جس کے اوپر ایک بڑا سا تالا جھول رہا تھا۔ اس تالے نے مہرو کے دل کے اندر کا تجسس گہرائی تک بڑھا دیا تھا۔ اس نے ملازمہ سے بھی

پوچھا مگر اس کے پاس تالے کی چابی نہ تھی۔ لہٰذا وقتی طور پر مہرو کو خاموش ہونا پڑا۔

یہ وہ گھر تھا جہاں اس کے بابا اور ماں نے اپنی شادی کے ابتدائی تین سال گزارے تھے۔ مہرو کی اپنی پیدائش بھی اسی گھر میں ہوئی تھی۔ گہری اور اٹوٹ محبت اور ملن کا امانت دار تھا یہ گھر۔ کتنے خوابوں کی تعبیروں کا رازدار تھا یہ گھر۔ خاموش کھنڈر سا یہ گھر اپنے اندر کتنے راز دفن کئے لگتا تھا۔ یوں لگتا تھا باتوں کا ایک جھنڈار بسا ہے اس گھر کے سینے میں۔ کئی راز دفن ہیں اس گھر کی وسیع دیواروں کے اندر۔

داخلی دروازے کے بعد لاؤنج تک آتی غلام گردش پہ جو غالیچے بچھے ہیں جن غالیچوں کی دبیز جسامت پہ پاؤں کی چاپ نہیں اُبھرتی، دراصل ان غالیچوں کی یادداشت میں کتنے پیروں کی چاپیں ہیں۔ مہندی لگے دُلہن کے پاؤں کی خوشبو ہے۔ ننھی منی مہر النساء کے شروع دنوں کے چلنے اور گرنے کے نشان ہیں۔ بادامی رنگ کی دیواروں پہ آویزاں خاموش تصویروں کے کردار دراصل اس قدر خاموش نہیں۔ یوں لگتا ہے کسی کی موجودگی کو محسوس کر کے وہ کردار واپس تصویروں میں ڈھل گئے ہوں۔ اور اس کے جاتے ہی تصویروں کے یہ تمام خاموش کردار دوبارہ زندہ ہو جائیں گے۔ ہل چلانے والے دوبارہ ہل چلائیں گے۔ کھیتوں کی پگڈنڈیوں پہ ہاتھوں اور سر کے اوپر گھڑے رکھی مٹیاروں کے دوپٹے لہرائیں گے اور ان کے قہقہے بکھریں گے۔ درخت کے نیچے میگھ ملہار گاتے تان سین کی پُرسوز آواز چار سُو بکھرے گی اور بارش برسا دے گی۔ کتھئی رنگ کی ساڑھی پہنے پاؤں میں گھنگھرو باندھے ناچتی لڑکی کے گھنگھروؤں کی آواز فضا میں اُبھرے گی اور چھن چھن کا شور مچے گا۔ گھر کے اندر سجے تمام کے تمام مجسمے اپنے ہاتھوں میں پکڑے ساز بجانے لگیں گے اور ہر سُو سازوں کی آواز بکھر جائے گی۔ ستار، سُر، طبلے، بانسری، فلیوٹ اور ہر طرح کی موسیقی چار سُو بکھرے گی۔

یہ گھر خاموش رہ کے بھی بولتا تھا۔ سو داستانیں سناتا تھا۔ کئی راز افشا کرتا تھا۔

مہرو نے بارہا محسوس کیا تھا، اس گھر میں بھٹکتی روحیں ہیں۔ یادوں کی، لمحوں کی، باتوں کی۔ جو اس گھر کو دلچسپ اور پراسرار بنا دیتی ہیں۔ کہیں سے پرانے قہقہے گونجتے ہیں تو کہیں سے چوڑیوں کی کھنک۔ کہیں سے گیت کے بول زندہ ہو پڑتے ہیں، کہیں سے سازوں کی آواز۔

یہ گھر بھی قصرِ زیب جیسا ہی تھا۔ لیکن قصرِ زیب سے زیادہ دلچسپ اور انوکھا تھا۔

مہرو کو افسوس ہوا کہ وہ آج سے قبل اس گھر میں کیوں نہیں آئی؟ آج بھی وہ اُداس ڈھلتی شام میں اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی رنگ بدلتے آسمان کی جانب دیکھ رہی تھی کہ دروازے پر دو انگلیوں سے دستک ہوئی۔ وہ دستک کی آواز پہچان گئی تھی۔ وہ وارث ہی کی دستک تھی۔

''آ جائیے وارث!''

اس کے جواب دیتے ہی وارث اندر آئے۔ وارث کے ہونٹوں پہ ایک نپی تلی مسکراہٹ تھی۔ مہرو ساتھ ہی رکھے نیلے رنگ کے مخملی صوفے پر بیٹھ گئی۔

''آپ کو کیسے علم ہوا کہ دروازے پر میں ہوں؟'' وارث نے سوال کیا۔

''برسوں پہلے سے جس دستک کو اپنے بہت قریب پایا ہے، اسے کیسے نہیں پہچان پاؤں گی؟ دکھ اور تنہائی کو اسی دو انگلیوں کی دستک نے ہی تو دور کیا ہے۔'' مہرو نے ہولے سے کہا۔

''امید ہے کہ آپ کو اس گھر میں مزہ آ رہا ہے۔ اگر نہیں تو آپ کی گاڑی باہر کھڑی ہے۔ آپ لاہور شہر کو انجوائے کر سکتی ہیں۔ باہر جا سکتی ہیں۔ یہ شہر بھی آپ کے اپنے شہر ہی کی طرح آپ کو اپنا لگے گا۔'' وارث کے لہجے میں تازگی تھی۔

''یقین کریں وارث! یہ گھر بھی ہمیں قصرِ زیب جیسا ہی لگ رہا ہے۔ اس گھر میں بھی وہی روح اور وہی خوشبو ہے جو ہمیں قصرِ زیب سے آتی ہے۔ یہ پردے، یہ غالیچے، یہ گلدان، یہ فرنیچر...... یوں لگتا ہے یہ گھر قصرِ زیب کا حصہ ہے۔ کسی وقت میں دونوں ایک تھے۔ پھر سمندر کی لہروں نے دونوں کو الگ الگ کر دیا اور ایک ہی طرح کے دو جزیرے بن گئے۔'' مہرو نے کہا۔

''یہ تو طے ہے مہرو! کہ باتوں میں آپ کا کوئی ثانی نہیں۔ چلیں، اب آپ تیار ہو جائیں، میں فورٹریس سے آپ کو اچھا سا کھانا کھلاتا ہوں۔ کل سے آپ اکیلی یہ شہر دیکھیں گی۔ صبح میری اسلام آباد کے لئے فلائٹ ہے۔'' وارث نے اطلاع دی۔

''جا رہے ہیں آپ وارث؟'' لمحہ بھر کو اس کے چہرے پر اُداسی سی در آئی۔

''جا رہا ہوں۔ لیکن اس میں اُداس اُداس، پھولی پھولی گپلو گپلو صورت بنانے کی

کوئی ضرورت نہیں۔ زین بابا سے مل کے کراچی جاؤں گا اور پندرہ بیس دن بعد آپ کو لینے آؤں گا۔'' وارث نے کہا اور وہ مسکرا دی۔

''بارات لے کر آئیں گے؟'' حملہ زوردار تھا۔

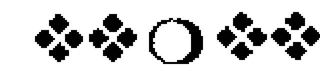
''شاید ایسا ہی ہو۔'' وارث پُر اعتماد تھے۔

''کیا ایسا ممکن ہے وارث؟'' لہجے میں ذرا سا دکھ بھی تھا۔

''آپ معجزوں پہ ایمان نہیں رکھتیں کیا؟'' وارث کے سوال میں ہی جواب تھا۔ مہرو مطمئن ہو گئی۔

''میں ابھی تیار ہو کے آتی ہوں۔ مجھے لاہور والوں کی طرح جم کے کھانا کھانا ہے آج۔ اور آپ نے بھی بالکل کنجوسی نہیں کرنی۔ سمجھے؟''

''بالکل کنجوسی نہیں کروں گا۔'' وارث نے ہنس کے کہا۔ مہرو سوٹ کیس سے کپڑے نکالنے لگی۔



فورٹریس کے شیزان ریسٹورنٹ سے مزیدار قسم کا کھانا کھانے کے بعد وہ دونوں دکانوں اور باقی ریسٹورنٹس کے باہر چہل قدمی کرنے لگے۔ فورٹریس کا یہ علاقہ جہاں کئی سارے چھوٹے بڑے ریسٹورنٹ اور کافی ہاؤس ہیں، لوگوں سے کھچا کھچ بھرے تھے۔ لاہوری کھانے میں اس قدر مصروف و مشغول تھے کہ انہیں کسی چیز کی پرواہ نہ تھی۔ بزنس میٹرز ڈسکس کرنے کے لئے آئے ہوئے افسران، روٹھی بیوی کو منانے آنے والا شوہر، رشتے کی بات پہ غور کرنے آنے والی سدھنیں، فیملی کا جھگڑا نمٹانے آنے والا بزرگ، بڑوں سے چھپ کے ڈیٹ مارنے والے نوجوان اپنا اصل مقصد بھلا کے کھانا کھانے میں مگن تھے اور ایسے مگن تھے کہ اصل مسئلہ بھول بیٹھے تھے۔ ہر جانب سے چمچوں، کانٹوں، پلیٹوں اور گلاسوں کی ایسی ٹھکا ٹھک کرتی آوازیں تھیں کہ باہر سے جنگ کا گمان ہوتا تھا۔ ریسٹورنٹ کے اندر نیا آنے والا سمجھتا تھا کہ شاید یہ تمام لوگ کسی قحط زدہ علاقے سے آئے ہیں اور عرصے بعد کھانا نصیب ہوا ہے۔

ہر طرف خوشبوئیں تھیں۔ سیخ کبابوں، نہاریوں، پایوں، بریانیوں، بجیوں، مکھن والے ساگ اور تکہ بوٹی کی۔ ڈٹ کے کھا لینے کے بعد کھوئے والی لسی اور ملک شیک

اور اتنی گرما گرم چیزوں کے درمیان جذبات کی گرمی ذرا سی ٹھنڈی پڑ جاتی تھی۔ بزنس میٹرز، شادی کے مسائل، مستقبل کے فیصلے، گھریلو جھگڑے لمحہ بھر کے لئے ہر کوئی سائیڈ پہ رکھ دیتا اور کہتا کھانا کھا لینے کے بعد سوچیں گے۔ آخر زندگی کھانے کے لئے کتنی کم ہے۔ اس قدر کھانے کے بعد ہی تو لاہوریوں میں انرجی آتی ہے۔ اس لئے وہ زندہ کہلاتے ہیں۔ اگر اتنی ہی رفتار و تعداد سے کراچی یا اور شہروں کے لوگ کھائیں تو شاید وہ بھی زندہ دل کہلائیں۔ اصل میں لاہور والوں کے دل کا راستہ معدے سے گزرتا ہے۔ یعنی دراصل وہ زندہ معدہ رکھتے ہیں اس لئے زندہ دل کہلاتے ہیں۔

''لاہور والے کہتے ہیں لاہور لاہور ہے۔ اور کراچی والے کہتے ہیں لاہور لہور ہے تو کراچی اس کا شوہر ہے۔''

لاہور والے کہتے ہیں۔ ''جنے لاہور نئیں ویکھیا او جمیا ای نئیں۔''

کراچی والے کہتے ہیں۔ ''جنے کراچی نئیں ویکھیا او ہنے جم کے گنوایا۔''

سیاسی اور سماجی Rift یوں تو دونوں شہروں کے بیچ ہیں لیکن دونوں شہروں کی اپنی اپنی زندگی اور طرزِ زندگی ہے اور دونوں کا اپنا چارم ہے۔

فورٹریس ہی میں کپڑوں کے کچھ ایسے بوتیک بھی تھے جہاں لکھا تھا، دو سوٹ خریدیں ایک مفت پائیں۔ چار خریدیں دو مفت پائیں۔ مہر النساء یہ پڑھ کے دیر تک ہنستی رہی۔

''بھئی یہ بزنس کا طریقہ ہے۔ ہنسنے کی کیا بات ہے؟'' وارث نے کہا۔

''اس طرح تو ان کی پوری دکان ایک ہی دن میں خالی ہو سکتی ہے۔'' وہ ہنستے ہنستے بولی۔

''اور جتنے پیسے اس طرح وہ ان لوگوں سے بٹوریں گے اس سے اگلے دن دوبارہ دکان بھر سکتی ہے۔'' وارث بھی مسکرائے۔

''وارث! کل آپ زین سے ملیں گے نا؟'' مہر النساء نے پوچھا۔

وارث نے جواب میں گردن اثبات میں ہلائی۔

''میں اس کے لئے کوئی تحفہ بھیجنا چاہتی ہوں۔'' مہر النساء کے لہجے میں اک اداسی سی در آئی۔

''زین سے میں کبھی الگ نہیں رہی۔ اس لئے الگ ہونے کے بعد بہت مشکل ہو گیا ہے رہنا۔ اس کے ننھے سے وجود نے مجھے کس طرح بھر رکھا تھا۔ اس کی شرارتیں، اس کی باتیں، اس کی ضرورتیں کس قدر اہم تھیں میرے لئے۔ اور اب اس کے جانے کے بعد کتنا غیر اہم ہے سب کچھ۔ غیر اہم تو میں بھی ہوں زین اور بابا کے لئے۔'' وہ اُداسی سے بولی۔

''ایسی بات نہیں ہے مہرو! زین ابھی بچہ ہے اور سردار صاحب بہت مصروف۔'' وارث نے سمجھایا۔

''ایک بچہ ہے اور دوسرا بہت بڑا اور ان کے درمیان میں ہوں۔ میں جو کہ نہ بچی ہے اور نہ بڑی۔ جسے آج تک نہ بچہ تسلیم کیا گیا اور نہ بڑا۔ اگنور ہوئی تو میری ذات ہوئی۔ کسی کو کیا فرق پڑا۔'' مہرالنساء کے لہجے میں اُداسی کا بے پناہ اثر تھا۔

''مہرو! حادثے انسان کو توڑ پھوڑ دیتے ہیں۔ ٹوٹے ہاتھ پاؤں والا انسان بھی زندہ رہ لیتا ہے۔ لیکن ٹوٹے دل والے انسان کے لئے زندہ رہنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ سردار صاحب ہمیشہ سے ایسے نہ تھے۔ ان کی زندگی، ان کی ترجیحات، ان کے اصول اس قدر کرخت اور جامد نہ تھے۔ ان کا مزاج بے حد **Flexible** اور نرم تھا۔ لیکن ظالم زندگی نے ان سے کچھ ایسے امتحان لئے کہ وہ اس طرح **Rigid** بن گئے۔ اس قدر ٹھوس بنا لی اپنی شخصیت۔ لیکن مہرو! یقین مانیں، آج بھی اس ٹھوس شخصیت کے اندر اک نازک دل ہے جو اپنے بچوں سے بے انتہا محبت کرتا ہے۔ انہیں بے پناہ پیار کرتا ہے۔'' وارث کا لہجہ ہمیشہ کی طرح نرم تھا۔

''لیکن وارث! یہ کہاں کا انصاف ہے کہ آپ دل میں تو کسی سے محبت کرو لیکن اظہار نہ کرو۔ اسے تڑپاؤ، کبھی اسے احساس نہ دلاؤ کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ جذبات کو دل میں دبا کے رکھنے کا حکم آسمانوں سے اُترا ہے یا گھٹی میں دیا گیا ہے؟'' وہ غصے سے بولی۔

''مہرو!........مہرو!........مہرو! کچھ انسان اظہار نہیں کر پاتے۔ انہیں نہیں آتا دل کے پردوں کی رسی کھینچنا۔ دل کی کھڑکیوں کو، کواڑوں کو کھول دینا۔ کچھ لوگ کم گو ہوتے ہیں۔ بیان کر پانے سے بے نیاز ہوتے ہیں۔'' وارث نے اسے سمجھانے کی

سعی کی۔

''وارث! اگر اظہار کرنا یا بتانا یا اپنے جذبات کو آگہی دینا اتنا غیر ضروری ہوتا تو پھر اللہ تعالیٰ کیوں اپنے بندوں تک یہ بات پہنچاتا کہ میں تمہیں ستر ماؤں سے بڑھ کر پیار کرتا ہوں یا میں تمہاری شہ رگ سے بھی زیادہ نزدیک ہوں۔ وہ پیار کرتا لیکن بتاتا نہیں۔ اس کے بندے علم ہی نہ رکھتے کہ وہ مالک کس قدر چاہتا ہے انہیں۔ وہ خوف اور ڈر میں اتنے مبتلا ہوتے کہ کبھی دل کھول کے دعا مانگنا بھی گوارا نہ کرتے۔ اظہار کرنے کی سمجھ، ہمیں ہمارے رب نے دی ہے۔ کیونکہ اس نے خود بھی اظہار کیا ہے اپنے محبوب ﷺ سے، اپنے بندوں سے۔ اظہار کی تمنا کرنا انسان کی جبلی فطرت میں شامل ہے۔'' مہرالنساء نہایت اعتماد سے کسی ماہر مقرر کی طرح بولی۔

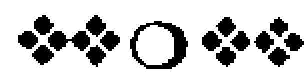
''بحث میں آپ سے جیتنا کہاں ممکن ہے مہرالنساء۔''

''جب آپ کوئی جواب نہ دینا چاہیں تو آپ یہی کہہ کے جان چھڑاتے ہیں۔'' وہ بسوری۔

''گھر چلیں یا کچھ اور لاوا باقی ہے اندر؟'' وہ محظوظ ہو رہے تھے۔

''مجھے زین کے لئے گفٹ خریدنا ہے۔'' لہجہ ناراض سا تھا۔

''چلیں گاڑی میں۔ میں آپ کو لبرٹی لے چلتا ہوں۔ وہاں بہتر دکانیں ہیں۔'' وارث کے مڑتے ہی روٹھی روٹھی سی مہرو بھی مڑ گئی۔



موسم کی خوشبو میں اکثر غم کی خوشبو مل جاتی ہے
آموں کے باغوں میں کیسے ساون ساون برسا آنسو
اپنے بچپن کا قصہ ہے اک تصویر بنائی اس نے
مہندی والے ہاتھ رچے تھے بیچ ہتھیلی ٹپکا آنسو
اک گاؤں میں دو باراتیں شاید دولہا بدل گیا ہے
میری آنکھ میں تیرا آنسو، تیری آنکھ میں میرا آنسو
پاس سے دیکھو جگنو آنسو، دور سے دیکھو تارا آنسو
میں پھولوں کی سیج پہ بیٹھا آدھی رات کا تنہا آنسو

میری ان آنکھوں نے اکثر غم کے دونوں پہلو دیکھے
ٹھہر گیا تو پتھر آنسو، بہہ نکلا تو دریا آنسو
پیار عجب تلوار ہے جس پہ ہم دونوں کے نام لکھے ہیں
ٹہنی ٹہنی کلیاں آنسو، پتھر پتھر جھرنا آنسو

برستی بارش میں سردار صاحب نے کھڑکی کے اوپر آیا دبیز مخملیں پردہ ہٹایا اور شیشے کا پٹ کھول دیا۔ سرد ہوا کا جھونکا بارش کی ٹھنڈی بوندوں کے ہمراہ ان کے چہرے سے ٹکرایا۔ بارش کی مخصوص سوندھی مہک جس میں مٹی، پودوں اور پانی کی مہک بھی شامل تھی، نتھنوں سے ٹکرائی اور سردار صاحب کو سالوں پہلے اِک برسات کی رات میں لے گئی۔ انہوں نے کھڑکی کے پاس رکھی لکڑی کی راکنگ چیئر پہ اپنا وجود گرا دیا اور اپنا سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا۔

بارش کی آواز ساعتوں میں گھلنے لگی۔ کبھی ہلکی، کبھی تیز ہوتی، کبھی برستی تو کبھی چمکتی بارش یادوں کے کئی کواڑ کھولنے لگی۔

اسی طرح کی برستی بارش میں ایک بار پھر سردار صاحب فیکٹری سے لوٹے اور کمرے میں آئے۔ کمرہ نیم تاریک اور پُرسکون تھا۔ کھڑکیوں پہ گہرے رنگ کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ بستر پہ بچھی مخملیں چادر بے شکن اور خاموش تھی۔ بستر کی پرلی طرف رکھے ننھے سے لکڑی کے جھولے میں چھ ماہ کی مہر النساء بے خبر سو رہی تھی۔ اس کے چہرے پہ فرشتوں جیسی معصومیت تھی۔

سردار صاحب نے اپنا کوٹ اتار کے بیڈ پہ رکھا۔ ان کی ساعتوں سے ستار کی دھن کی آواز ٹکرائی۔ وہ مسکرا دیئے۔ الماری کے پاس آئے اور اپنے لئے کُرتہ شلوار نکالا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ باتھ روم سے کُرتہ شلوار میں ملبوس باہر نکلے اور اس کمرے کا رخ کیا جہاں اکثر زیب پائی جاتی تھیں۔ ان کے اپنے بیڈ روم میں ذرا سے فاصلے پر بنا یہ کمرہ جسے زیب ''خوابگاہ'' کے نام سے پکارا کرتی تھیں اس کمرے کی ایک الگ ہی دنیا تھی۔

انسان اپنے اندر خواہشات کا، تمناؤں کا، پسند ناپسند کا ایک بھنڈار چھپا کے رکھتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کے پاس اس کی من پسند، من چاہی دنیا ہو اور اس خوابناک

دنیا کے حصول کی خاطر وہ کچھ بھی کر لیتا ہے۔ زیب کا مزاج بے حد شاعرانہ اور نازک سا تھا۔ وہ خوبصورتی کو پسند کرتی تھیں۔ انہیں رنگوں سے، سازوں سے، آوازوں سے محبت تھی۔ انہوں نے اپنے اور سردار صاحب کے مشترکہ بیڈ روم کے علاوہ اپنا ایک کمرہ بنایا تھا۔ اپنے اندر کی خواہشات کی، خوابوں کی اِک دنیا۔ سفید دیواروں والے اس کمرے میں ریشم کے نازک سے جھالر والے پردے لگے تھے۔ دبیز قالین تھا، ایک رائٹنگ ٹیبل جس کے ہمراہ رکھے شیلف میں اچھی شاعری کی کتابیں تھیں۔ ایک تخت تھا جس کے اوپر ہندوستان سے منگوائی ہوئی پرانی ستار رکھی تھی۔ ساتھ ہی فرش پہ بچھے غالیچے کے اوپر پیتل کے دو بڑے برتن رکھے تھے جن کے اندر روزمرہ پانی ڈالا جاتا، تازہ گلاب کی پتیاں ڈالی جاتیں اور موم بتیاں جلائی جاتیں۔ ایک پرانا گراموفون بھی تھا اور کچھ ریکارڈ جو قیمتی سے تھے۔ یہ کمرہ کسی کو دکھانے کی خاطر نہ تھا۔ یہ کمرہ زیب نے اپنی روح کی تسکین کے لئے سجایا تھا۔ وہ جب کبھی وقت پاتی یا اُداس ہوتی تو اس کمرے میں آ جاتی تھی۔ یہ کمرہ اسے بولتا محسوس ہوتا تھا۔ کچھ جگہوں سے بھی انسان کی کتنی مانوسیت ہو جاتی ہے کہ بند دیواریں بھی بات کرتی محسوس ہوتی ہیں۔ دروازے، چھتیں اور چھتوں کی کڑیاں، پنکھا اور فرنیچر جاندار سا محسوس ہوتا ہے۔ جگہوں اور چیزوں اور کمروں سے محبت اور مانوسیت ان سے بچھڑ جانے کے بعد کس قدر رُلاتی ہے۔

یہ اپنائیت اور مانوسیت بعض اوقات برسوں میں ہوتی ہے اور بعض اوقات لمحوں میں۔ کبھی کبھی کسی کمرے میں گزاری فقط ایک رات بھی تا عمر یاد رہتی ہے۔ کسی اجنبی بستر پہ سونے کے بعد اکثر اس بستر کی مہک اپنے بستر سے آتی ہے اور تڑپا دیتی ہے۔

سردار صاحب نے دو انگلیوں کی دستک دے کر ستار بجائی، زیب سے اندر آنے کی اجازت چاہی مگر زیب کی محویت نہ ٹوٹی۔ وہ اسی رفتار اور اسی انداز میں ستار بجاتی رہیں۔ سردار صاحب خاموشی سے جا کے زیب کے تخت پوش کے پاس نیچے کشن پہ بیٹھ گئے اور ستار کے تاروں سے نکلتی میٹھی دھن سنتے رہے۔ زیب نے ستار بجانے کا فن بھارت سے سیکھا تھا جب وہ بارہ سال کی تھیں۔ وہیں سے سنگیت کی ٹریننگ بھی لی تھی۔

کافی دیر بعد جب زیب نے خود ہی ستار کی دھن کا اختتام کیا اور آنکھیں کھولیں تو سردار صاحب کو دیکھ کر لحہ بھر کو چونک گئیں۔

''ارے......آپ کب آئے؟'' وہ مسکرا کے ستار سائیڈ پہ رکھتے ہوئے بولیں۔

آج انہوں نے سرخ پھولوں والی سفید ساڑھی پہنی تھی اور ہمیشہ کی طرح بال کھول رکھے تھے۔

''جب آپ ہمارے اس رقیب پہ اپنی انگلیاں پھیر رہی تھیں اور آپ کے خوبصورت ہاتھوں کے جادو سے یہ بے پناہ سُر بکھیر رہا تھا، تب آیا تھا میں۔'' واجد مسکرائے۔

''کیسی باتیں کرتے ہیں آپ بھی؟......ستار ہمارا شوق ہے۔ ہمیں محبت ہے اس کے سُروں سے۔'' وہ بولی۔

''اور ہم سے؟'' سوال واجب تھا۔

''آپ سے بھی بے پناہ محبت ہے۔'' زیب نے اعتراف کیا۔

''دو محبتیں ایک ساتھ چلا رہی ہیں آپ؟'' وہ گویا خفا ہوئے۔

''اپنا آپ کھونے کے لئے تو ایک محبت ہی کافی ہوتی ہے۔'' زیب مسکرائیں۔

''کچھ فرق تو ہوگا دونوں محبتوں کے بیچ۔'' سردار صاحب نے وار کیا۔ زیب کچھ سوچتے ہوئے بولیں۔

''گرو جی کہتے تھے کہ محبتیں انسان کی زندگی میں کئی ساری ہوتی ہیں۔ انسان ماں باپ سے بھی محبت کرتا ہے، بچوں سے بھی اور اپنے شوق یا خوابوں سے بھی۔ لیکن عشق فقط ایک بار ہوتا ہے۔ وہ چاہے کسی فن سے ہو یا کسی انسان سے۔ محبت زندگی دیتی ہے اور عشق مٹاتا ہے۔ محبت زندگی سے پیار کرنا سکھاتی ہے، عشق موت کو گلے لگانا سکھاتا ہے۔ محبت میں انسان خود کو تلاش کر لیتا ہے۔ عشق میں انسان اپنا آپ کھو دیتا ہے۔ محبت خدا کا ادراک دیتی ہے اور عشق خدا کی ذات سے بھی آشنائی دیتا ہے۔ محبتیں چوٹ دیتی ہیں اور عشق چوٹ کھاتا ہے۔''

زیب کا لہجہ ہمیشہ کی طرح گہرا گہرا اور پُر اثر تھا۔ سردار صاحب اپنی خوبصورت، باشعور، سنجیدہ اور گہری سوچ رکھنے والی بیوی کے چہرے کو دیکھتے رہے۔

''پھر میں خود کو آپ کی محبت سمجھوں یا پھر عشق؟'' سوال متوقع تھا۔

زیب مسکرا دیں۔ بولیں۔ ''جواب مختصر چاہئے یا تفصیل سے؟''

''جس طرح مل جائے قبول ہے۔'' وہ بولیں۔

''مجھے خوبصورتی سے محبت ہے۔ رنگ، تصویریں، دُھنیں، ساز، گیت، شعر، غزل، نغمے...... مجھے سفر کرنے سے محبت ہے، کہانیاں پڑھنے سے محبت ہے۔ لیکن میں ان تمام چیزوں کے بغیر زندہ رہ سکتی ہوں لیکن آپ کے بغیر زندہ رہنا ممکن نہیں۔ اس کا مطلب مجھے آپ سے محبت ہی نہیں، محبت کی انتہا تک محبت ہے۔ یعنی کہ عشق ہے۔'' زیب نے نرمی سے کہا۔

''آپ کی باتیں بڑی گہری ہوتی ہیں زیب!'' واجد نے اعتراف کیا۔

''میری محبت بھی اتنی ہی گہری ہے واجد! بلکہ اس سے بھی زیادہ۔'' وہ مسکرا دیں۔

سردار صاحب نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔ سامنے شیشے کی کھڑکی پہ بارش کی بوندیں ٹپ ٹپ برس رہی تھیں۔

راکنگ چیئر پہ سر رکھے آنکھیں موندے سردار صاحب کی آنکھیں نم ہو چکی تھیں۔ برساتوں کی بوندیں زیب کی یاد بھی شدت سے لے آتی تھی۔ ان کی مہک، خوشبو بن کے بوندوں کے ساتھ کھڑکی سے کمرے تک آ جاتی تھی اور واجد کی روح کو تار تار کرتی تھی۔

'اُف......لوگ مر کیوں جاتے ہیں؟ محبت کرتے ہیں، زندگی دیتے ہیں، سو برس تک ساتھ رہنے کے وعدے کرتے ہیں اور بے وفائی کر کے مر جاتے ہیں۔ اُف، زیب! تم آسمان کے کس کونے میں ہو؟......میں تمہیں کہاں سے آواز دوں؟''

راکنگ چیئر زور زور سے ہلنے لگی تھی۔ برسات کی شدت بھی بڑھنے لگی۔



ماہا نے شمائل کی بہن کی شادی اٹینڈ کرنے کے لئے ایک ہفتے کی چھٹی لی تھی۔ عاشر کو سکول کی وجہ سے پھپھو کے پاس چھوڑا اور ضحیٰ کو لے کر وہ شمائل کے ہمراہ اس کے گاؤں خان پور جانے کے لئے تیار ہو گئی تھی۔

خان پور سندھ کے ختم ہوتے اور پنجاب کے شروع ہوتے میں آتا ہے۔ ماہا کو یوں تو لانگ ڈرائیو بہت پسند تھی لیکن اتنی دور کی ڈرائیو وہ پہلی مرتبہ کر رہی تھی۔ یہ سفر ایک پُر آسائش بس کے ذریعے تھا۔ ضحیٰ اور ماہا الگ الگ سیٹوں پر بیٹھی تھیں اور شمائل علیحدہ سے سامنے والی سیٹ پہ۔ کھڑکی کے باہر رفتار سے بدلتے نظاروں کو، گھروں کو، درختوں کو، سڑکوں اور شہروں کو ماہا غور سے دیکھ رہی تھی اور لطف اندوز ہو رہی تھی۔ ضحیٰ تو کچھ دیر بعد ہی سو گئی تھی۔ اتنے غور سے کھڑکی میں سر دیئے نظارے دیکھتی ہوئی ماہا کو شمائل مسکرا کے دیکھ رہا تھا۔

تقریباً ساڑھے آٹھ گھنٹے کے سفر کے بعد وہ لوگ خان پور پہنچے تھے۔ شمائل کے خاندان کے سبھی لوگوں نے دونوں کا بھرپور استقبال کیا۔ خصوصی طور پر تمام نوجوان لڑکیوں نے جو کہ ہر جگہ کی طرح تعداد میں بچوں اور بوڑھوں سے زیادہ تھیں۔ بات بات پہ قہقہے بکھیرتی اور لطیفے پھینکتی تھیں۔ شمائل کی امی اور بہن کو تو ماہا کا اور اس کی آمد کا تھوڑا بہت علم تھا لیکن باقی لڑکیاں شمائل کے ساتھ اس کی خوبصورت، پُرکشش اور نوجوان لیکچرار کو دیکھ کر حیران رہ گئیں۔

''ہائے اللہ! شہر میں اتنی خوبصورت استانیاں ہوتی ہیں؟'' ہما نے حیرانی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اور اس قدر خوبصورت ڈریسنگ بھی کرتی ہیں۔'' یہ رانی تھی۔

''پھر تو ان کے طلباء وطالبات پڑھتے ہی نہیں ہوں گے۔ صرف انہیں دیکھتے ہوں

گے۔'' یہ رانی کی بہن مینا تھی۔

''میں بھی کہوں آج کل کے تمام لڑکے کیوں شہر جا کے پڑھنے کی ضد کرتے ہیں۔ یہ زری پھپھو تھیں۔

''یہ تو مجھے ''میں ہوں نا'' فلم کی سشمیتا سین لگ رہی ہیں۔'' نادرہ نے آنکھ ماری۔ سبھی کے قہقہے بکھرے۔

''ہائے اللہ! ان کے تو بچی بھی ہے۔'' رانی کی نظر گپلو سی ضحیٰ پر پڑی۔

''پوچھ لو۔ شاید بھتیجی یا بھانجی ہو۔ لگتا ہی نہیں یہ شادی شدہ ہیں۔'' مینا نے مبالغہ آرائی کی حد کر دی۔

ماہا مسکرا کے ان سب باتوں کو انجوائے کر رہی تھی۔ یہ سبھی شمائل کی کزنز تھیں۔ دور پار کی، چچا کی، خالہ کی یا ماموں کی بیٹیاں۔ کوئی نہ کوئی سیدھا یا پھر ٹیڑھا رشتہ کم وبیش ہر کسی کے ساتھ تھا۔

''اچھا، اب انہیں راستہ دو تا کہ میں انہیں مہمان خانے میں لے جاؤں۔ لمبا سفر کر کے آئی ہیں۔'' شمائل کے ہاتھ میں ماہا کا سوٹ کیس تھا۔

''لمبا سفر کروا کے آپ کیا انہیں آرام کروانے لائے ہیں شوی بھائی؟'' نادرہ نے چوٹ کی۔

''یہ جو دیکھنے آئی ہیں، انہیں وہ بھی تو دکھاؤ نا۔'' زری پھپھو کیوں چپ بیٹھتیں۔

''ان کے لئے ہم نے بہت سی باتیں اور گوسپ تیار کر رکھی ہیں۔'' رانی اٹھلائی۔

''لیکن کم از کم ابھی تو راستہ چھوڑیں۔'' شمائل بھاری سوٹ کیس اٹھا کے تھک گیا تھا۔

''ارے ایسے ہی مفت میں راستہ چھوڑیں؟'' مینا بسوری۔

''دولہا میں نہیں کہ مجھ سے وصولی کرنی ہے۔'' شمائل نے غصے سے کہا۔

''پریکٹس کرنے میں کیا حرج ہے؟'' زری پھپھو کے کہتے ہی سبھی ہنس دیں۔ ماہا بھی انجوائے کر رہی تھی۔

''ارے .... تم لوگ ابھی تک یہیں کھڑے ہو؟........ شمائل بیٹا! مہمان کو اوپر لے جاؤ۔'' شمائل کی امی وہاں سے گزریں اور انہیں وہاں کھڑا دیکھے بولیں۔

''یہ بھوتنیاں اوپر جانے کا راستہ دیں تو ہم جائیں نا۔'' شمائل نے وار کیا۔

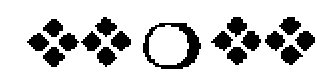
"اَرے زریں! مینا! رانی! کیا بات ہے؟ کیوں روکا ہوا ہے؟"

"نہیں خالہ! ہم تو لیکچرار صاحبہ سے مل رہے تھے۔ یو نو، تعارف وغیرہ۔" رانی نے بات سنبھالنے کی کوشش کی۔

میرا نام ماہا ہے۔ لیکچرار صاحبہ نہیں۔" ماہا پہلی بار مسکرا کے بولی۔

"چلیے ماہا! ہم آپ کو اوپر پہنچا دیتے ہیں۔" زریں پھپھو نے اوپر پر زور دے کر کہا اور ماہا شائل کو پیچھے چھوڑ کے لڑکیوں کے ہمراہ اوپر جانے والا زینہ طے کرنے لگی۔

اوپر مہمان خانے میں بھی لڑکیاں کافی دیر اسے گھیرے بیٹھی رہیں۔ ضحیٰ تو پل میں سبھی سے مانوس ہو گئی۔ اس چھوٹے سے مگر خوبصورت گھر میں ماہا کو بہت اپنائیت سی محسوس ہو رہی تھی۔ اور پھر لڑکیوں کی باتیں بھی بے حد مزے کی تھیں۔ وہ بہت خوشی محسوس کر رہی تھی۔



اگرچہ جانتا ہوں کہ ایسا ہو نہیں سکتا
مگر اِک خوش گمانی ہے کہ شاید ایسا ہو جائے
تبھی تو ہر گھڑی مجھ کو یہی محسوس ہوتا ہے
ابھی گھر کی منڈیروں پر کبوتر آن اُترے گا
تیرا پیغام لائے گا
ابھی مانوس دستک ہو گی یا پھر کال بیل ہو گی
تُو میرے گھر میں آئے گا
ابھی گھنٹی بجے گی فون کی تو میں اُٹھاؤں گا
تیری آواز آئے گی
ہوائے شہر کھڑکی سے میرے کمرے میں اُترے گی
تیری خوشبو بھی لائے گی
اگرچہ جانتا ہوں میں کہ ایسا ہو نہیں سکتا
مگر اِک خوش گمانی ہے کہ شاید ایسا ہو جائے
کہ آخر معجزے بھی تو اسی دنیا میں ہوتے ہیں

وارث نے ایک الوداعی نظر مہر النساء پہ ڈالی تھی اور اس ایک نظر میں بہت کچھ تھا۔ اُداسی کا اک تاثر بھی، لوٹ کے آنے کا یقین بھی، خواب پورے کرنے کا وعدہ بھی، خیال رکھنے کی تاکید بھی اور اعتماد قائم رکھنے کی امید بھی۔ اور یہ تمام تاثرات مہر النساء کی آنکھوں نے بنفسِ نفیس پڑھ ڈالے تھے۔ وہ جو اُداس سی اسے جاتا دیکھ رہی تھی، وارث کی آنکھوں میں اپنے لئے اُمڈتے جذبات دیکھ کر مسکرا دی اور آگے بڑھ کے وارث کا ہاتھ تھام لیا۔

"اپنا خیال رکھئے گا اور مجھ سے رابطے میں رہنے کی کوشش کیجئے گا۔" وہ بولی۔

"آپ نے ابھی سے ایک بیوی کی طرح آرڈر دینا شروع کر دیئے۔" وارث نے اسے چھیڑا۔ وہ شرما دی۔

"میں کوشش کروں گا، آپ کے بابا سے آپ کو مانگ لوں۔" لہجے میں اک سنجیدہ سی امید تھی۔

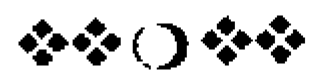
"میں آپ کی طرف سے کسی خوشخبری کا انتظار کروں گی۔"

"آپ بھی اپنا خیال رکھئے گا۔ گھر میں بوریت ہونے لگے تو بے دھڑک گاڑی لے کے چلی جایئے گا۔ گھر کے تمام ملازم آپ کے حکم کے پابند ہیں۔ آپ کے پاس موبائل فون ہے۔ آپ مجھ سے بھی کسی بھی وقت رابطہ قائم کر سکتی ہیں۔ آرام کرنے اور کھانے پینے میں کسی قسم کی غفلت مت برتیئے گا۔" وارث نے بھی تاکید کی۔

"آپ بھی ابھی سے شوہروں کی طرح نصیحتیں کرنے لگے۔" مہرو کی چوٹ بھی واجب تھی۔

وارث مسکرا دیئے۔

"چلتا ہوں۔" وہ ایک بار پھر اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے بولے اور گاڑی کی طرف بڑھے۔ گاڑی میں بیٹھنے کے بعد بھی ان کی نظر مہرو پر تھی اور مہرو بھی انہیں دیکھتی رہی جہاں تک وہ حدِ بصارت میں رہے۔ اور پھر اوجھل ہو گئے۔



"لیکن چوہدری صاحب! ضرورت کیا ہے میرے بیٹے کی شادی اپنے دشمن کی بیٹی سے کرنے کی؟" فرزانہ بیگم کی چیخ سے پورا کمرہ گونج اٹھا۔

''ضرورت ہی تو ہے فرزانہ بیگم! تُسی سمجھو نہ سمجھو، لیکن یہ بڑا ضروری ہے ہمارے سیاسی کیریئر کے لئے۔'' چوہدری مسکرا کے بولا۔

''تمہارے سیاسی کیریئر کے لئے میں اپنے بیٹے کی زندگی تباہ کرلوں۔ آخر ہے کیا اس لڑکی میں؟'' وہ چلائیں۔

''اس کُڑی میں........اس کُڑی میں دیکھا جائے تو بہت کچھ ہے۔ وہ سردار واجد دی اکلوتی کُڑی ہے........سردار دی ادھی جائیداد دی وارث۔ فیکٹریاں، ملیں، شیئرز اور سب توں وڈی گل ایہہ ہے کہ اوہ میرے اور میرے دشمن کے درمیان کا رابطہ بن سکدی اے۔ میں سردار کی جڑیں اس کے ذریعے کاٹ سکدا ہوں۔'' چوہدری اپنے مخصوص آدھے اُردو اور آدھے پنجابی کے انداز میں بولا۔

''لیکن میرے بیٹے کو کیوں استعمال کر رہے ہو؟ اپنا بڑا بیٹا نظر نہیں آتا؟ وہ جو تبلیغی جماعت میں شامل ہو گیا ہے۔ اسے کیوں نہیں استعمال کرتے اپنی اس سازش کے لئے؟'' فرزانہ پھر بھڑکیں۔

''تُسی سمجھ نہیں رہے۔ میرے پُتر میں وہ گُر نہیں جو تہاڈے پُتر میں ہیں۔ یہ بات ہُن تہاڈی سمجھ میں نہیں آئے گی۔ وقت گزرنے دو، پھر تُسی سمجھو گے۔ اس کُڑی کے آنے سے سانوں فائدہ ای فائدہ ہے۔ جائیداد بڑھے گی، میرا سیاسی کیریئر مضبوط ہو گا۔ اور سب توں وڈی گل کہ میرا دشمن، میرا وڈا حریف میرے اشاروں پہ ناچے گا۔ میری مٹھی میں ہوگا۔'' چوہدری مکاری سے مسکرانے لگا۔

''اور مجھے کیا فائدہ ہوگا مفت میں اپنا بیٹا تیاگ دینے سے؟'' فرزانہ بیگم کی خود غرضی بول پڑی۔

''کیا میرا بیٹا، میرا بیٹا لگا رکھی ہے؟........تمہارا بیٹا کوئی دودھ پیتا نِکا نہیں ہے۔ اوہنوں کیا فرق پڑے گا ایک ادھ شادی کر لینے سے؟ یوں بھی ایک آدھ سال بعد اس کو طلاق دینا ہی ہے۔ اس سے شادی کا مقصد صرف سردار کو خوار کرنا ہے اور اپنے ساتھ ہر موڑ پہ ہوئی نا انصافی کا بدلہ لینا ہے، اور کچھ نہیں۔'' چوہدری بھڑک اٹھا۔

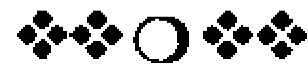
''ٹھیک ہے...... مجھے منظور ہے۔ اگر اس شادی سے مجھے اور سلمان کو کوئی نقصان نہیں ہوگا تو ٹھیک ہے۔ لیکن میں نے اس گھر کی بہو صرف مسز اسلم کی بیٹی کو ہی بنانا

ہے۔ کیونکہ وہ مجھے بے حد پسند ہے اور ڈھیر ساری جائیداد کی اکلوتی وارث ہے۔ تم یہ شادی کر کے اپنا مشن مکمل کرلو، پھر میں دھوم دھام سے سلمان کی شادی کروں گی۔'' فرزانہ اپنے تراشے ہوئے لمبے اور پتلے ناخنوں کو دیکھتے ہوئے لاپرواہی سے بولیں۔

''اس کا مطلب ہے میں اپنی طرف سے رشتہ ڈال دوں اور شادی کی تیاری شروع کر دوں؟'' چوہدری خوشی سے بولا۔

''میرا کیا جاتا ہے۔ جو کرنا ہے کرو۔'' فرزانہ نے دونوں شانے اُچکائے۔

چوہدری کے چہرے پہ مسرت اور خوشی کی اِک رمق سی دوڑ گئی اور وہ دل ہی دل میں مزید پلاننگ کرنے لگا۔



آئے گا شہری بابو
تم دل پہ رکھو قابو
کرو انتظار آنکھیں بند کر کے
لے جائے گا اِک لڑکی پسند کر کے

زری اور مینا، نادرہ کو پکڑے کمرے کے کونے میں ہی ڈانس کی پریکٹس کرنے لگی تھیں۔ ضحیٰ انہیں دیکھ کر خود بھی ننھے ننھے ہاتھ اٹھا کر ناچنے لگی تھی۔ ماہا بھی انجوائے کر رہی تھی۔ یوں تو یہ کمرہ خصوصی طور پر ماہا کے لئے تھا لیکن اتنی جلدی اس کی ان تمام لڑکیوں سے دوستی ہو گئی تھی کہ اب وہ بھی مہمانداری کا لحاظ بھول کے ماہا کو گھر کا فرد سمجھ رہی تھیں۔

آج رات ڈھولکی کا پہلا فنکشن تھا۔ دوسرے دن سنگیت، پھر مایوں، پھر مہندی، پھر بارات اور پھر ولیمہ۔ شہروں کی شادیاں کتنی مختصر ہوتی ہیں۔ بس ایک یا دو راتوں کی کہانی۔ اور گاؤں اور چھوٹے موٹے علاقوں کی شادیاں کتنی پُر رونق ہوتی ہیں۔ ڈھولکی کی تھاپیں، پھولوں کی بارش، مہندی، اُبٹن، صندل کی بھینی بھینی خوشبو، لڑکیوں کے قہقہے اور رنگ برنگی رسمیں۔ ماہا بہت انجوائے کر رہی تھی۔ اوپر سے لڑکیوں کی شرارتی اور برجستہ باتیں کبھی ہنسانے تو کبھی محظوظ ہونے پر مجبور کر دیتی تھیں۔

ڈھولکی کے فنکشن کے لئے ماہا نے ایک کاسنی کلر کا شلوار سوٹ نکالا اور ساتھ ہلکی

پھلکی جیولری۔

''آپ یہ پہنیں گی ماہا جی؟'' زری اس کے پاس آ کے کپڑوں کو دیکھنے لگی۔

''ہاں.......میں نے تو یہی منتخب کیا ہے۔'' وہ بولی۔

''آپ نے یہاں کوئی لیکچر تو نہیں دینا میڈم صاحبہ!'' مینا بھی دوپٹے سے چہرہ پونچھتی وہیں آ بیٹھی۔

''کوئی جھلملاتا، لش پش کرتا، تارے بکھیرتا جوڑا پہنیں نا ماہا جی!'' زری مسکرائی۔

''لیکن میں اس طرح کے کپڑے کہاں پہنتی ہوں؟'' ماہا کے لہجے میں سنجیدگی کا تاثر تھا۔

''کیوں؟.......آپ کے ہزبینڈ نہیں کہتے آپ کو یا پھر وہ بھی ہر مرد کی طرح سڑیل مزاج ہیں؟'' مینا نے اپنی طرف سے جوک مارا۔

''میرے ہزبینڈ نہیں ہیں مینا!'' وہ آہستگی سے بولی۔ دونوں لڑکیوں کے چہرے پہ اُداسی سی چھا گئی۔

''جی.......؟'' زری کے منہ سے نکلا۔

''ضحیٰ کے پاپا کی ڈیتھ ہو چکی ہے۔'' ماہا نے کھل کر بتایا۔

مینا اور زری نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ انہیں افسوس ہوا، اس قدر پُرکشش اور جاذب عورت اپنا ہم سفر کھو چکی ہے۔

''ماہا باجی! آپ ہمارے یہاں مہمان بن کے آئی ہیں۔ ہمارے خاندان کی شادی کے رسم رواج دیکھنے آئی ہیں۔ آج ڈھولکی ہے اور ڈھولکی میں سبھی لڑکیاں لہنگا چولی پہنتی ہیں۔'' زری نے بات بدلنے کی کوشش کی۔

''ہم سبھی نے اپنے لئے الگ الگ رنگوں کے لہنگے بنائے ہیں۔'' مینا کھلکھلائی۔

''آپ نے بھی لہنگا پہننا ہے۔'' زری نے فرمائش کی۔

''زری! میں آپ لوگوں کی عمر کی کہاں ہوں؟ اور پھر میں نے کبھی لہنگا نہیں پہنا۔'' وہ بولی۔

''ہمارے ساتھ کھڑی ہوں تو ہم سے بھی چھوٹی لگیں گی۔'' مینا نے ننھی سی ناک سکیڑی۔ ماہا مسکرا دی۔

''اچھا، میرے پاس ایک اچھی سی شیفون کی ساڑھی ہے۔ میں وہ نکال لیتی ہوں۔''

''ہاں، یہ ٹھیک رہے گا۔'' زری اور مینا نے متفقہ طور پر کہا۔

اور پھر ڈھولکی کے فنکشن میں ماہا نے لیمن اور میرون کلر کی کنٹراسٹ کی سلک کی ساڑھی زیب تن کی۔ ہمیشہ کی طرح بالوں کا خوبصورت سا اسٹائل بنایا، ہاتھوں میں چوڑیاں پہنیں۔ سبھی لڑکیاں ڈھولک کے اردگرد بیٹھی گیت گا رہی تھیں۔ ماہا ساتھ رکھی کرسیوں پہ بیٹھی تھی اور تالیاں بجا کے گیتوں کو انجوائے کر رہی تھی۔

''ساڈے نال رہو گے تے نعرہ ساڈا عشق اے
ہور کتھے جاؤ گے تے بڑا وڈا رسک اے''

نادرہ نے گانے کے درمیان سے ہی بڑی اونچی تان اٹھائی۔ سبھی نے اس کی تقلید کی اور چند ہی لمحوں میں ماحول بڑا سہانا بن گیا۔

شمائل مووی میکر کے ساتھ کونے میں کھڑا تھا لیکن اس کی نظروں کا محور صرف ماہا تھی۔ وقفے وقفے سے مسکراتی، گورے گورے ہاتھوں سے تالیاں بجاتی، خوش ہوتی ہوئی ماہا۔ یونیورسٹی والی ماہا سے یکسر الگ۔ گھل مل جانے والی، اپنا بنا لینے اور بن جانے والی۔ شمائل کی آنکھیں ہٹتی نہ تھیں اس شفاف اور صبیح چہرے سے۔

لڑکیوں میں سے مینا نے شمائل کو ماہا پہ نظریں ٹکائے دیکھ لیا تھا۔ تالیاں بجاتے بجاتے اس کے ساتھ بیٹھی زری نے پھپھو کو ٹہوکا دیا۔

''وہ دیکھیں، شمائل بھائی کہاں دیکھ رہے ہیں؟''

''کہاں دیکھ رہے ہیں؟'' چشمہ پہنے ہوئے زری پھپھو لمحہ بھر کو بوکھلا سی گئیں اور یہاں وہاں دیکھنے لگیں۔

''وہ دیکھو، سامنے ماہا باجی بیٹھی ہیں۔'' مینا نے کان کے پاس سرگوشی کی۔

''تمہارا تو یوں بھی دماغ گند سے بھرا ہے مینا! بھلا یہ بھی کوئی بات ہے؟ ماہا باجی شمائل سے عمر میں کتنی بڑی ہیں اور ان کی پروفیسر بھی ہیں۔'' زری نے اسے ٹوکا۔

''تو میں نے کب کوئی غلط بات کی۔ میں تو ان کو پندرہ منٹ سے دیکھ رہی ہوں۔ مجال ہے جو ہم میں سے کسی کی طرف دیکھا ہو۔ آنکھیں بس ماہا میں ہی اٹکی ہوئی ہیں۔'' مینا بولی۔

"تو تجھے جلن ہو رہی ہے۔" زری نے چھیڑا۔

"مجھے کس غم میں جلن ہو گی؟ میرے چہرے پہ اٹکنے والی بہت سی آنکھیں ہیں۔" مینا اترائی۔

"مثلاً؟" زری بولی۔

"مثلاً، وہ مووی میکر کتنی دیر سے میری مووی بنائے جا رہا ہے۔" یہ اطلاع تھی۔

"خوش فہمی ہے تمہاری محترمہ! یہ ٹھرکی مووی میکر ہر لڑکی کو یہی محسوس کرواتا ہے کہ یہ اسی کی مووی بنا رہا ہے اور اس طرح سے حسیناؤں کے بنا ٹکٹ کے پوز دیکھ لیتا ہے۔" زری نے مینا کا مذاق اُڑاتے ہوئے کہا۔

"مووی بن جائے تو دیکھ لینا، دُلہن سے زیادہ میری ہو گی مووی۔" مینا ابھی تک پُر اعتماد تھی۔

"ہاہاہا......" زری نے قہقہہ لگایا۔



مہر النساء نے اس کمرے کے دروازے کی پرانی اور برسوں سے بند رہنے والی لکڑی کو دونوں ہاتھوں سے دھکیلا۔ چرر کی آواز سے دروازہ کھلا اور کمرے کے اندر جالے کی اک پرانی تہہ مہرو کے ہاتھ سے ٹکرائی۔ مہرو نے اسے ہٹانا چاہا اور دروازے کے پیچھے سے بجلی کا سوئچ تلاش کیا اور کمرہ روشن ہو گیا۔ کمرہ روشن کیا ہوا، گویا ماضی کا اک پرانا ورق کھل کے سامنے آ گیا۔ مہر النساء نے اک تیز نظر پورے کمرے پہ ڈالی۔

میں جب بھی زندگی کی چلچلاتی دھوپ میں تپ کر
میں جب بھی دوسروں کے اور اپنے جھوٹ سے تھک کر
میں سب سے لڑ کے، خود سے بھاگ کے
جب بھی اپنے کمرے میں جاتا تھا
وہ ہلکے اور گہرے کتھئی رنگوں کا ایک کمرہ
وہ بے حد مہرباں کمرہ
جو اپنی نرم مٹھی میں مجھے ایسے چھپاتا تھا

جیسے کوئی ماں بچے کو آنچل میں چھپا لے
پیار سے ڈانٹے
یہ کیا عادت ہے جلتی دوپہر میں
مارے مارے گھومتے ہو تم
وہ کمرہ یاد آتا ہے

مہر النساء کی نظر سب سے پہلے سامنے رکھے پرانے تخت پر گئی اور اس پہ رکھے پرانے ستار پہ۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ستار تک آئی۔ دبیز غالیچے پہ پاؤں رکھتے ہی اک گداز سی کیفیت اس کے اندر جاگی۔ وہ تخت پہ بیٹھی اور اس نے ستار کو ہاتھ لگایا۔ پرانی لکڑی اور تاروں سے بنے اس ستار پہ مٹی کی برسوں پرانی تہہ جمی تھی۔ گو کہ یہ ستار خاموش تھا مگر لاکھوں کہانیاں معلوم تھیں اسے۔ اور خاموش زبان میں کئی راز کھولتا محسوس ہوتا تھا۔ یہ پُراسرار سا کمرہ، اتنے سالوں بعد اتنا خوبصورت تھا تو کچھ عرصے قبل تو اس کی خوبصورتی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہو گی۔

دبیز اور خاصا بھاری
کچھ ذرا مشکل سے کھلنے والا وہ شیشم کا دروازہ
کہ جیسے کوئی اکھڑ باپ
اپنے کھردرے سینے میں
شفقت کے سمندر کو چھپائے ہو
وہ کرسی اور اس کیساتھ وہ جڑواں بہن اس کی
وہ دونوں دوست تھیں میری
وہ اِک شکستہ ذرا منہ پھٹ سا آئینہ
جو دل کا اچھا تھا
وہ بے ہنگم سی الماری
جو کونے میں کھڑی اِک بوڑھی انا کی طرح
آئینے کو تنبیہہ کرتی تھی
وہ اِک گلدان ننھا سا، بہت شیطان

ان دونوں پہ ہنستا تھا
دریچہ، یا ذہانت سے بھری اِک مسکراہٹ
اور دریچے پر جھکی وہ بیل
جیسے سبز سرگوشی
کتابیں طاق پر اور شیلف میں
سنجیدہ اور مشکل بنی بیٹھیں
مگر سب منتظر اس بات کی
میں ان سے کچھ پوچھوں

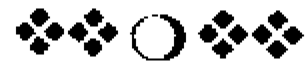
مہر النساء، ستار کو چھوڑ کر الماری کے پاس آئی تھی۔ الماری کا اِک پٹ لاک تھا اور دوسرا کھلا تھا۔ کھلے پٹ کے اندر کچھ کتابیں تھیں، کچھ پرانے رسالے۔ یوں لگتا تھا کہ اتنے سالوں سے کمرہ خالی نہ تھا بلکہ کوئی یہاں رہتا آیا تھا اور کل پرسوں ہی اپنی تمام چیزوں کو سمیٹ کے یہاں سے گیا ہو۔

مہر النساء نے درازیں کھولیں تو ایک دراز میں سے الماری کے دوسرے پٹ کی چابی نکل آئی جس کے کی رِنگ پہ ''زیڈ'' لکھا تھا جو یقیناً زیب کے نام کا پہلا حرف تھا۔ مہرو نے وہ چابی نکالی اور الماری کے کی ہول میں ڈالی۔ ذرا زور لگانے کے بعد الماری کا وہ دروازہ کھل گیا۔ سامنے کچھ پرانے ہینگر تھے جن میں رنگ برنگی ساڑھیاں لٹکی تھیں۔ نیچے والے خانے میں کچھ فوٹو البم تھے اور دو ڈائریاں۔ یہ تمام چیزیں اس کی ماں کی تھیں۔ اس کی پیاری ماں کی، جس کی شخصیت سے اس کا کوئی خاص واسطہ نہ تھا سوائے اس کے کہ وہ ان کے نام سے واقف تھی۔ مہر النساء نے الماری میں سے کچھ ضروری چیزیں نکالیں۔

سرہانے نیند کا ساتھی
تھکن کا چارہ گر، وہ نرم دل تکیہ
میں جس کی گود میں سر رکھ کے
چھت کو دیکھتا تھا
چھت کی کڑیوں میں

نجانے کتنے افسانوں کی کڑیاں تھیں
وہ چھوٹی میز پر اور سامنے دیوار پر آویزاں تصویریں
مجھے اپنائیت سے اور یقیں سے دیکھتی تھیں
مسکراتی تھیں
انہیں شک بھی نہیں تھا
ایک دن میں ان کو ایسے چھوڑ جاؤں گا
کہ پھر واپس نہ آؤں گا
میں اک دن یوں بھی جاؤں گا
میں اب جس گھر میں رہتا ہوں
بہت ہی خوبصورت ہے
مگر اکثر یہاں خاموش بیٹھا سوچتا ہوں
بیٹھا یاد کرتا ہوں
وہ کمرہ بات کرتا تھا

مہر النساء نے ایک آخری نظر اس بولتے کمرے پر ڈالی اور دروازہ بند کر کے باہر آ گئی۔



''چوہدری ساجد بات کر رہا ہوں سردار!'' کارڈلیس کے ایئرپیس میں چوہدری ساجد کی مانوس آواز گونجی۔ سردار صاحب حیرت سے لحہ بھر خاموش رہے۔

''چوہدری صاحب! آپ؟........ حیرت ہے، آپ نے مجھے فون کیا ہے۔'' سردار صاحب کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ در آئی۔

''اتنے غیر اور پرائے پن سے تو نہ بات کرو یار! سیاسی اور کاروباری باتیں اپنی جگہ لیکن ہم برسوں پرانے دوست بھی ہیں۔'' چوہدری نے نرمی سے کہا۔

''دوست جب دوستی کی آڑ میں دشمنی کرنے لگیں تو پرایا پن خود بخود لہجوں میں آ جاتا ہے۔'' سردار صاحب بولے۔

''اوئے چھڈ ان باتوں کو۔ میں نے کوئی سیاسی اختلاف یا **Biological gap**

بڑھانے کے لئے فون نہیں کیا۔ میں نے تو اپنے یار کی فتح پہ مبارکباد دینے کے لئے فون کیا ہے۔'' چوہدری کے لہجے میں مٹھاس حلول کر گئی۔

''میری فتح تمہاری شکست تھی چوہدری!'' سردار صاحب مسکرائے۔

''جانتا ہوں سردار! لیکن میرا یار تو جیتا ہے۔ اس کی فتح کا علم تو بلند ہوا ہے۔ میرے لئے یہ اپنی جیت سے بھی بڑھ کر ہے۔'' چوہدری کے چہرے پہ مکر و فریب تھا لیکن لہجے میں سیاسی مٹھاس تھی۔

''یہ اتنے برسوں بعد دوستی کہاں سے زندہ ہو پڑی؟ میں اس غیر معمولی اپنے پن کو کیا سمجھوں چوہدری! کاروبار یا پھر سیاست؟''

''سردار! بھولے کے بھولے رہے تم۔ جیسے آج سے پچیس سال پہلے تھے، ویسے ہی۔ کاروبار، سیاست اور دوستی کا فاصلہ نہیں ناپ سکتے۔ چلو کوئی مسئلہ نہیں۔ میں نے تو روٹھا یار منانے کی کوشش کی تھی لیکن میرا یار شاید ماننے کے موڈ میں نہیں۔'' چوہدری نے ایک اور پتا پھینکا۔

سردار صاحب خاموش ہو کے سوچنے لگے کہ کیا چوہدری واقعی دوستی نبھا رہا ہے یا پھر سیاسی دشمنی؟''

''میں ابھی تک تمہاری نیت سمجھ نہیں پا رہا ہوں چوہدری!'' سردار صاحب تذبذب میں تھے۔

''کل شام میرے ساتھ چائے پیو۔ ہم پرانی دوستی کے رشتے استوار کریں گے۔ میری نیت میرے چہرے سے پڑھ لینا تم۔ دراصل سردار! سچائی پوچھو تو وہ یہ ہے کہ میں بہت بیمار رہنے لگ گیا ہوں۔ ایک ہارٹ اٹیک نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ میں اپنے تمام گناہوں کی تلافی کرنا چاہتا ہوں۔ اپنے روٹھے دوستوں کو منانا چاہتا ہوں.......اور پھر تم تو میرے سب سے پرانے اور سب سے قریبی دوست ہو۔ سیاست اور کاروبار جیسی سطحی اور عارضی چیزوں کے لئے دلوں کے رشتے توڑ دینا کہاں کی سمجھداری ہے؟'' چوہدری نے نرمی سے کہا۔

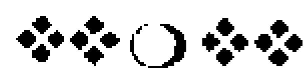
''تو کیا کل آؤ گے چائے پینے میرے ساتھ؟.....اپنے پرانے دوست کے ساتھ؟''

''آؤں گا چوہدری! ضرور آؤں گا۔'' سردار صاحب نے یہ کہہ کر فون رکھ دیا او۔

کچھ دیر تک سوچ ان کے ذہن کی سطح پر دھند کی طرح ٹھہری رہی۔ یہ فیصلہ کر پانا مشکل تھا کہ چوہدری کا یہ نیا روپ سچ ہے یا بہروپ۔

گو کہ اس نے دوستی جیسے مقدس رشتے کی ہمیشہ توہین کی تھی۔ گو کہ اس نے ہر بات میں سے حسد اور جلن کے پہلو کو ظاہر کیا تھا۔ گو کہ اس نے برسوں کے ساتھ کو بے وجہ پامال کیا تھا۔ گو کہ اس پہ اعتماد کرنے کی کوئی وجہ، کوئی جواز نہ تھا۔ لیکن پھر بھی اتنی عمر گزار دینے کے باوجود کوئی ایسا احساس ضرور سردار صاحب کے دل میں باقی تھا جسے پرانی دوستی نبھانے اور برقرار رکھنے کا احساس کہا جا سکتا ہے۔ سردار صاحب رشتوں، ناتوں اور انسانوں کی عزت کرنا جانتے تھے اور عزت کرنے اور رشتے نبھانے کا پہلا اصول اعتبار کرنا ہوتا ہے۔

سو سردار صاحب نے ایک بار پھر چوہدری پہ اعتبار کرنا بہتر سمجھا۔



پاگل خانے کی فضاؤں کے باہر سولہ سال بعد اس نے سانس لی تھی۔ وہ ایڈووکیٹ شہرین کے ہمراہ اس کی گاڑی میں بیٹھی تھی اور گاڑی کے شیشے کے پرلی طرف بار بار بدلتے مناظر کو دیکھ رہی تھی۔ کسی بھی آنکھ کیلئے معمولی ہونے والے مناظر اس کی اپنی آنکھوں کو غیر معمولی محسوس ہو رہے تھے۔ بادل، کھلا آسمان، کھیت، درخت، مٹی کے ٹیلے، عمارتیں اس کی آنکھوں کے لئے نئی نئی تھیں۔ قید سے عرصے بعد رہا ہونے والا قیدی جس طرح آزادی کی خوشبو کو اپنے پھیپھڑوں میں اتارتا ہے، وہ بھی اسی طرح بار بار سانس لے کے آزاد فضا کو اپنے اندر اتارنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ڈرائیو کرتی ہوئی شہرین نے اس کے چہرے پہ کچھ نئے نئے سے عکس دیکھے اور مسکرا دی۔

''آپ یقیناً بہت انجوائے کر رہی ہوں گی یہ تمام مناظر اور یہ ڈرائیو۔ آزادی چیز ہی ایسی ہوتی ہے جو ہمارے پاس ہوتی ہے تو ہمیں اس کا احساس اور ادراک نہیں ہوتا۔ اور جب یہ ہم سے چھن جاتی ہے تب ہم اس کی قدر و قیمت جانتے ہیں۔ آزادی کے حسن اور اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے، احساس ہوتا ہے۔'' شہرین نے کہا۔

وہ انہی تاثرات سے اردگرد کی چیزوں کا جائزہ لیتی رہی۔ یوں لگ رہا تھا کہ تیز

رفتاری سے آگے بڑھتی گاڑی اس کے ماضی کے اندر دوڑتی چلی جا رہی ہے۔ سنگ میل پر کراچی شہر کی طرف کم سے کم ہوتے میل اس کے ماضی کی طرف کم سے کم ہوتا فاصلہ ہے۔ آہستہ آہستہ چلتی وہ وقت کی حدود پھلانگ کے کئی برس پیچھے چلی جائے گی اور وہ تمام چہرے اسی طرح سے اسے ملیں گے جیسے پہلے تھے۔ اپنوں کے اپنائیت بھرے چہرے، بچوں کی کھلکھلاتی قلقاریاں، اسی ترتیب سے رکھی ہوئی گھر کی تمام چیزیں، وہی شب و روز، وہی ماہ و سال۔

کیا واقعی کوئی ایسی ٹائم مشین ایجاد ہوئی ہے کہ جس کے ذریعے پرانے ادوار میں سفر کیا جا سکے؟...... جو ماضی کے بند دریچوں کو کھول کے گزرے دنوں کی جھلک دکھا سکے؟ جو ہر انسان کا مستقبل بتا سکے۔ وہ انسان جو قبروں میں مدفون ہو چکے ہیں یا پھر زندہ ہیں، ان تمام انسانوں کی زندگیوں کو سامنے لا کھڑا کر دے۔ کوئی ایسی مشین کیوں پیدا نہیں کی جاتی۔

''آپ کو دیکھ کے مجھے کبھی کبھی بہت حیرت ہوتی ہے۔ بالکل درست اور صحت مند ذہن رکھنے کے باوجود بھی آپ نے سولہ سترہ برس کا عرصہ کس طرح پاگل خانے میں گزار دیا؟'' شہرین نے سوال کرنے کے بعد اپنا دھیان ونڈ اسکرین سے ہٹا دیا اور اس کے چہرے پہ گاڑ دیا۔ اس کے چہرے پہ اُداسی، حیرانی اور ویرانی کے ملے جلے تاثرات تھے۔

''کیا پاگل، کیا صحت مند...... دنیا کا ہر انسان دیکھا جائے تو پاگل ہے۔ اپنے اندر سے جنگ لڑتا ہے، لڑتے لڑتے تھک جاتا ہے، اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھتا ہے۔ دنیا کا ہر حساس شخص یہاں پاگل ٹھہرایا جاتا ہے۔'' بالی کے لہجے میں بے پناہ حساسیت تھی جو شہرین نے محسوس کی۔

''آنٹی! آپ سے ہوئی چند ملاقاتوں میں ہی میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ جس طرح کی باتیں آپ کرتی ہیں، جس طرح کی سوچ آپ کی ہے، یہ کسی عام ذہن کی نہیں ہو سکتی...... مجھے پتہ ہے آپ کوئی عام عورت نہیں ہیں۔ پتہ نہیں، کیوں آپ کے چہرے میں اِک غیر معمولی کشش ہے جو مجھے آپ کی طرف کھینچتی ہے۔'' شہرین نے کہا۔

''خاص انسان ہونا خوش قسمتی کی نہیں، بدقسمتی کی علامت ہے۔ یہ دنیا خاص انسانوں کے ساتھ بہت عامیانہ سلوک کرتی ہے۔ بہت تڑپاتی ہے، بہت رُلاتی ہے۔'' بالی کا لہجہ سرد تھا۔ ٹھوس تھا۔

''آپ مجھ پہ یقین کرتی ہیں؟ اعتماد ہے آپ کو مجھ پر؟'' شہرین نے سوال کیا۔

''اعتماد اور یقین نہ ہوتا تو سالوں سے جن دیواروں میں بند تھی، وہاں سے نکل کے تمہارے ساتھ کیوں آتی؟ پاگل خانے کے حصار ہی سہی۔ انہوں نے مجھے پناہ دی تھی۔ اور جو پناہ دے، اس سے آپ ہی آپ محبت ہو جاتی ہے۔'' بالی نے نرمی سے کہا۔

''اس کا مطلب آپ کو مجھ پر اعتماد ہے۔ تو پھر آپ مجھے اپنے بارے میں بتاتی کیوں نہیں؟ آپ کون ہیں؟...... آپ کا نام کیا ہے؟...... آپ سے جڑے باقی لوگ کہاں ہیں؟'' شہرین نے سوال کیا۔

''تم وکیل ہو یا پولیس انسپکٹر؟'' بالی کے چہرے پہ مسکراہٹ سی در آئی اور یہ اس کے چہرے پہ پھوٹنے والی پہلی کرن تھی جو شہرین نے دیکھی تھی۔

''جو کہہ لیں۔ چلیں مت بتائیں اپنے بارے میں۔ میں خود ہی پتہ کر لوں گی۔ فی الحال آپ کی اطلاع کے لئے بتا دوں کہ ہم کراچی میں داخل ہو چکے ہیں۔ ٹول پلازہ کراس کر لیا ہے۔ روشنیوں کا شہر آپ کو خوش آمدید کہتا ہے۔ ناظم آباد میں میرا چھوٹا سا گھر ہے، جہاں میری پیاری سی امی میری منتظر ہوں گی۔ آپ سے مل کے بھی انہیں بے حد خوشی ہوگی۔'' شہرین نے کھلکھلا کے کہا۔

کراچی شہر کا نام آتے ہی بالی کے چہرے پہ اُداسی کے سائے لہرا گئے۔

یہ شہرِ روشنی، وہ شہرِ وفا، وہ شہرِ وفا شعاراں، وہ شہرِ چارہ گراں...... ہزاروں یادیں، ہزاروں باتیں، ہزاروں لمحے، ہزاروں داستانیں رقم تھیں اس شہرِ روشنی کے سینے پہ، اس کے دزدیدہ اوراق کے اوپر...... بالی کی آنکھیں پتھرانے لگیں۔ روح میں سناٹا سا چھانے لگا۔ آنکھوں کے آگے یادوں کی دھند سی چھانے لگی۔

❊✿❊✿❊

چوہدری ساجد اور سردار صاحب آمنے سامنے تھے....... برسوں بعد، دوستانہ روپ میں۔ یوں تو اکثر ان کا آمنا سامنا ہوتا تھا۔ کسی سیاسی اجتماع یا پارٹی میں، کسی مخصوص بزنس ڈنر ٹیبل پہ، کسی کانفرنس ہال یا کسی فنکشن میں۔ لیکن سیاسی حریفانہ نظر دونوں کو دُور دُور ہی رکھتی تھی۔ انا کی دیواریں دونوں ہی کے گرد تھیں اور دونوں ہی کی تعمیر کردہ دیواریں کچھ کم مضبوط نہ تھیں۔ پرایا پن، غصہ، ناراضگی، افسوس، شکوے شکایات دونوں ہی کی آنکھوں سے عیاں ہوتے تھے۔ لیکن آج دونوں آمنے سامنے تھے۔ ایک ہی ٹی ٹیبل پر، بنا کسی باڈی گارڈ اور سکیورٹی کے، بالکل دوستوں کی طرح۔ پندرہ بیس منٹ کی پُرتکلف گفتگو کے بعد ماحول ذرا سا ہلکا پھلکا ہو گیا تھا اور چائے پینے کے بعد ایک موہوم سی مسکراہٹ بھی نظر آ جاتی تھی دونوں کے چہروں پر۔ خاص طور پر سردار واجد جن کا دل کسی بھی طرح کے سیاسی میل سے پاک تھا۔ گو کہ چوہدری نے کسی موڑ پہ مخلص دوست کا کردار ادا نہیں کیا تھا لیکن پھر بھی کچھ دوست ایسے ہوتے ہیں جو دوستوں کی غلطیاں دلوں میں دفنا دیتے ہیں۔ اپنے دل کو ایک گہری قبر بنا لیتے ہیں۔ اور سردار صاحب بھی شاید انہی میں سے تھے۔

''بڑا بیٹا زاہد چوہدری وکالت کا امتحان پاس کرتے کرتے تبلیغی جماعت میں شامل ہو گیا جسے ہم سیاسی لوگ بھٹکنا ہی کہیں گے۔ وہ گھر ذرا کم کم ہی آتا ہے۔ اس کے بعد چوہدری سلمان ہے جو کہ انگلینڈ سے ایم بی اے کر کے آیا ہے اور چھوٹی بیٹی تھرڈ ایئر میں ہے۔ تم سناؤ، تمہارے بچے کہاں تک پہنچے، مہرالنساء اور زین؟'' چوہدری نے سگریٹ کے کش لیتے اپنے بارے میں بتانے کے بعد سردار واجد سے پوچھا۔

''میری ایک بیٹی ہے مہرالنساء۔ بی اے کے پیپرز کے بعد ایم اے کے رزلٹ کا انتظار کر رہی ہے۔ اور زین کو ہم نے لارنس کالج مری بھیج دیا ہے۔ ہے تو چھوٹا سا مگر

ذرا زیادہ ہی کامپلیکسڈ محسوس ہوتا تھا۔'' سردار صاحب نے جواب دیا۔

''دیکھتے ہی دیکھتے بچے جوان ہو گئے اور ہم بوڑھے۔ پینتیس سال کا سیاسی اور کاروباری سفر نجانے کب ہماری عمروں کو اپنے ساتھ لے اُڑا۔ کچھ عرصے سے بیماری دیمک کی طرح چاٹتی جا رہی تھی اندر سے۔ اور یہ احساس دل میں شدید ہو رہا تھا کہ میں نے تم جیسے باوفا دوست کو کھو کر اچھا نہیں کیا۔ تمہاری فتح کا یہ موقع میں ہاتھ سے گنوانا نہیں چاہتا تھا اس لئے میں نے رابطے میں پہل کی۔'' چوہدری کے چہرے پہ تاسف تھا۔

''نیک کاموں میں پہل کرنا اچھا ہی ہوتا ہے چوہدری! بہتر ہی ہوا کہ تمہارے اور میرے بیچ کی سرد مہری ٹوٹی۔ کم از کم پریس کو کچھ اچھی چیز تو ملے گی شائع کرنے کو۔'' سردار صاحب بولے۔

''ہاں خیر، یہ تو ہے۔ بلکہ میں تو سوچ رہا ہوں کہ پرسوں ہم تمہاری جیت کی خوشی میں فنکشن رکھتے ہیں۔ پریس والوں کو بھی بلا لیتے ہیں۔ برسوں کے گلے شکوے دور ہوئے ہیں تو کم از کم دنیا والے تو شامل ہوں۔''

''مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' سردار صاحب مسکرائے۔ برسوں کا جما ہوا گلیشئر پگھلنے لگا تھا۔



''آیئے اندر آنٹی!'' شہرین نے دروازہ کھول کے اسے اندر آنے کو کہا۔ وہ اسی طرح ڈری سہمی اور خوفزدہ سی لگ رہی تھی۔ اندھیرے سے برسوں بعد آنکھیں روشنی میں آئی تھیں۔ ایسے میں روزن بھی آنکھیں چندھیا رہے تھے۔ وہ اسی رفتار میں اندر آئی۔ شہرین اسے ساتھ لئے ہوئے آگے بڑھی۔ راہداری کے دونوں جانب کمرے تھے جن کے دروازے بند تھے۔ راہداری کے فرش پر چھوٹے بڑے پودوں کے گملے قطار میں سجے تھے۔ یہ گھر پرانی طرز کا تھا مگر کشادہ اور خوبصورت تھا۔

''امی!....... امی! ذرا باہر آیئے گا۔'' ایک کمرے کے دروازے کے سامنے رک کر شہرین نے آواز دی اور بالی کے چہرے کی طرف مسکرا کے دیکھا جو اجنبی نگاہوں سے کھلے آسمان اور اس کے نیچے کی ہر چیز کو دیکھ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد شہرین کی والدہ

ثمین بیگم باہر آ گئیں۔ ان کے شفیق چہرے پہ بیٹی کے لئے پیار تھا۔

''السلام علیکم امی! میں اپنے مہمان کو لے آئی ہوں۔ یہ ہیں وہ خصوصی مہمان۔ اور آنٹی! یہ میری امی ہیں۔'' شہرین نے دونوں کا تعارف کروایا۔

''کیسی ہیں آپ؟...... آیئے نا اندر۔'' وہ اسے اور شہرین کو لے کر لاؤنج نما کمرے میں لے آئیں۔

''سفر نے بہت تھکا دیا ہے امی! چائے پینے کا سخت موڈ ہو رہا ہے۔'' شہرین لیدر کا ہینڈ بیگ رکھ کے صوفے پہ گر سی گئی۔

''کھانے کا وقت ہو رہا ہے۔ اکٹھے کھانا کھاتے ہی۔ اس کے بعد چائے بنا لوں گی۔ ایسا کرو شہرین! تم ان کو ان کے کمرے میں چھوڑ آؤ۔ یہ فریش ہو جائیں۔ میں کھانا لگاتی ہوں۔'' ثمین بیگم نے کہا۔

''او کے امی!'' شہرین نے کہا اور اٹھ گئی۔ مگر اس کا موبائل فون بجنے لگا۔ اس نے بیگ سے موبائل نکالا۔ ہمایوں کے نمبرز بلنک کر رہے تھے۔

''امی! آپ آنٹی کو لے جائیں۔ میں ذرا ہمایوں سے بات کر لوں۔''

''ٹھیک ہے بیٹا!...... آیئے آپ۔'' ثمین نے بالی کو اپنے ساتھ آنے کو کہا۔

اسی کشادہ راہداری کو عبور کرتی ثمین اسے اپنے ہمراہ لئے گیسٹ روم کی جانب بڑھنے لگیں اور بائیں طرف بنے گیسٹ روم کا دروازہ کھول دیا۔ یہ گیسٹ روم شاذ و نادر ہی زیر استعمال آتا تھا۔ ثمین اور شہرین کے کسی دور پار کے دوست یا رشتہ دار کی آمد پر۔ کل شہرین نے کمرے کو کھلوا کے دھلوایا تھا۔ بستر کی چادر تبدیل کی تھی، پردے نئے لگائے تھے، دیواروں پہ لگے جالے اتارے تھے۔ گویا شہرین نے اپنی مہمان کی آمد کی دل سے تیاری کی تھی۔

''یہ رہا آپ کا کمرہ۔ آپ نے یہاں ہمارے گھر اور چھوٹی سی فیملی کا ممبر بن کے رہنا ہے۔ مجھے اپنی بہن اور شہرین کو بیٹی سمجھنا ہے اور ہم سے اپنا ہر مسئلہ شیئر کرنا ہے۔ ٹھیک ہے؟'' ثمین نے نہایت پیار سے کہا۔

اس نے گردن اثبات میں ہلائی اور دھیمے سے مسکرا دی۔ اس کے مسکراتے ہی ثمین کو اس کے چہرے میں شناسائی کا اک ہلکا سا تاثر نظر آیا اور ثمین کو لگا جیسے اس نے یہ

چہرہ پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ یہ مسکراہٹ، یہ آنکھیں نا مانوس نہیں۔ لیکن اگلے لمحے جب ثمین نے اس چہرے میں کوئی مزید شناسا عکس ڈھونڈنا چاہا تو دوبارہ وہ چہرہ بہت دور جاتا محسوس ہوا۔ اب اس چہرے میں پہلے جیسی مانوسیت نہ تھی۔ لمحوں میں ہی وہ چہرہ بہت دور چلا گیا تھا۔

'شاید میری غلط فہمی ہو گی۔ سولہ برس سے جو عورت باہر کی دنیا سے کٹی رہی ہو، جو پاگل خانے کی مکین رہی ہو، بھلا وہ میری جانی پہچانی کیسے ہو سکتی ہے؟ نہیں، نہیں۔ یہ میرا وہم ہے۔' ثمین نے دل ہی دل میں اپنے خیال سے انکار کیا اور چپ چاپ اس کا چہرہ دیکھتی رہیں۔



ماضی یاد دلانے والا موسم ہے
کیسا دل تڑپانے والا موسم ہے
یہ بارش سرما کی پہلی بارش ہے
یہ آنکھیں چھلکانے والا موسم ہے
بوندوں کی بوچھاڑ سے ناحق بچتے ہو
یہ تو آگ لگانے والا موسم ہے
آج انگیٹھی کے آگے چپ بیٹھا ہوں
تیرے خطوط جلانے والا موسم ہے
موسم تو یوں جانے کتنے گزرے ہیں
یہ تیری یاد کے جانے والا موسم ہے

ٹین کی چھت پہ بارش کی بوندوں نے شور مچایا ہوا تھا۔ تڑ، تڑ، تڑ...... موٹی موٹی بوندوں کی آواز ایک ساز کے بجنے کا احساس دلا رہی تھی اور اسی بارش کی انہی بوندوں کی آواز سرخ اینٹوں کی دیواروں پہ پڑتی تو الگ آواز نکلتی۔ کچے فرش پہ پڑتی تو الگ آواز آتی۔ گھاس اور پودوں کے تن پہ پڑتی تو ایک نرم و ملائم سی آواز نکلتی، تارکول کی پکی سڑک پہ پڑتی تو ایک الگ انداز ہوتا۔

ہر ایک چیز سے بارش کی گفتگو کا الگ انداز ہے۔ ہر چیز سے بارش کی باتوں کا

الگ اندازِ گفتگو ہے۔ کہیں پڑتی ہے تو شور مچتا ہے، کہیں پڑتی ہے تو پیار بھرا ملائم احساس دلاتی ہے۔ لہلہاتی بیلیں، پھول، پودے، درخت الگ زبان میں بات کرتے ہیں۔ چڑیوں، ابابیلوں، کونجوں، طوطوں، کبوتروں اور ہر طرح کے پرندے بارش سے اپنے اپنے انداز میں گفتگو کرتے ہیں۔

بارش ہماری آگے پھیلائی ہوئی ہتھیلیوں پہ پڑتی ہے تو الگ احساس و انداز میں بات کرتی ہے۔ سچ، یہ بارش کتنی خوشگوار اور حیرت انگیز ہوتی ہے۔

ہلکے بادلوں سے بھرے آسمان کے نیچے اپنے کمرے کی بالکنی میں بیٹھی مہر النساء اپنی ماں کی پرانی اور بوسیدہ ڈائری کو پڑھے جا رہی تھی۔ پرانے کھنڈر میں دفنائی یادوں کو کرید کرید کر پڑھے جا رہی تھی۔ گزشتہ دو دنوں سے اس کا یہ مشغلہ تھا۔ اس نے پچھلے دو دنوں میں صرف یہی کام کیا تھا۔ اس پہ کئی طرح کے انکشافات ہوئے تھے جن سے وہ انجان تھی۔ یہ انکشاف اس کے لئے اہم بھی تھے اور غیر اہم بھی۔

ڈائریاں پڑھنے کے بعد وہ سوچ رہی تھی کہ کاش وہ کچھ چیزوں سے انجان رہتی۔ کاش کچھ بھید اسی طرح بھید ہی رہتے۔ کچھ کشف اسی طرح، اسی مقفل الماری اور جالے زدہ کمرے میں دفن رہتے۔ مہر النساء کے اوپر یہ انکشاف حیرت انگیز اور کچھ حد تک اذیت ناک بھی تھا کہ اس کی ماں زیب کا تعلق لاہور کے ریڈ لائٹ ایریے سے تھا۔ مشہور نائیکہ تبسم عرف مینا بائی تھی، زیب اس کی بیٹی تھی لیکن زیب نے اس گندگی میں رہنے سے بہتر سمجھا کہ وہ ماں سے بھاگ نکلے۔ اور اٹھارہ برس کی عمر میں وہ وہاں سے نکل آئی اور کسی سہیلی کے گھر پناہ لی۔ اس سہیلی کا باپ فلم پروڈیوسر تھا جس کے توسط سے زیب نے پہلی فلم میں اداکاری کی اور گلوکاری کا سفر اس طرح شروع ہوا کہ اس کا اختتام سردار واجد سے شادی اور مہرو کی پیدائش پہ ہوا۔ اور شادی کے بعد زیب نے اپنی والدہ اور سبھی رشتہ داروں سے ناتہ توڑ لیا اور سردار صاحب کی ہو کے رہ گئی۔ اداکاری کو خیر باد کہا اور ننھے منے بچوں کی پرورش پہ دھیان دینے لگی۔

آسمان سے ہلکی ہلکی بوندیں برسنا شروع ہو گئیں۔ مہر النساء نے پرانی ڈائری کے دیمک زدہ ورق کو پلٹا۔ ایک اور ماضی کی تحریر اس کے سامنے تھی۔

''ساون کی بارشیں شروع ہو چکی ہیں۔ میں اپنی سہیلی فاریہ کے گھر مقیم ہوں۔

فاریہ بہت اچھی دوست ثابت ہو رہی ہے۔ اس کے ابو نے بھی میری کافی مدد کی ہے۔ مجھے اپنی فلم میں ہیروئن کاسٹ کر کے ناتجربہ کار اور نو عمر لڑکی کو فلم میں لیڈنگ رول دینا اپنے آپ میں بہت بڑا رسک ہے۔ لیکن خاور انکل میری بھرپور مدد کرنا چاہتے ہیں۔ میں فاریہ کو باقاعدگی سے کمرے کا کرایہ بھی دے رہی ہوں۔ میں اس کے اوپر کسی قسم کا بوجھ نہیں ڈالنا چاہتی۔ فی الحال ایک پرائیویٹ اسکول میں پڑھا رہی ہوں، سات سو روپے تنخواہ پہ۔ تنخواہ معقول ہی ہے اور پھر میری کون سی ضرورتیں زیادہ ہیں۔ فلم کا کام شروع ہو گا تو شاید اچھے پیسے آ جائیں اور پھر اپنا گھر لے لوں گی۔ عزت کی روٹی تو ہو گی۔ یوں بھی ذلت کی زندگی سے عزت کی موت بہتر سمجھتی ہوں۔ ہیرا منڈی کے در و دیوار میں گھٹ گھٹ کے سانس لینے سے بہتر ہے کہ میں بنا کسی چھت کے فٹ پاتھ پہ سو کے کھل کے سانس لے سکوں۔ آج اتنے عرصے بعد بارش کا روپ کھل کے دیکھا ہے کہ یہ بارش بھی ہیرا منڈی کی گلیوں اور چوباروں پر ڈر ڈر کے گرتی ہے۔ ناشناسائی اور بیگانگی سے برستی ہے۔ فاریہ کے گھر کے صحن میں اس بارش کا روپ ہی الگ ہے۔''

تحریر کے اختتام پہ مہر النساء نے ایک لمبی سانس کھینچی۔

''کس قدر کٹھنائیوں کا سامنا کیا ہے میری ماں نے۔ اتنی کمسن عمر میں رسم و رواج کی دلدلوں سے نکل آنا، کھلے عام بغاوت کرنا، شاید ہر لڑکی یہ نہیں کر سکتی۔ ان حوصلوں کو خراج ہے جو دیے کی کمزور لو دیکھنے کے باوجود بھی تن تنہا آندھیوں کے سامنے سینہ تان کے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ٹوٹتے ہیں مگر خود کو بکھرنے نہیں دیتے۔ ریزہ ریزہ ہونے نہیں دیتے۔ امی! آپ کی روح جہاں کہیں بھی ہے، خدا کرے سکون پائے، مغفرت پائے۔'' مہر النساء نے دل سے دعا کی اور بارش کی بوندوں کو دیکھنے لگی۔



کھڑکی میں بیٹھی ہوئی بالی کو ٹھنڈی ہوا کے جھونکے نے زور سے چھوا اور اس کے چہرے پہ سرمئی اور سفید بالوں کی لٹیں بکھر بکھر گئیں۔ اُس نے یادوں کے کسی پل سے چونک کے آسمان کی جانب دیکھا جو کہ کالی گھٹاؤں سے مکمل طور پہ ڈھکا تھا۔ غروب کے بعد کا وقت تھا اور بادلوں کے بیچ سے کہیں کہیں گڑگڑاہٹ کی آواز یا بجلی کی چمک

بھی نظر آ رہی تھی۔ اس کے چہرے پہ آئے اضطراب میں لمحہ بھر کو کمی آئی اور پھر وہ چہرہ کھوسا گیا اور دماغ یادوں کا جالہ سا بُننے لگ گیا۔

اسی کمرے کی کھڑکی کے عین سامنے لگی کھڑکی میں ثمین کھڑی اس چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ وہ چہرہ جو انجانا بھی لگتا تھا، جانا پہچانا بھی۔ یونانی دیوتاؤں کے مجسموں جیسا جامد بھی لگتا تھا اور بولتی تصوروں کی طرح کہانیاں کہتا ہوا بھی۔ اس خاموش چہرے پہ لکھی تحریر پڑھنے والے کی آنکھ سے چھپتی نہ تھی بلکہ اسے اور سوچنے پہ مجبور کرتی تھی۔

''امی! کھڑکی دروازے بند کر لیں۔ شاید بہت زور کی بارش کا امکان ہے۔''

چائے کے دو مگ ٹرے میں ڈالے شہرین اندر کمرے میں آئی اور والدہ کو کھڑکی میں گم سم کھڑا دیکھ کے بولی۔

''بیٹا! اس موسم کی بارش تو موسم میں خوشگوار تبدیلی کا باعث بنتی ہے۔ کھڑکی دروازے سے ٹھنڈ اندر آئے گی تو روح سیراب ہو گی۔'' ثمین نے مسکرا کے بیٹی کی طرف دیکھا۔

''کیا دیکھ رہی ہیں اتنی توجہ اور گہری سوچ کے ساتھ؟'' چائے کا مگ ماں کے ہاتھ میں تھما کے شہرین نے پوچھا۔

''تم بھی دیکھو۔ سامنے والا منظر شاید تمہیں بھی سوچنے پہ مجبور کر دے گا۔'' ثمین نے کہا۔ شہرین نے باہر دیکھا۔

''برستی بارش، ہوا کے زور سے چلنے والی آواز، ہلتے جلتے درخت، شاں شاں کرتی شیشے کی کھڑکیاں اور بہتا ہوا پانی۔'' شہرین نے پوچھا۔

''اور ان سب چیزوں سے زیادہ فکر میں مبتلا کرنے والی دو اُداس اور ویران آنکھیں اور چہرہ۔ جو کبھی تصویر تو کبھی کہانی محسوس ہوتا ہے۔'' ثمین نے بالی کی طرف اشارہ کیا۔ شہرین نے چائے کا گھونٹ بھر کے اثبات میں سر ہلایا۔

''ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔ ان خاموش آنکھوں نے اوّل دن سے مجھے سوچ میں مبتلا کر رکھا ہے۔ نجانے کن تکالیف سے گزری ہے یہ عورت۔ نجانے کیا کہانی ہے اس کی۔ نجانے کون ہے یہ؟'' شہرین نے کہا۔

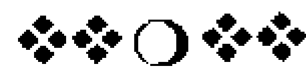
''پتہ نہیں کیوں شہرین! مجھے یہ چہرہ جانا پہچانا لگتا ہے۔ مانوس اور آشنا محسوس ہوتا

ہے۔ پتہ نہیں یہ چہرہ میں نے کہاں دیکھا ہے۔ لیکن جب سے میں نے اس چہرے کو دیکھا ہے، میں سوچ میں مبتلا ہو گئی ہوں۔'' چائے کے کپ کے ساتھ ہی ثمین ساتھ رکھی راکنگ چیئر پر بیٹھ گئیں۔ شہرین کھڑکی سے ٹیک لگائے باہر دیکھ رہی تھی۔

''کچھ چیزوں کو دیکھ کے یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ مانوس ہیں۔ ہم ان سے پہلے بھی مل چکے ہیں۔ اس میں کوئی انوکھی بات تو نہیں امی!''

''میں بھی یہی جواز اپنے دل کے سامنے پیش کرنے کی کب سے کوشش کر رہی ہوں۔ مگر کیا کروں، میرا دل مانتا ہی نہیں۔ شہرین! میں نے ایک بار ہی سہی، اس چہرے کو دیکھا ضرور ہے۔ شاید کسی بھیڑ میں...... شاید کسی تصویر یا خواب میں۔ لیکن میں اس چہرے کو جانتی ضرور ہوں۔'' ثمین کے لہجے میں گہرائی تھی۔

''ریلیکس کریں امی! اگر آپ نے اسے دیکھا ہو گا تو ضرور آپ کو یاد آ جائے گا۔ ٹیک اِٹ ایزی۔'' شہرین نے تسلی دی۔



''زین بابا! وزیٹر روم میں بیٹھے آپ کا انتظار کرتے ہوئے مجھے دو گھنٹے سے اوپر وقت گزر گیا اور آپ اب آئے ہیں۔ جب کہ اسکول کے وقت کو ختم ہوئے چار گھنٹے ہو گئے ہیں۔ آپ چھٹی کے بعد ہاسٹل واپس نہیں پہنچے اور آپ کا موبائل فون بھی آپ کے کسی دوست کے پاس تھا۔''

پریشانی سے کتنی دیر سے بیٹھے وارث نے اپنے سامنے بیٹھے زین سے پوچھا جو ایک ہی ماہ کے عرصے میں بہت دُبلا اور کمزور نظر آ رہا تھا۔

''وارث بھائی! میں اپنے ایک ٹیچر سر ظفر کے ساتھ ان کے گھر گیا تھا اور میں ان سے میتھس کی ٹیوشن لیتا ہوں۔'' زین نے نظریں جھکا کے جواز پیش کیا۔

''ٹیوشن؟...... لیکن اس کا ذکر آپ نے پہلے تو نہیں کیا۔'' وارث نے کھوجتی نگاہوں سے دریافت کیا۔

''بھول گیا تھا۔'' وہ بولا۔

''کتنی فیس دیتے ہیں آپ اس ٹیوشن کی؟''

''سر ظفر مجھے اور کچھ دوسرے لڑکوں کو مفت میں پڑھاتے ہیں۔'' زین نے

جواب دیا۔

''مفت میں؟........آج کل کوئی انسان بنا اپنے کسی فائدے کے مفت میں نہیں پڑھاتا۔آپ کے یہ ٹیچر کیا آسمان سے اُترے ہیں؟'' وارث کو تشویش ہو رہی تھی۔

''آپ ان کے متعلق کچھ نہ کہیں وارث بھائی! وہ بہت اچھے ہیں۔ بہت پیار کرتے ہیں۔ گھر سے دور آئے مجھ جیسے بچوں کو دوستی کا سہارا دیتے ہیں۔'' زین کی اندر دھنسی ہوئی آنکھوں میں سرظفر کے لئے ایک مخصوص چمک تھی۔

کچھ لمحے وارث نے اُس تیرہ سالہ کچھ معصوم اور قدرے عجیب لڑکے کو دیکھا۔

''مل سکتا ہوں میں آپ کے سرظفر سے؟''

زین کے چہرے پہ ہلکی سی پریشانی کی لہر کوندی۔

''آپ جب سے آئے ہیں، اُلٹے سیدھے سوال کئے جا رہے ہیں۔ آپ نے مجھ سے پوچھا بھی نہیں کہ میں کیسا ہوں؟'' زین خفا ہوا۔ وہ بہت صفائی سے بات بدل چکا تھا۔ وارث نے اپنے چہرے اور لہجے میں ذرا سی نرمی پیدا کی۔

''زین بابا! آپ مجھے غلط نہ سمجھیں۔ میں اتنی دور سے آپ سے ملنے آیا ہوں بنا اطلاع کے۔ میں تو سرپرائز دینا چاہتا تھا لیکن آپ کی کوئی خبر نہ پا کر مجھے گہری تشویش ہوئی۔'' وارث نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پہ رکھا۔

''دیکھیں، آپ ابھی چھوٹے ہیں، یہاں اکیلے ہیں، اس طرح ہر کسی کی بات مان کے اس کے گھر چلے جانا ٹھیک بات نہیں ہوتی۔ ہمیں آپ پہ تو اعتبار ہے مگر باہر کی دنیا پہ نہیں۔ اور موبائل فون آپ کو آپ کے رابطے کے لئے دیا گیا ہے، اسے اپنے ساتھ رکھیں۔ آپ کوئی معمولی بچے نہیں۔ منسٹر کے بیٹے ہیں، خاص بچے ہیں۔ آپ کی سکیورٹی لازمی ہے۔'' وارث نے اسے سمجھایا۔ زین خاموش بیٹھا سنتا رہا۔

''آئندہ آپ کو شکایت نہیں ہوگی۔'' وہ بولا۔

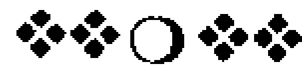
''یہ ہوئی نا سرداروں والی بات........ میں آپ کے لئے کچھ چیزیں لایا ہوں۔ اور آپ کی آپی نے بھی ایک تحفہ بھیجا ہے۔'' وارث نے دو تین شاپر اس کے سامنے رکھ دیئے۔ اس نے ایک سرسری نظر ان پر ڈالی۔

''کیسی ہیں مہرو آپی؟........اور بابا؟''

''سب ٹھیک ہیں........مہرو آج کل لاہور میں ہیں۔ میں کل کراچی پہنچوں گا، آپ کے بابا کے پاس۔ آپ سے مل کے جانا ضروری سمجھا۔ آپ اتنے کمزور کیوں ہو گئے ہیں زین؟........کیا کھانا پینا ٹھیک نہیں ملتا یہاں؟ حالانکہ یہاں کا موسم بھی ٹھنڈا ہے۔ پھر آپ کی رنگت کیوں کملا گئی ہے؟''

وارث گاہے بگاہے کئی سوالات کرتے رہے جن سے زین کو اُلجھن ہو رہی تھی اور وہ فقط ہوں، ہاں میں جواب دیئے جا رہا تھا۔

وارث اس کی آنکھوں میں کچھ الگ دیکھ رہے تھے۔ ان کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجنی شروع ہو گئی تھی۔ ان کے دل میں اُٹھی تشویش گہری ہو رہی تھی۔



مہندی والی رات تھی۔ رسم کے شور ہنگامے کی آوازیں پائیں باغ کے اس کونے میں بھی آ رہی تھیں جہاں شائل اپنے کزن اور دوست عاصم کے ہمراہ بیٹھا تھا۔ دونوں کے ہاتھ میں چائے کی چھوٹی چھوٹی پیالیاں تھیں۔ ٹھنڈی ہوا اعصاب کو مسحور کن احساس دے رہی تھی۔ قمقموں اور بتیوں سے سادہ مگر خوبصورت سا کمرہ سجا ہوا تھا۔

''ایگزام کے بعد کیا ارادے ہیں تمہارے؟'' عاصم نے چائے کا چھوٹا سا سپ لے کر کہا۔

''ابھی تو دو سال باقی ہیں بھائی میرے۔ اس کے بعد بھی لمبا سفر ہے۔ اس فیلڈ کو لمبی مسافت اور کمٹ منٹ کی ضرورت ہوتی ہے۔'' شائل نے کہا۔

''میں تم سے شادی کے ارادے کے متعلق پوچھ رہا ہوں۔ شہر کی کوئی کُڑی شُڑی دیکھی، پٹائی یا پھر ابھی تک ہماری طرح پھر رہا ہے، آوارہ بادل۔'' عاصم نے آنکھ مار کے پوچھا۔ شائل مسکرا دیا۔

''کچھ نہیں ان شہر کی کُڑیوں میں، مان میری بات، سالی اوّل نمبر کی جھوٹی ہوتی ہیں۔ چہروں پہ جس طرح میک اپ لیپتی ہیں اسی طرح سیرت کے بھی دو منہ ہوتے ہیں۔ ایک ظاہری، ایک باطنی۔ ظرف تو ہوتا ہی نہیں ان میں۔'' شائل کے چہرے کے تاثرات اس کی زبان کا ساتھ دے رہے تھے۔

''نہیں یار! یہاں ہم چھوٹے شہروں اور دیہاتوں کے لڑکے بیٹھے ٹھنڈی آہیں

بھرتے رہتے ہیں کہ کسی شہر کی لڑکی کا چہرہ ہی دیکھنے کو نصیب ہو جائے اور تم کہتے ہو کہ تمہیں ان میں کچھ نظر نہیں آتا ہے۔ عجیب آدمی ہو تم یار!''

''یار میرے! دُور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں۔ جب گلے پڑتے ہیں تو سمجھ آتی ہے۔ یقین کر میرا۔'' شائل نے چائے ختم کر کے پیالی میز پر رکھ دی۔

''میں جانتا ہوں، تیری نظر میں کیا سمایا ہے جس کی وجہ سے تمہیں کچھ نظر نہیں آ رہا ان گڑیوں میں۔'' عاصم نے اپنی شکل شریر بنانے کی کوشش کی۔

''کیا سمایا ہے میری آنکھوں میں؟'' شائل نے چشمے کے اندر سے اپنی آنکھوں کی چوری چھپانے کی کوشش کی۔

''جانتا ہوں تجھے میرے بھولے! بچپن سے۔ تین سال بڑا ہوں تجھ سے، لیکن تجربہ تین سال پرانا ہے۔ کیا میں دیکھ نہیں سکتا کہ تیرے کیمرے کے رول کی آدھی سے زیادہ تصویریں کس کی بنی ہیں؟ اور تیری آنکھیں ہر وقت کس کو کھوجتی رہتی ہیں؟'' عاصم کچھ زیادہ ہی اندازے لگانے کے موڈ میں تھا۔

''مجھے تیری کوئی بات سمجھ نہیں آ رہی۔'' چور کی داڑھی میں تنکا کی مصداق شائل گھبرائے جا رہا تھا۔

''تیری میم ماہا تیرا ننھا سا دل لے اُڑی ہے۔'' عاصم نے گویا دھماکا ہی کیا تھا۔

وہ راز جو عرصے سے فقط شائل علی کے اپنے دل کے مضبوط حصار میں دفن تھا، وہ راز یکایک فضا میں اُجالا پھیلا کر تحلیل ہو گیا۔

ننھی سی چنگاری نے ہر سُو لو سی پھیلا دی تھی۔

''کیا کہہ رہا ہے تُو یار!...... تُو نے یہ سوچ بھی کیسے لیا؟'' شائل نے بات بدلنے کی کوشش کی۔

''ہمیں نہ بناؤ میرے بھائی! ہم اُڑتی چڑیا کے پَر گننے والوں میں سے ہیں۔ آنکھوں آنکھوں میں لکھی اور پڑھی جانے والی داستانیں پڑھ لیتے ہیں۔ ہمارے پاس بڑی بڑی ڈگریاں نہ سہی، دل کی آنکھیں تو ہیں۔'' عاصم نے ہوشیاری سے کہا۔ شائل خاموش رہا۔ پھر کچھ سوچ کے بولا۔

''وہ میری پروفیسر ہیں یار! میں ایسا سوچ بھی کیسے سکتا ہوں؟''

''کم از کم تمہارے اس چشمے کے پیچھے چھپی تمہاری آنکھیں تمہارا ساتھ نہیں دے پا رہیں۔ جھوٹ بولنا ہے تو یہاں بہت لوگ ہیں۔ مجھ سے نہ بول۔ تجھے بچپن سے جانتا ہوں اور تمہاری ان ننھی سی معصوم آنکھوں میں چھپی محبت کو بھی دیکھ سکتا ہوں۔'' عاصم نے مسکرا کر کہا۔ شائل خاموشی سے کبھی خلا میں تو کبھی عاصم کے چہرے پہ دیکھنے لگا۔

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا شائل......؟'' عاصم اب اس کی آنکھوں میں جھانک کے کہنے لگا۔

''ہاں یار! مگر یہ خواب بہت مشکل ہے۔ بہت انہونا سا۔ نجانے یہ خواب میری آنکھوں میں کیوں پیدا ہوا ہے؟'' شائل کا لہجہ اُداس تھا۔

''اس طرح کے خواب آنکھوں میں خود بخود پیدا ہوتے ہیں میرے دوست! کوئی خود پیدا نہیں کرتا۔ اور اس طرح کے خوابوں پہ کوئی اختیار بھی نہیں ہوتا۔ اور تم چاہو بھی تو ان خوابوں کو بڑھنے سے روک نہیں پاؤ گے۔'' عاصم نے کہا۔

''کیا کروں یار! کچھ سمجھ نہیں آتا۔'' شائل نے اُداسی سے کہا۔

''میری مان تو اُسے بتا دے۔''

''کیا...... کیا کہہ رہا ہے؟'' شائل حیران ہوا۔

''ہاں...... صحیح کہہ رہا ہوں۔ بتا دے اُسے۔ کم سے کم دل سے یہ احساس تو جائے گا کہ تم نے پہلی بار کسی سے محبت کی اور اسے نہیں بتایا۔ زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا، وہ منع کر دے گی نا؟ تو تمہاری قسمت۔ لیکن اس طرح احساسِ جرم تو دل میں سر نہیں اٹھائے گا نا۔ چھپانے سے بتا دینا بہتر ہوتا ہے۔ دل کی لگی دل ہی کے حوالے کرنے سے اس کا حق ادا نہیں ہوتا۔ کچھ چیزیں قسمت کے حوالے بھی کر دینی چاہئیں۔'' عاصم نے اس کے ہاتھ کے اوپر ہاتھ رکھ دیا۔

شائل ذہنی طور پر مطمئن ہو گیا۔ دل میں نئے ارادے پیدا ہو رہے تھے۔ نئی خواہشیں سر اٹھا رہی تھیں۔ نئی امیدوں کے نویلے چراغ زندہ ہو رہے تھے۔



''فاریہ کے گھر رہنا ایک طرح سے دشوار ہوگیا تھا۔ اور وجہ تھی اس کی سوتیلی ماں، جو بار بار فاریہ کے والد اور میرے کردار پہ الزام تراشی کیا کرتی تھی۔ پہلی فلم کی ریلیز کے بعد یوں بھی میرا گھر بدلنے کا ارادہ تھا لہٰذا میں ایک ہاسٹل میں شفٹ ہوگئی ہوں۔ یہ ہاسٹل ورکنگ ویمن ہاسٹل ہے۔ یہاں نوکری پیشہ شادی شدہ و غیر شادی شدہ خواتین رہتی ہیں۔ کچھ اچھی ہیں اور کچھ روایتی عورتوں کی طرح تنک چڑھی اور سرکش۔ فاریہ اکثر مجھ سے ملنے یہاں آجاتی ہے۔

پہلی فلم کے بعد میں نے طے کیا ہے کہ فلم انڈسٹری کو خیرباد کہہ دوں گی اور ڈراموں میں منتخب کردار ادا کروں گی۔ بڑے پردے کا بڑا پروپیگنڈہ شاید میں برداشت نہیں کر پاؤں گی۔

لاہور سے بالی اور کاکا جان کا خط آیا تھا۔ وہ مسلسل مجھے اپنے پاس بلانا چاہتے ہیں اور منت سماجت کے بعد دھمکیوں پہ اتر آئے ہیں۔ ان کے خیال میں ہیرامنڈی سے بھاگ کے میں کہیں نہیں جاسکتی اور فلم انڈسٹری بھی دوسری طرح سے ہیرامنڈی ہی ہے۔ یہاں بھی ناچ گانا ہوتا ہے، لڑکیوں کا مول لگتا ہے اور خریداری ہوتی ہے۔ لیکن میں یہ زندگی ہیرامنڈی کی زندگی سے لاکھ گنا بہتر سمجھتی ہوں۔ ریاکاری اور کھوٹ کہاں نہیں ہوتی؟ کم از کم عزت تو ہے۔ اپنی کمائی کی روٹی کھانے کا دل تو کرتا ہے نا۔''

تحریر کے اختتام پر مہرالنساء کے دل میں اِک سوز اُتر گیا۔ کتنا پُرسوز تھا اس کی والدہ کا دل۔ کتنی صعوبتیں تھیں اس ماضی میں۔

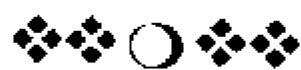
وہ اپنے بستر سے اُٹھی، ڈائری ٹیبل پہ بند کر کے رکھ دی اور الماری سے نکالی ہوئی والدہ کی ساڑھیاں دیکھنے لگی جن میں ابھی تک اِک مہک، اِک بوسیدہ سی خوشبو رچی

بسی تھی۔ شاید یہ خوشبو کسی پرانے پرفیوم کی تھی، یا پھر کسی گداز جسم کی یا پھر صاف شفاف خیالات کی۔

'خوشبوئیں کیوں زندہ رہتی ہیں؟........خوشبوئیں انسانوں کی طرح مر کیوں نہیں جاتیں؟ فنا کے گھاٹ کیوں نہیں اُترتیں؟........سترہ سال تک تو زمین میں دفنائے انسان کی ہڈیاں تک گل جاتی ہیں، پھر یہ بائیس سال پرانی خوشبو کیوں ابھی تک ان ملبوسات میں زندہ ہے؟........کیا ہے اس خوشبو میں جو منفرد ہے، انوکھا ہے، جو رُوح کو اُداس کر دیتا ہے، چھلنی کر دیتا ہے احساسات کو، تار تار کر دیتا ہے تخیلات کو؟' لمحہ بھر کو اس نے سوچا۔

'اگر میری ماں ہیرامنڈی کی زندگی سے فرار حاصل نہ کرتی تو کیا ہوتا؟........کیا ہیرامنڈی کی فضا میں یہ خوشبو زندہ رہ سکتی تھی؟........کیا یہ خوشبو ہیرامنڈی کے لئے تھی؟ کیا یہ خوشبو ہیرامنڈی کی پیداوار ہوسکتی ہے؟........نہیں، نہیں، نہیں۔' مہرالنساء نے زور زور سے نفی میں گردن ہلائی۔

'میری ماں کا کوئی رشتہ نہیں ہوسکتا ہیرامنڈی سے۔ یہ خوشبو تو........ یہ خوشبو تو تقدس کی خوشبو ہے........ سچائی کی، معصومیت کی خوشبو ہے، نیک نیتی کی خوشبو ہے۔ رات کی رانی کی طرح مسحور کن اور موتیے کے پھولوں کی جیسی تازگی پہنچانے والی خوشبو ہے۔ جیسے کسی غریب کے گھر پیدا ہوئی بیٹی کے معصوم خوابوں کی خوشبو ہوتی ہے۔ یا کسی کم عمر شہزادی کی خواہشوں کی خوشبو ہوتی ہے۔ یہ قطعاً ہیرامنڈی کی پیدائشی کسی لڑکی کی خوشبو نہیں ہوسکتی........ یہ ریاکاری کی خوشبو نہیں، یہ جھوٹ کی، کاروبار کی خوشبو نہیں۔ یہ تو گیلی کچی مٹی کی خوشبو ہے جو یا تو پودا لگاتے وقت نرم نرم زمین کو کھودنے سے آتی ہے یا پھر نومولود بچے کے کمسن جسم سے۔ نہیں، نہیں، نہیں........ اس خوشبو کا گھنگھروؤں کی چھن چھن سے، گجروں کی لڑیوں سے، مے خانے کے پیالوں سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ خوشبو گنگا بائی، جمنا بائی کی خوشبو نہیں۔ میری ماں کی خوشبو ہے یہ........ اور یہ میری ماں کا تعلق ہیرامنڈی سے ہرگز نہ تھا........ میں کبھی یقین نہیں کر سکتی اس بات پہ۔' مہرالنساء خود کلامی کی کیفیت میں تھی۔



وارث نے آنے کے بعد سردار صاحب میں یہ تبدیلی پہلے ہی محسوس کر لی۔ ان کے ذکر کرنے سے بھی پہلے وہ چوہدری ساجد کے لئے دل میں نرم گوشہ بیدار کر چکے ہیں۔ الیکشن سے پہلے وہ جس نام کو سننا گوارا نہیں کرتے تھے اور اب وہی نام ان کے کم وبیش ہر موضوع کے بعد آنے لگ گیا تھا۔

مارننگ واک کے بعد وہ اخبار کا مطالعہ کرتے ہوئے چائے پی رہے تھے اور وارث کچھ فیکٹری میٹرز ان سے ڈسکس کرنا چاہتا تھا اور انہی میٹرز کے درمیان ہی کسی طرح چوہدری ساجد کا ذکر نکل آیا۔

''بہت عرصے بعد میں چوہدری کے گھر گیا تھا۔ حالانکہ جب اس نے مجھے دعوت دی۔ میں جانا تو نہیں چاہتا تھا لیکن اچھا کیا کہ چلا گیا۔''

''سردار صاحب! گستاخی معاف۔ لیکن چوہدری ساجد سے متعلق آپ کو اس قدر نرم اور خوش فہم نہیں ہونا چاہئے۔ اسے آپ کم وبیش بیس بائیس برس سے واقف ہیں۔'' وارث نے ذرا ڈرتے ڈرتے کہا۔

''پچیس برس پرانا دوست ہے وہ میرا۔ سکول، کالج، یونیورسٹی، ہاسٹل اور پھر بزنس اور پولیٹیکل کیریئر۔ اور یوں بھی اس کا اور میرا کوئی ذاتی تضاد نہیں ہے۔ بس جہاں دو ایک طرح کے ذہین اور باشعور افراد ہوں تو وہ حریف بن ہی جایا کرتے ہیں۔ اگر اس نے خود ہاتھ بڑھا کے دوستی کی ابتداء کی ہے تو میرا خیال ہے اعلیٰ ظرفی اسی میں ہے کہ اس کی دوستی قبول کر لی جائے۔'' سردار صاحب نے چشمے کے اوپر سے وارث کے چہرے کو دیکھا جو سپاٹ تھا۔

''لیکن سردار صاحب......!''

''تم ماؤں کی طرح میری فکر کرنا چھوڑ دو خان! میں تم سے چھوٹا نہیں، بڑا ہوں۔ یہ بتاؤ کہ مہر النساء اور زین کیسے ہیں؟'' سردار صاحب نے مسکرا کے پوچھا۔

''زین بابا بالکل ٹھیک ہیں۔ ذرا سے دُبلے محسوس ہو رہے تھے۔ شاید آب و ہوا اور کھانے کی تبدیلی ان کی صحت پہ اثر انداز ہوئی ہے۔ اور مہرو بی بی سے میری واپس آنے کے بعد کوئی بات نہیں ہوئی۔ ویسے وہ بہت خوش تھیں اس گھر میں۔''

''یہ تو خوشی کی بات ہے۔ مجھے تو وقت نہیں ملتا لیکن تم یاد سے دونوں کو فون کیا کرو

اور ضرورت پڑے تو پیسے بھی بھجوا دیا کرو۔''

''آپ بے فکر رہیں سردار صاحب! کم از کم ان دونوں کی طرف سے۔''

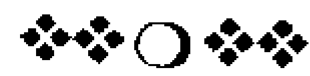
''تم پہ مجھے خود سے زیادہ اعتماد ہے خان!...... اچھا، ہم چلتے ہیں۔ آج ہماری پارٹی کے کچھ خاص افراد کے ساتھ میٹنگ ہے اور کل ایک پریس کانفرنس بھی ہے۔'' سردار صاحب اخبار تہہ کرتے ہوئے بولے۔

''شام کے کھانے پہ آپ کا انتظار کروں؟...... کل یوں بھی جمعہ کا دن ہے۔'' وارث نے پوچھا۔

''آج تو شاید میں نہ آسکوں ڈنر پہ۔ لیکن کل چوہدری ساجد نے ایک پارٹی ارینج کی ہے میرے الیکشن جیتنے اور ہماری دوستی کی تجدید کی خوشی میں۔ تم میرے ساتھ چلنا۔'' سردار صاحب نے اطلاع دی۔

وارث کے ذہن میں خطرے کی ایک اور گھنٹی بجی۔ سردار صاحب آگے بڑھ گئے۔

'اپنی ہار کی، اپنی شکست کی بھلا کون خوشی مناتا ہے؟' وارث نے خلاء میں دیکھتے ہوئے سوچا تھا۔



مہندی والی رات کے اگلے دن مایوں کا فنکشن تھا۔ ماہا مایوں والے فنکشن میں کچھ خاص شمولیت اختیار نہ کر سکی اور وجہ تھی ضحیٰ کا بخار جو کہ اچانک ہی شروع ہوا اور پھر ٹوٹنے کا نام نہ لے رہا تھا۔ کچھ موسم بھی بارش کے بعد ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ لہٰذا ضحیٰ کو بخار اور کپکپی شروع ہو گئی تھی۔ نزلہ تھا اور وہ کراہ رہی تھی۔

فنکشن کے اختتام پر ماہا کی تلاش میں شمائل یہاں وہاں دیکھنے لگا مگر اسے وہ کہیں نظر نہیں آئی تو وہ اس کی تلاش میں اوپر مہمان خانے کی طرف چلا آیا۔ ماہا اسے کمرے کے اندر ہی نظر آ گئی۔ ضحیٰ، ماہا کے پاس بستر پر لیٹی تھی۔ گلابی رنگ کا پھول دار کمبل اس کے اوپر تھا۔ ساتھ تپائی پہ بچوں کے بخار کا سیرپ بروفن اور کال پول رکھی تھیں۔ چھوٹا سا تھرمامیٹر تھا۔ شمائل نے ماہا کے پریشان چہرے کی جانب دیکھا اور ماہا نے بھی شمائل کی طرف دیکھا۔

''اندر آ سکتا ہوں؟''

"آجاؤ...... پوچھتے کیوں ہو؟" ماہا نے مسکرانے کی کوشش کی۔

شائل اندر آ کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"آپ کو نیچے فنکشن میں نہ پایا تو ذرا تشویش ہوئی۔ ورنہ اس سے پہلے تو آپ ہر فنکشن میں ایسے موجود ہوتی تھیں جیسے یہ آپ کے ہی گھر کا فنکشن ہے۔ سچ، اتنی اپنائیت، اتنے خلوص سے آپ نے یہ شادی اٹینڈ کی۔" شائل نے کہا۔

"ارے نہیں...... یہ میرے ہی گھر کا تو فنکشن ہے۔ سچ میں شائل! اتنی اپنائیت، اتنی محبت مجھے اور کہیں سے نہیں ملی۔ اور پھر جس گھر کی مائیں اور بہنیں اتنی محبت کرنے والی ہوں اس گھر کے فرزند تم جیسے لائق فائق ہوتے ہیں بے شک۔ اصل میں ضحیٰ کی طبیعت بہت خراب ہوگئی اچانک ہی۔ میں نے زری اور مینا کو بتا دیا تھا، وہ اوپر آ گئی تھیں۔ دوا پلائی تو ہے مگر بخار ٹوٹ ہی نہیں رہا۔ کپکپی بھی ساتھ ہے۔" ماہا نے ضحیٰ کے سلکی بال اس کے چہرے پر سے ہٹائے۔ پیشانی بخار کے باعث تپ رہی تھی۔

"تو آپ نے پہلے بتانا تھا۔ میرا ایک دوست ڈاکٹر ہے، اس کا گھر پاس ہی ہے۔ بلکہ ابھی میں اسے بلا کر لاتا ہوں۔" شائل اٹھنے لگا۔

"ارے نہیں۔ ابھی میں نے دوا پلائی ہے بخار کی جس کی وجہ سے سو گئی ہے۔ امید ہے کہ جلد ہی ٹوٹ جائے گا بخار۔ ابھی اس کے سینے پہ اور پیٹ پہ بام ملوں گی تو سانس بھی کھل کر لے سکے گی۔" ماہا نے تپائی سے وِکس کی چھوٹی بوتل اٹھائی۔

"لائیں، مجھے دیں۔ امی کہتی ہیں کہ میں بام بہت اچھی طرح ملتا ہوں۔ کچھ ایسے کہ مسیحائی کا احساس ہوتا ہے۔"

شائل نے اٹھ کے ماہا سے بوتل لی اور بیڈ پہ چڑھ کے بیٹھ گیا اور آہستہ آہستہ وِکس ملنے کی شروعات کی۔ پہلے پیشانی پہ ہولے ہولے ملنے لگا۔ ضحیٰ احتجاجاً ذرا سا کراہی، پھر کسمسا کے چپ ہوگئی اور شائل ہولے ہولے اس ننھی سی جان کے سینے پہ اور گردن پہ وِکس ملتا رہا۔ ماہا کے لئے یہ منظر بہت خوشگوار تھا۔ اس بات سے وہ کیسے انکار کرتی کہ وہ شائل کو پسند کرنے لگی تھی۔ شائل کا چہرہ اور اس کا نام اسے برسوں پرانی اپنی محبت کی یاد دلاتے تھے اور اسی یاد نے اِک اور چراغ روشن کیا تھا۔ شائل علی کی اپنی محبت کا چراغ...... جو کبھی پھڑ پھڑاتا تھا، کبھی لو دیتا تھا، کبھی روشنی کی کرن کی طرح

دل کی تاریکی میں بکھرتا تھا۔

"شائل! ایک بات پوچھوں؟...... مجھے امید ہے تم صحیح جواب دو گے۔" ماہا نے پوچھا۔

شائل نے ماہا کی جانب دیکھا۔ زرد رنگ کی چمکدار شلوار قمیض میں ذرا ذرا سی خشک ہوتی لپ اسٹک اور کاجل والی آنکھوں میں جہاں متفکر ممتا کے تاثرات بھی تھے اور کچھ الگ قسم کے احساسات بھی۔ اور وہ الگ قسم کے احساسات شائل کی خوش فہمی کے لئے بہت تھے۔

"جی پوچھیے...... کم از کم آپ کو نا اُمید نہیں کر سکتا میں۔"

"تم اتنی اچھی اچھی، محبت بھری نظمیں لکھتے ہو۔ محبت کے معنی کا ادراک رکھتے ہو، محبت کرنا جانتے ہو۔ سب کی اتنی کیئر کرتے ہو۔ کیا تمہاری آنکھوں میں اور دل میں کوئی چہرہ، کوئی نام ہے؟...... اگر ہے تو مجھ سے شیئر کر سکتے ہو۔" ماہا نے اپنائیت سے پوچھا۔

"میم! محبت بھری نظمیں لکھنا، محبوب کے انتظار کا حصہ بھی تو ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے مجھے کسی چہرے کی تلاش ہو۔ کوئی چہرہ ہو جو مجھے چاند کے ہالے میں دکھائی دیتا ہو اور جو اب تک میرے سامنے نہ آیا ہو۔" شائل نے وِکس لگاتے لگاتے کہا۔

"تمہارے گھر میں اتنی پیاری پیاری لڑکیاں ہیں۔ نادیہ، زری، مینا، شوخ چنچل، کم عمر۔ کیا ان چہروں میں سے کوئی چہرہ تمہاری آنکھوں کو نہیں بھایا؟" ماہا نے دوستانہ لہجے میں پوچھا۔

"یہ تو سب پاگل ہیں۔ دیوانی ہیں۔ ستاروں کو اوڑھنے اور چاند پہ رہنے کے خواب دیکھتی ہیں۔ ان کو تو مشکی گھوڑے پہ سوار ہو کے آنے والے کسی شہزادے کا انتظار ہے۔ اور کم از کم میں وہ شہزادہ نہیں ہو سکتا۔" شائل نے مسکرا کے کہا۔

"لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کسی ایک لڑکی کے تصور کا اور خوابوں کا شہزادہ ہو بہو تم جیسا ہو...... عین ممکن ہے کہ کوئی لڑکی تمہیں چاہتی ہو۔" ماہا نے مسکرا کے کہا۔

"ممکن تو سبھی کچھ ہے میم!...... چلیں زیادہ بحث نہیں کرتے۔ میں آپ کو

اطمینان دلاتا ہوں کہ میں اپنی فیلنگز آپ کے ساتھ مکمل طور پہ شیئر کروں گا۔ آج سے آپ میری راز دار ہیں۔" شمائل نے وِکس کی ڈبیا کا ڈھکن بند کیا اور ہتھیلی پہ رکھ کے ڈبیا اس کی جانب بڑھائی۔ ماہا نے مسکرا کے ڈبیا اس سے لے لی۔



ان آوازوں کے جنگل میں
میرے پَر باندھ کر اُڑنے کا کہتے ہو
رہا کرتے نہیں لیکن
رہائی کے لئے بینائی کو اِک جرم کہتے ہو
میری پلکوں کو سی کر
موسموں کو جاننے پہچاننے کی شرط رکھتے ہو
میرے پاؤں کی زنجیروں کی بے چہرہ صداؤں سے ڈرتے ہو
میری آزادیٔ پرواز کی خواہش کو
جنگل کے لئے آزاد کہتے ہو
میرے جذبوں کی کشتی کو جلاتے ہو
میرے افکار کے دریاؤں کو صحراؤں کا قیدی بناتے ہو
مگر سن لو
کوئی موسم ہو
حبس و جبر کا، صحرا کا، جنگل کا
یہ قیدی سانس لیتا ہے

مہر النساء کے موبائل پہ ایس ایم ایس کی بیپ ہوئی...... اُس نے اٹھ کر موبائل فون کو چیک کیا۔ وہ وارث کا میسج تھا۔ جس میں لکھا تھا۔

"کیسی ہیں آپ؟...... بہت دن ہو گئے آپ کی خیریت معلوم نہیں کی۔ امید ہے آپ کے صبح و شام خوبصورت گزر رہے ہوں گے۔"

مہر النساء ایس ایم ایس پڑھ کے مسکرا دی۔ پھر نیا ایس ایم ایس ٹائپ کرنے لگی۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔ لاہور کے صبح و شام واقعی خوب صورت ہیں۔ بس کسی کی

کی بہت محسوس ہوتی ہے۔"

پیغام پڑھ کر وارث کے ہونٹوں پر بھی ایک معنی خیز اور معصوم سی مسکراہٹ ٹھہر گئی اور وہ پیغام کا جواب لکھنے لگے۔

"کتنے اتفاق کی بات ہے کہ ہم بھی کسی اپنے کو شدت سے یاد کر رہے ہیں۔ ہر لمحہ، ہر پل اس کا چہرہ آنکھوں کے سامنے رہتا ہے۔"

"اچھا......کون ہے وہ خوش نصیب؟" مہرو کے بھیجے جواب پہ وارث کو شرارت سوجھی۔

"ہے کوئی خوبصورت، سمجھدار، اپنا اپنا سا ساتھی، جس کی باتیں، جس کے خواب دل ونظر سے جاتے ہی نہیں۔"

مہرو نے چہرے تک آئی لٹ کان میں اڑسی اور مسکرا دی۔ وہ وارث کا مطلب سمجھ گئی تھی مگر انجان بننا چاہتی تھی۔

"اگر اتنا ہی اسے یاد کر رہے ہیں تو ملنے چلے جائیں۔ یوں بھی آج کل بارشوں کا موسم ہے اور بارش دلوں میں یادیں نئے سرے سے زندہ کر دیتی ہے۔" وارث کو نیا ایس ایم ایس ملا۔

"صحیح کہا آپ نے۔ مگر کیا کریں، اس سال بارشوں میں؟ وہ ذرا شہر سے دور ہیں۔ یوں تو کئی سالوں سے ہم دونوں نے اس موسم کو ساتھ گزارا ہے۔ دُوری اسی سال آئی ہے۔"

"کیا اس دُوری کو مٹانے کا کوئی راستہ نہیں؟" یہ مہرو کا جواب تھا۔

"ہم اس دُوری کو عارضی طور پر نہیں، ہمیشہ کے لئے مٹانے کی کوشش میں ہیں۔"

وارث کا بھیجا جواب پڑھ کر مہرو کے چہرے پر حیا کی رنگت دوڑی۔

"کیا واقعی؟" مہرو کے سوال میں حیرت بھی تھی، خوشی بھی اور مزید جاننے کا تجسس بھی۔

"آپ نے جو پوچھنا ہے، آپ کھل کے پوچھ سکتی ہیں۔" وارث، مہرو کو مزید تنگ کرنا چاہ رہے تھے۔

"صاف صاف بتائیں نا وارث! کیا آپ نے ہمارے متعلق بابا سے کوئی بات

کی؟'' مہرو نے صاف صاف پوچھا۔

''ارادہ کر رہا ہوں۔ انشاء اللہ جلد ہی بات کروں گا۔ آپ اطمینان رکھیں اور اپنا خیال رکھیں۔'' وارث کا جواب آیا۔

''امید ہے آپ کی تیاری پوری ہو گی۔ تمام کیل کانٹوں سے لیس ہوں گے۔'' مہرو نے مسکراتے ہوئے ٹائپ کیا۔

''بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔ میں بالکل تیار ہوں۔ آج کل ذرا سردار صاحب زیادہ مصروف ہو گئے۔ جیسے ہی موقع ملا، میں ضرور ذکر کروں گا۔'' وارث نے جواب دیا۔

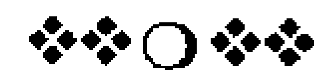
''میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔'' محبت بھرا ایک اور ایس ایم ایس وارث کے موبائل اسکرین پہ جگمگایا۔

''شکریہ۔''

''اپنا خیال رکھئے گا وارث! اور موقع ملتے ہی رابطہ کیجئے گا۔ میں آپ کے فون اور میسج کا انتظار کروں گی۔'' مہرو نے آخری پیغام ٹائپ کر کے موبائل فون سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

وارث بھی اس موبائل چیٹ سے کافی حد تک فریش اور مطمئن ہو گئے تھے۔ اور پھر محبت تھی۔ رابطوں کے لئے کوئی بھی راستہ ڈھونڈ لیتی تھی۔ آخر میں وارث نے ایک شعر مہرو کو بھیجا جسے پڑھتے ہی وہ خوشی سے جھوم اٹھی۔

''پھر دیے رکھ گئیں تیری پرچھائیاں
آج دروازہ دل کا کھلا دیکھ کر
تم جنہیں پھول سمجھے ہو آنکھیں نہ ہوں
پاؤں رکھنا زمیں پر ذرا دیکھ کر''



''جی ظفر حسین! چوہدری ساجد بول رہا ہوں۔'' چوہدری نے موبائل کے قریب سے بولتے ہوئے کہا۔

''جی چوہدری صاحب! کہیے، کیسے ہیں؟''

''میں تو ایسا ہی ہوں جیسا برسوں پہلے تھا۔ تُسی سناؤ کیا پروگرام ہے؟ مُنڈا ہتھ آیا کہ نہیں؟''

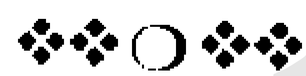
''جی ہاں......لڑکا ہاتھ آ گیا ہے مکمل طور پہ۔ میں نے اسے مفت میں ٹیوشن پڑھانی شروع کر دی ہے۔ دن کے دو سے تین گھنٹے وہ میرے ساتھ گزارتا ہے۔'' ظفر نے اطلاع دی۔

''ایہہ تو فیر واقعی پروگریس ہوئی۔ ڈوز شوز دینا شروع کیا کہ نہیں؟'' چوہدری مکاری سے مسکرایا۔

''چوہدری صاحب! ابھی تک تو میں اس کو ذہنی طور پہ اپنے سے قریب تر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا اعتماد اور یقین ہو گا میرے اوپر تو بات بنے گی۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ سے ڈوز دینے کی شروعات کروں گا۔'' ظفر نے کہا۔

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے......تو اپنا کام جاری رکھ۔ پیسے تجھے ملتے رہیں گے۔ بس اوہ مُنڈا ہتھوں نئیں چُھٹنا چاہیدا۔ کیا سمجھے؟ اوہ مُنڈا میرے واسطے ٹرمپ کارڈ اے۔'' چوہدری نے کمال عیاری سے ہنستے ہوئے فون بند کیا اور دیر تک اسی مکاری سے مسکراتا رہا۔

''تم میرے ہاتھ آ گئے ہو سردار! تمہارا مُنڈا بھی آ گیا ہے۔ اب رہ گئی تمہاری لاڈلی تو اس کی باری اب آئے گی۔'' اسی مکاری سے ہنستے ہنستے موبائل اُس نے ٹیبل پہ رکھا اور آئندہ کی پلاننگ کرنے لگا۔



یہ چوہدری ساجد کے لان کا منظر تھا۔

اس نے سردار واجد کے الیکشن جیتنے اور دوستی کی تجدید کی خوشی میں اپنے گھر پہ پارٹی دی تھی۔ اس پارٹی میں شہر کی تمام سیاسی اور مشہور کاروباری ہستیاں موجود تھیں۔ پارٹی پہ چوہدری نے کافی خرچہ کیا تھا۔ باوردی ویٹر ٹرے میں مختلف سافٹ ڈرنکس سجائے ارد گرد گھوم رہے تھے۔ کشادہ اور وسیع لان میں سلک کی چادروں والی کرسیاں سجی ہوئی تھیں اور گول میزیں تھیں۔ ہلکی ہلکی موسیقی کا مسحور کن جادو بھی تھا۔ سجی سجائی سیاستدانوں کی بیویوں کے کھوکھلے قہقہے بھی تھے اور مہنگے ترین ملبوسات اور زیورات کی

نمائش تھی۔

وارث بھی نہ چاہتے ہوئے اس پارٹی میں آیا تھا کہ وہ سردار صاحب کا بایاں ہاتھ سمجھا جاتا تھا۔ لیکن وہ اس بناوٹی اور گھٹن بھری فضا میں خود کو ان فٹ محسوس کر رہا تھا۔ نجانے کیوں اس کے چاروں طرف خطرے کی گھنٹیاں بجتی محسوس ہو رہی تھیں۔ چوہدری ساجد بمعہ اپنے بیٹے سلمان کے سردار صاحب کے اردگرد تھا اور وہ دونوں سردار صاحب کی خوشامد اور چاپلوسی میں نمایاں کردار ادا کر رہے تھے۔

چوہدری اپنے دوستوں اور حلقے کے اور افراد سے سردار صاحب کی فرداً فرداً ملاقات کروا رہا تھا۔ وارث بھی ہر جگہ سردار صاحب کے ساتھ ساتھ رہنا چاہتے تھے۔

''یہ علی حسن آفریدی ہیں۔ ہماری پارٹی کے بے حد اہم رکن۔ ان کی موجودگی کے بنا ہماری پارٹی شاید کچھ بھی نہیں۔'' چوہدری ساجد ایک گورے چٹے پٹھان سے ملواتے ہوئے بولا۔

سردار صاحب باری باری سب سے ہاتھ ملا رہے تھے۔

''اور یہ ہیں عاقب بیگ صاحب۔ انہوں نے حال ہی میں ہماری پارٹی میں شمولیت اختیار کی ہے۔ ان سے ہماری دوستی بھی زیادہ پرانی نہیں۔ ان سے ہم نے مراد پور کے فارمز خریدے تھے۔'' ایک اور بندے سے مصافحہ کرایا گیا۔

اور اس طرح دائرے میں کھڑے سبھی افراد سے چوہدری نے سردار صاحب کا تعارف کروایا۔

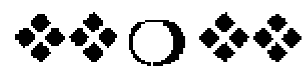
''دوستو! ان کی شخصیت سے کون واقف نہیں۔ ایم این اے تو یہ اب بنے ہیں جب کہ ان کی شہرت اور طاقت کا سکہ تو سالوں پہلے کا مانا ہوا ہے۔ ان کی فیکٹریز، ان کی ملیں، ان کی انڈسٹریز، اگر اس ملک میں کوئی سمجھ دار، قابلِ فخر انڈسٹریلسٹ ہیں تو وہ سردار واجد کی قد آور شخصیت کے علاوہ کوئی نہیں ہو سکتا۔ اور میں خوش نصیب ہوں کہ یہ میرے بچپن کے دوست ہیں۔ میں نے اپنی دوستی کے کئی سال ان کی محبت اور اپنائیت کی چھاؤں تلے گزارے ہیں۔''

سردار صاحب مروت سے مسکرا دیئے۔

''میرا خیال ہے چوہدری صاحب زیادہ ہی تعریفوں کے پُل تیار کر رہے ہیں۔ میں تو ادنیٰ سا بندہ ہوں۔ کیا میں اور کیا میری کامیابیاں۔ یہ تو ان کی دوستی ہے کہ انہوں نے مجھے اس لائق سمجھا اور میرے لئے شہر کی اتنی بارسوخ اور قدرے مصروف ہستیوں کو ایک جگہ جمع کیا۔'' سردار صاحب نے بہت شائستہ لہجے میں جواب دیا۔

''اس کو کہتے ہیں مروّت۔ وہ کیا کہتے ہیں انگریزی میں، ڈاؤن ٹو ارتھ۔''

وارث خاموش تماشائی بنے ہر منظر دیکھ رہے تھے۔



پارٹی کے اختتام پر وارث اور سردار صاحب کو چوہدری فیملی گاڑی تک چھوڑنے آئی۔

''اُمید ہے آپ اگلی بار مہر النساء بیٹی کو بھی ساتھ لے کر آئیں گے۔ اگر اس کی والدہ زندہ ہوتیں تو ان میں اور مجھ میں کمال کی دوستی ہوتی۔'' فرزانہ بیگم اپنا سڈول جسم ساڑھی سے سجائے ساتھ آ رہی تھیں۔

''اور مہر النساء کی مجھ سے بھی کافی اچھی دوستی ہو جائے گی۔'' عرفانہ نے بھی بولنا ضروری سمجھا۔

''انشاء اللہ بھابی! وہ لاہور سے آ جائے، میں ضرور ملواؤں گا آپ کو۔'' سردار صاحب نے کہا۔

''اور انکل! آپ زین کو بھی مجھ سے ملوایئے گا۔ میں اسے گھڑ سواری اور شکار کرنا سکھاؤں گا۔''

''کیوں نہیں برخوردار! ہم تو چاہتے ہیں کہ زین تمہاری طرح بنے۔ مضبوط، پڑھا لکھا اور سیاسی سوچ رکھنے والا۔ تم جیسے بیٹے تو باپ کی شان ہوتے ہیں۔'' سردار صاحب نے سلمان کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔

''ایک بار پھر بہت شکریہ اس دعوت کا۔'' سردار صاحب نے چوہدری سے ہاتھ ملایا۔

''ابھی تو یہ سلسلے شروع ہوئے ہیں سردار! آگے دیکھنا کہ یہ دوستی کیا رنگ لاتی ہے۔'' چوہدری نے ذومعنی انداز میں کہا اور سردار صاحب گاڑی میں بیٹھ گئے۔

ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھے وارث نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ دو باڈی گارڈ بھی گاڑی میں سوار ہو گئے اور گاڑی چوہدری ہاؤس کے وسیع کارپورچ سے باہر نکلنے لگی۔

''میں حیران ہوں آج سردار صاحب! ذرا دور ٹریفک سگنل پہ رکنے کے بعد وارث نے دل کی بات کو زباں دی۔

''کس پہ حیران ہو وارث خان؟'' سردار صاحب بہت اچھے موڈ میں تھے۔

''جو پہلے حریف اور دشمن کہلائیں، کیا وہ آپ کے لئے اس قدر میٹھے، شائستہ اور اپنائیت بھرے ہو سکتے ہیں؟ میرا مطلب چوہدری صاحب کی کرم نوازیوں پر ہے۔'' وارث نے صاف صاف کہا۔

''یہ دنیا ہے خان! دنیا۔ جو رنگ بدلتی بھی ہے، بدلواتی بھی ہے۔ ناچتی بھی ہے اور نچواتی بھی ہے۔ جو ہو رہا ہے اس کو ہونے دو۔ چڑھتے سورج کو سلام کرتے ہیں یہ لوگ، چاہے دوست ہوں چاہے دشمن، رشتہ دار ہوں یا عزیز۔ برے وقت میں کوئی کسی کا نہیں ہوتا۔ چوہدری کو میں برسوں سے جانتا ہوں۔ جلیبی کی طرح گول ضرور ہے لیکن جو اس کے دل میں ہوتا ہے وہی زبان کہتی ہے۔ اگر دو منہ رکھتا تو شاید اتنے سال دشمنی کا خطرہ مول نہ لیتا۔'' سردار صاحب نے اطمینان سے کہا۔

''لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ دس پندرہ سال کھلے عام دشمنی کرنے والا، آپ کے شیئرز کو، ملوں کو خریدنے والا اس طرح اچانک اپنائیت کا لبادہ اوڑھ بیٹھا ہے۔''

''ایک تو تم پٹھانوں کی طرح سوچتے اور سوال بہت کرتے ہو۔ یار! وہ میرا پرانا دوست بھی ہے۔ جتنا پرانا دشمن ہے، اس سے بھی پرانا دوست۔ اور اگر وہ مجھے نقصان پہنچانا چاہتا تو الیکشن سے پہلے پہنچا لیتا۔ اور پھر معاف کرنا، درگزر کرنا تو خدائی صفت ہے خان! معاف کرنے والا ظلم کرنے والے سے افضل ہوتا ہے۔''

''سردار صاحب! میں آپ کو کسی مشکل میں نہیں دیکھ سکتا۔'' وہ بے بسی سے بولا۔

''گھبراؤ نہیں، تمہارا سردار صاحب اتنا کمزور نہیں کہ چالوں کو سمجھ نہ سکے اور خاموشی سے اپنے ساتھ ہوتا ہر کھیل دیکھتا رہے۔ جہاں ہمیں محسوس ہوا کہ چوہدری اپنی چال چل رہا ہے تو پیادے ہم بھی دوڑا دیں گے۔'' سردار صاحب مکمل طور پر

مطمئن تھے۔

''کہیں زیادہ دیر نہ ہو جائے سردار صاحب!'' وارث کا دل مکمل طور پہ خدشوں کی لپیٹ میں تھا۔

''تم بے فکر رہو۔'' پھر وہی مطمئن مسکراہٹ تھی۔ جبکہ وارث کا اضطراب کسی آرگیومنٹ کو سننے کے لئے تیار نہ تھا۔



شمائل کی بہن راحیلہ کو پارلر سے آئی لڑکی نے انتہائی خوبصورت مہندی لگائی تھی جو دُھلنے کے بعد مزید نکھری نکھری اور خوشبودار محسوس ہو رہی تھی۔ ضحیٰ کی طبیعت اب بہتر تھی لہٰذا ماہا، ضحیٰ کے ہمراہ راحیلہ کے کمرے میں موجود تھی اور چھوٹی موٹی باتیں کئے جا رہی تھیں۔ شمائل کی والدہ بھی راحیلہ کے ہمراہ بستر پہ بیٹھی تھیں اور کسی دوپٹے کے اوپر ستارے ٹانک رہی تھیں۔

''ماہا جی! ایک بات پوچھوں آپ سے؟'' راحیلہ نے میگزین کی ورق گردانی کرتے کرتے ماہا کی جانب دیکھا۔

''پوچھو!'' ضحیٰ کے بالوں میں ہاتھ پھیرتی ماہا مسکرائی۔

''شادی کیوں ہوتی ہے؟........ کیا دو انسان الگ الگ رہ کے پُرسکون نہیں رہ سکتے جس طرح اتنے سال تنہا رہتے ہیں، کیا ساری عمر نہیں رہ سکتے؟''

راحیلہ کے لہجے میں وہی ان کہی اُداسی تھی جو شادی سے ایک دن قبل ہر لڑکی کے دل میں ہوتی ہے۔ ماہا اس اُداسی سے اچھی طرح واقف تھی، اس لئے وہ نرمی سے مسکرا دی۔ راحیلہ کی والدہ نے کچھ اداس اور کچھ خفا آنکھوں سے بیٹی کو دیکھا۔

''ماہا بیٹے! راحیلہ بہت منہ پھٹ ہے۔ ہر موقع اور ہر بات پہ اوٹ پٹانگ سوالات کرنا اس کی پرانی عادت ہے۔ تم اس کی باتیں غور سے مت سننا۔ کل شادی ہے اور یہ بیگم ایسی باتیں لئے بیٹھی ہیں۔'' والدہ نے تنبیہہ کی۔

''ارے نہیں آنٹی! کرنے دیں اسے سوال۔ میں جانتی ہوں شادی سے پہلے کے یہ آخری لمحات عجیب طرح کے سوالات، خیالات اور خدشات دل میں لے آتے ہیں۔ بہت مشکل گزرتا ہے یہ مرحلہ۔ پرانی زندگی سے رخصت ہو کے یکسر نئی دنیا اور نئی زندگی کی دیوار پھلانگنا ایک سہی سہی لڑکی کے لئے کافی مشکل ہوتا ہے۔ ان تمام

مراحل سے میں بھی گزر چکی ہوں۔ اور راحیلہ! شادی اگر ضروری نہیں ہوتی تو یہ نہ ہمارے دین کا ضروری فریضہ اور سنت ہوتی اور نہ معاشرے کا لازم حصہ اور شرط سمجھی جاتی۔ یہ فریضہ اور اصول ہم سب پہ لاگو ہوا اور ہر دور میں ہوتا آیا ہے۔ شاید معاشرے کی بہتری اسی میں ہوگی کہ ہر فرد کو شادی کے بندھن میں باندھا جائے۔'' ماہا نے بے حد تفصیل اور صفائی سے جواب دیا۔ راحیلہ اور اس کی ماں دونوں حیرت سے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

''ایک اور بات پوچھوں ماہا جی؟ امید ہے آپ برا نہیں منائیں گی۔'' راحیلہ نے پھر کہا۔

''پوچھو نا۔ یہ بار بار اجازت کیوں طلب کرتی ہو؟''

''اگر شادی کرنا اور کسی کے ساتھ زندگی بسر کرنا اتنا ہی اہم ہے تو پھر آپ تنہا زندگی کیوں گزار رہی ہیں؟'' راحیلہ کا سوال غیر متوقع تھا جس پہ ماہا لمحہ بھر کو ڈسٹرب ہوگئی۔

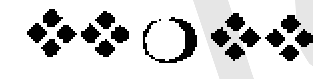
''شادی ایک بار ہی ہوتی ہے۔ اور اگر دوبارہ ہو تو اس میں وہ چارم، وہ خوشی باقی نہیں رہتی۔ اور پھر میں تنہا کہاں ہوں؟ میرے ماشاء اللہ دو بچے ہیں۔ ضحیٰ اور عاشر۔ ان کی تربیت، ان کی تعلیم میرے لئے بے انتہا ضروری ہے۔'' ماہا نے وضاحت کی۔

''لیکن ماہا جی!........'' راحیلہ مزید کچھ کہنا چاہتی تھی۔

''اب چپ بھی ہو جاؤ راحیلہ!'' والدہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

''یہ دیکھو، یہ ستارے صحیح لگ رہے ہیں یا اور لگاؤں؟'' وہ دوپٹہ ماہا اور راحیلہ کے سامنے پھیلا کے پوچھنے لگیں۔ ماہا ان کے بات تبدیل کرنے کا مطلب سمجھ گئی تھی۔ ماحول ذرا سا خاموش اور اُداس ہو گیا۔ تبھی سبھی لڑکیاں بھاگتی ہوئی اس کمرے میں آئیں اور پل میں وہ کمرہ کسی بازار کا منظر پیش کرنے لگا۔ عموماً کنواری لڑکیوں کا میلہ دُلہن کے کمرے میں ہی لگتا ہے۔ جھلمل جھلمل لباس، جھمکے، زیور، پائل، مہندی، اُبٹن، میک اپ کا سامان وہیں پھیلایا اور استعمال کیا جاتا ہے۔ قہقہے، شور، گیت، ہنگامہ سب دُلہن کی موجودگی میں ہوتا ہے۔ مایوں میں دُلہن کو ملا ڈرائی فروٹ دُلہن کے علاوہ سبھی چٹر چٹر چبائے جاتی ہیں۔ اس وقت بھی سبھی لڑکیاں آتے ہی کمرے میں پھیل گئیں۔

دو تین بیڈ پر راحیلہ کے گرد بیٹھ گئیں۔ کسی نے ہاتھ پکڑ لیا مہندی دیکھنے کے لئے، کسی نے مایوں والے پیلے جوڑے کا گوٹا دیکھنا شروع کیا، کوئی بیڈ پہ پھیلے جہیز کے کپڑوں کا جائزہ لینے لگی۔ ماہا تو یوں بھی اس شور وغل کو کئی دنوں سے انجوائے کر رہی تھی۔ اس کے لئے ہر ہر منظر خوشگوار اور مزیدار تھا۔



''سر! میں ایک بات کہوں آپ سے؟'' زین نے پیپر پہ میتھ کا سوال حل کرتے کرتے اپنے استاد ظفر کی جانب دیکھ کر کہا۔

''بولو زین! کیا بات ہے؟''

زین نے اپنی جیب سے کچھ تہہ کیئے ہوئے نوٹ نکالے اور ٹیبل پہ رکھ دیئے۔

''یہ کچھ پیسے ہیں سر!'' اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''پیسے...... کس لئے زین؟ تم جانتے ہو میں پڑھانے کے پیسے نہیں لیتا تم سے۔'' ظفر نے نرمی سے کہا۔

''جی سر! میں جانتا ہوں۔ لیکن یہ پیسے فیس کے نہیں۔''

''تو پھر کس لئے ہیں؟'' ظفر حیران ہوا۔

''سر! اس دن جس دن میں بے حد پریشان تھا، جس دن میں میتھس کے ٹیسٹ میں فیل ہوا تھا تو آپ نے...... آپ نے مجھے ایک سگریٹ دی تھی جس کو پی کے میں کھانسنا شروع ہو گیا تھا۔'' زین نے جھجکتے ہوئے شروعات کی۔

''ہاں، ہاں...... آگے بولو۔''

''سر! وہ سگریٹ پی کے میں بہت ریلیکس ہو گیا تھا۔ مجھے سکون ملا تھا اور میں نے بہت اچھی نیند لی تھی۔ تو سر!...... یہ پیسے رکھ لیں اور مجھے وہ سگریٹ لا دیں۔'' آخری دو جملے زین انتہائی آسانی سے کہہ گیا۔ کیونکہ اس نے ظفر کے چہرے پہ اطمینان دیکھا تھا، غصہ نہیں۔ اور ظفر کے چہرے پہ مسکراہٹ آ گئی۔ اس کا مقصد اسے پورا ہوتا نظر آ رہا تھا۔

''دیکھو زین! تم ابھی چھوٹے ہو اور اس دن تو میں سگریٹ پی رہا تھا تو مذاق مذاق میں تمہیں چکھوا دیا۔'' ظفر نے اداکاری کی۔

''سر! پلیز...... خدا کے لئے...... سر! میں بہت بے چین ہو گیا ہوں...... مجھے کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا بالکل بھی اچھا نہیں لگتا۔ سر! پلیز مجھے ایک پیکٹ اس سگریٹ کا لا دیں...... آپ کو جتنے پیسے چاہئیں، میں آپ کو دے دوں گا۔ میرے بابا مجھے ہر مہینے بہت پیسے بھیجتے ہیں۔'' زین منت ساجت پر اتر آیا تھا۔

''زین! تمہارے والدین مجھے ذمہ دار ٹھہرائیں گے اور میں یہ الزام اپنے سر نہیں لینا چاہتا۔'' ظفر بدکنے اور سمجھانے کی اداکاری کر رہا تھا۔

''نہیں سر! یقین کریں، میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ میں کسی کے سامنے سگریٹ بھی نہیں پیئوں گا۔ اور پھر سگریٹ پینا بری بات تو نہیں۔ میرے بابا خود بھی پیتے ہیں۔ کبھی کبھی وارث بھائی بھی پی لیتے ہیں۔ پلیز سر!...... پلیز!'' زین نے ظفر کے گھٹنے تھام لئے۔

''اچھا ٹھیک ہے۔'' ظفر نے اپنی جیب ٹٹولی اور ایک چرس سے بھرا ہوا سگریٹ نکالا اور دوسری جیب سے لائٹر نکالا اور اسے جلا کے زین کی طرف بڑھایا۔

تازہ جلی ہوئی، دھواں چھوڑتی، زہر جیسی سگریٹ ظفر اور زین کے چہروں کے درمیان تھی...... وہ موت تھی جو زین کو زندگی محسوس ہو رہی تھی...... جس کے حصول کی خاطر وہ جان بھی دینا چاہتا تھا۔ جس کے فقط ایک بار کے استعمال نے اس کا دن رات کا سکون برباد کر دیا تھا اور وہ اس سکون کو واپس لانا چاہتا تھا۔

وہ اپنے مہینے بھر کی پاکٹ منی بھی لٹا سکتا تھا اس سکون کو پانے کے لئے۔ وہ سر ظفر کے پاؤں میں گر کے، رو رو کے خدا رسولؐ کے واسطے دے کر انہیں منا سکتا تھا۔

وہ اس ایک معمولی سگریٹ کے پیچھے کچھ بھی کر سکتا تھا۔ نجانے کیا تھا اس کمبخت میں کہ یہ ماں کے دودھ سے زیادہ میٹھی، یار کی یاری سے زیادہ پیاری اور دوست کی دوستی سے زیادہ گہری لگ رہی تھی۔

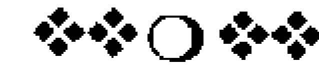
کسی ماہر نشہ باز کی طرح تیرہ سالہ زین العابدین سردار اس موت کی پیامبر سگریٹ کا کش لے رہا تھا۔ دھواں چھوڑ رہا تھا۔ پُرسکون ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اک نشے کی کیفیت چھا رہی تھی جو اس کی ذات کی معصومیت کو روند رہی تھی۔ مسل رہی تھی۔ کچل رہی تھی۔ سردار واجد کی نسل کا اکلوتا ستارہ فنا کے راستے کی پہلی سیڑھی پہ

پاؤں رکھ چکا تھا۔

ظفر کے چہرے پہ شیطانی مسکراہٹ تھی۔

زین کو سگریٹ کے دھوئیں میں زندگی تیرتی نظر آ رہی تھی۔ اسے اپنی ننھی سی عمر کی تمام تلخیاں بھول رہی تھیں۔ ماں کی غیر موجودگی، بابا کی نظر اندازی، مہرو آپا کی بے رخی...... سبھی کچھ وہ فراموش کر رہا تھا۔

سگریٹ کا ذائقہ کڑوا بھی تھا اور میٹھا بھی۔ غیر بھی تھا اور اپنا بھی۔ دور بھی تھا اور پاس بھی۔ اچانک زین کی آنکھوں کے آگے سے تمام دنیا مٹ گئی اور رہ گئی تو صرف وہ سگریٹ اور اس کا سرور...... زین اور سگریٹ...... سگریٹ اور زین...... اور کچھ نہیں...... کچھ بھی نہیں۔



میں سفر پہ جا رہی ہوں
یہ بڑی لمبی مسافت
اور ہوا دشوار ہے
اور پہلی مرتبہ
میرے سفر میں
ایسا مرحلہ آیا ہے
کہ میرے ساتھ
سب کچھ ہے
فقط اک تیرے دل سے نکلا
حرفِ دُعا
میرا نہیں!

"آج میری ملاقات اِک اجنبی سے ہوئی۔ بہت ہی عجیب اجنبی سے۔ جس کی آنکھیں اور جس کی باتیں میرے خوابوں سے بے حد ملتی جلتی تھیں۔ چوہدری ساجد کے گھر پارٹی تھی جو اس نے اپنی پچھلی فلم کے ہٹ ہونے کی خوشی میں دی تھی۔ وہیں اس اجنبی سے ملاقات ہوئی۔ وہ چوہدری ساجد کا گہرا دوست ہے۔ دونوں کا اسکول،

کالج ایک ساتھ گزرا ہے۔ پچھلے تین سال سے وہ لندن میں مقیم تھا بزنس ایڈمنسٹریشن کی ڈگری کی غرض سے۔ اور یہاں آ کے اس نے اپنا کاروبار شروع کیا ہے۔ میرے ساتھ اس کی کافی اچھی گفتگو رہی۔ اس سے شناسائی نجانے کیوں میرے دل میں خوشنما احساس جگا گئی ہے۔"

مہر النساء نے ڈائری کا اک اور ورق پلٹا۔ وہ کتنے دنوں سے ڈائری کے ان اوراق میں کھوئی ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ کوئی ڈائریاں نہ ہوں، بلکہ ٹائم مشین ہو جس کے ذریعے وہ ماضی کے اندر چلی گئی تھی۔ ماضی کا حصہ بن گئی تھی۔

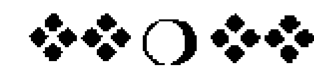
"آج واجد سے دوسری ملاقات ہوئی۔ اس نے مجھے کھانے پہ بلایا تھا۔ بہت عجیب بندہ ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ مجھے کسی فائیو اسٹار ہوٹل یا سمندر کے کنارے کھانا کھلاتا، اس نے مجھے اپنے گھر بلایا تھا اور مجھے اپنے ڈرائینگ روم میں بٹھا کے خود کھانا بنانے چلا گیا۔ میں اس کے ڈرائنگ روم میں رکھے گراموفون پہ پرانے ریکارڈ سنتی رہی۔ عجیب سا ماحول بن گیا تھا...... میں جیسے ہجوم رنگ و بُو کی دنیا سے اٹھ کے کسی دوسری دنیا میں چلی گئی تھی۔ جہاں واجد کا سادہ سا گھر تھا، اس کے ڈرائنگ روم میں رکھا پرانا گراموفون تھا، اس پہ بجتی کسی پرانے سازندے کی دھن تھی، اس کے ہاتھ سے پکے آلو گوشت کا ذائقہ تھا اور اس کی ساحر باتوں کا سحر تھا اور کہیں کچھ بھی نہ تھا۔"

پھر یہ کیسے ہوا
یونہی اِک اجنبی
دیکھتے دیکھتے
دل میں اُترا، نظر میں سما سا گیا
اور دھنک رنگ جذبے جگا سا گیا
جیسے بادل کوئی، بے ارادہ یونہی
میری چھت پہ رُکا
اور برسے بنا اس پہ ٹھہرا رہا
ایک لمحے میں سمٹے گی یہ داستاں

کس کو معلوم تھا
تم ملو گے مجھے اس طرح جانِ جاں
کس کو معلوم تھا!

''محبت اتنے خوبصورت احساس بھی دل میں جگا دیتی ہے، مجھے پہلے علم ہی نہ تھا۔ کتنی کتابوں میں محبت کو پڑھا۔ ہر افسانے میں محبت، محبت کی گردان تھی، ہر غزل، ہر شعر میں اسکا تذکرہ تھا۔ ہر گیت کے بول میں اس کا وجود تھا۔ ہر ڈرامے کے منظر میں یہ سراپا سالم موجود تھی۔ مگر پھر بھی مجھے اس کی آشنائی نہ تھی، اس سے شناسائی نہ تھی۔''

''اور آج اس طرح اچانک، بلا ارادہ یونہی بیٹھے بیٹھے بہت خاموشی سے، بہت مدھم لہجے میں اس نے میرے کان میں سرگوشی کی اور مجھے بتایا کہ میں تمہارے اندر منتقل ہو گئی ہوں۔ تم نے سب دروازے بند رکھے تھے، سب کواڑ پردوں سے ڈھانپ رکھے تھے۔ مگر دیکھو، میں رکنے سے رکی؟ بندش سے بندھی؟ میں تو آ گئی۔ آ کے تمہارے دل کے اندر بیٹھ گئی۔ کچھ ایسے جیسے کہ یہ تمہارا دل نہ ہو میرا مکان ہو۔ نکال سکتی ہو تو نکال لو۔ ہے اتنی ہمت ہے تم میں؟ رکھتی ہو اس قدر قوت؟........ میں جسے محبت کہتے ہیں، میں آ گئی ہوں۔ میں نیلا موسم بن کے تمہارے دل کی گلابی تتلیوں کے اوپر چھا گئی ہوں۔ تمہارے دل کی بستی کے سب پیڑ، پودے، گھر، میدان میرے گھنے گھیرے بادلوں تلے ہیں۔ سب آوازیں میری ہیں۔ سب موسم میرے محتاج ہیں۔ میں تمہاری روح، تمہارے دل، تمہارے حواس پہ قابض ہوں۔ میں تمہارے اندر رچ بس کے تمہارا اپنا آپ بن گئی ہوں۔''



''میں تو کہتا ہوں ان دنوں سے بہتر موقع تجھے دوبارہ کبھی مل ہی نہیں سکتا........ بتا دے اُسے کہ تُو اُسے چاہتا ہے۔'' عاصم نے چنے چباتے چباتے شانِ بے نیازی سے کہا۔

''ایسے کیسے کہہ دوں یار! آج تک کئی بار ہمت کی ہے مگر ہر بار اس کا چہرہ دیکھتے ہی ہمت ہار دیتا ہوں۔ استاد اور طالب علم کا عجیب سا رشتہ ہمیشہ دیوار بن جاتا ہے۔'' شائل نے بالکنی کی سرحد کے باہر خلاء کو گھورتے ہوئے کہا۔

''تو پھر ٹھیک ہے........ نبھاتے رہو اپنے بزرگوں والے رشتے اور اس طرح سسک سسک کے آہیں بھر کے مت دیکھا کرو اس کے چہرے کو۔ یار میرے! اگر تم نے اسے نہیں بتایا اور یہ وقت گزر گیا اور وہ تیری زندگی سے چلی گئی تو آج کے دن ہمت ہار بیٹھنے کی خلش تمہیں اکثر تڑپائے گی۔'' عاصم نے سنجیدگی سے کہا۔

''لیکن اگر اس نے انکار کر دیا تو؟''

''تو کر دے انکار۔ کم از کم یہ خوش فہمی تو ختم ہو جائے گی نا تمہارے اندر سے۔'' عاصم نے لاپرواہی سے کہا۔ شائل لمحہ بھر کو سوچ میں مبتلا ہو گیا۔

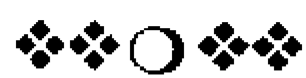
''اچھا، ٹھیک ہے........ میں کچھ سوچتا ہوں۔'' وہ بولا۔

''میاں! سوچتے ہی رہنا۔ یہاں تک کہ وقت گزر جائے۔ عمر بھی ڈھل جائے۔ عشق کا کھلونا ہاتھوں سے چھوٹ جائے۔ تتلی بھی خواہشوں کی کچھ رنگ چھوڑ جائے، تم سوچتے ہی رہنا۔''

کہنا شاید اتنا مشکل نہ تھا جتنا اس کا نتیجہ جھیلنا۔ اگر اس نے منع کر دیا، انکار کر دیا، تعلق توڑ دیا، روٹھ گئی، چھوڑ گئی، بات تک کرنے سے روک دیا تو میں کیا کروں گا؟ کیسے رہ پاؤں گا؟........ عشق کا تاج محل تعمیر کرنا چاہتا ہوں۔ مگر اس کی خواہش میں تعلق کا کچا گھڑا نہ توڑ دوں۔ بے چھت کا مکین نہ بن جاؤں۔

چاند چھونے کی خواہش ہے تو صحیح لیکن اس کو چھونے کی چاہ میں گھر کی چھت پہ کھڑی اس کی موجودگی سے بھی محروم نہ ہو جاؤں........ کیا کروں، کیا نہ کروں؟

اس سے پہلے کہ یہ ساون کی جھڑی تھم جائے
جتنے اقرار کے الفاظ ہیں
کہہ دو مجھ سے........!
بھیگتے پیڑ ہیں، میں ہوں، تم ہو
اس برستے ہوئے بادل کی طرح
لفظ اگر مڑ کے نہ آئے بھی تو کیا!
بھیگتے پیڑ کسے جا کے گواہی دیں گے؟



سردار واجد سے چوہدری ساجد اور سلمان دونوں نے کئی ملاقاتیں کیں۔ گاہے گاہے وہ یا تو کسی سیاسی فنکشن میں اکٹھے نظر آئے یا کسی ذاتی لنچ، ڈنر اور ہائی ٹی سے لطف اندوز ہوتے دکھائی دیئے۔ سالوں نے جو اُن کے درمیان ایک خلاء پیدا کیا تھا، دنوں اور ہفتوں نے اس خلاء کو پُر کر دیا تھا۔ سردار صاحب اور طرح سے سوچنے لگے تھے۔ خصوصی طور پر سلمان کے لئے۔ جو انہیں پڑھا لکھا، خوبرو اور باشعور نوجوان لگتا تھا۔ جس طرح وہ اپنے پن سے سردار صاحب سے بات کرتا تھا، اپنے کالج اور یونیورسٹی کے واقعات ان کے گوش گزار کرتا تھا، سردار صاحب بہت محظوظ ہوتے تھے اور خواہش کرتے تھے کہ زین بھی اسی طرح بن جائے۔ اسی طرح ہنسے بولے، اسی طرح ماہرانہ گفتگو کرے، اسی طرح لوگوں پہ اپنی شخصیت کا سحر پھونکے۔

چوہدری سلمان بنیادی طور پر بہت ملٹی کلر قسم کی شخصیت کا انسان تھا۔ کب، کہاں، کس وقت، کس کے سامنے کیا بہروپ بناتا ہے، کس کو کس طرح زیر کرتا ہے، کس انسان کے لئے کس سائز کا پنجرہ موزوں رہے گا، کون کس بات پہ پھسلے گا، یہ تمام گُر اسے اچھی طرح آتے تھے۔ وہ اپنے باپ سے بھی چند قدم آگے تھا۔ بنیادی طور طریقے اس کی گھٹی میں شامل تھے۔ اور باقی سب اس نے دنیا سے سیکھا تھا۔ لالچ، پیسے کی مریدی، کمینگی، عیاشی یہ سب اس کے اندر بدرجہ اتم موجود تھے۔ جب بات سردار صاحب کو زیر کرنے اور داماد بننے کی آئی تو اس نے ہر وہ بہروپ رچایا جو داماد میں کوئی سسر دیکھنا چاہتا ہے۔ اس نے اپنی ایم بی اے فرام ہارورڈ کی ڈگری کا رعب جھاڑا، اپنی صلاحیتوں اور پیسے کے زور پہ جیتے سرٹیفکیٹ کے زور پہ پہلے سردار صاحب کے دل کو متاثر کیا تھا، پھر اپنی شخصیت، خوش لباسی اور نفاست کے بل بوتے پر جوتوں سمیت ان کی آنکھوں میں گھس آنے کی سعی کی۔ اپنی گفتگو، اندازِ تکلم اور محفل پہ چھا جانے والے آداب سے چوہدری سلمان نے سردار صاحب کے اندر محبت پیدا کی اور اس طرح وہ اسی فیصد اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ باقی کام اس کے والد نے اپنی خوشامد اور چاپلوسی، مکھن، مسکہ بازی کے بل بوتے پہ کرنا تھا۔

سو آج 'قصرِ زیب' کے اعلیٰ ذوق والے تزئین و آرائش شدہ ڈرائنگ روم میں چوہدری فیملی سردار صاحب کے سامنے تھی۔ مہر النساء اور زین کی خاطر تحائف بھی

لائے گئے تھے اور آنے کا مقصد کچھ ''خاص'' تھا۔

سردار صاحب اور چوہدری ساجد کافی دیر سے کالج اور یونیورسٹی کے قصے شیئر کر رہے تھے اور ان سے محظوظ ہو کے ہنس رہے تھے۔ فرزانہ بیگم بھی کبھی کبھی درمیان میں اپنے کمنٹس دے دیتیں ورنہ وہ خاموشی سے ہنستی اور مسکراتی تھیں۔ اور سلمان، وہ فرمانبردار اور سلجھا بیٹا بنا ہوا تھا۔

''دوستی اور رفاقت کے قصے تو ساری عمر دوہرائے جاتے رہیں گے بھائی صاحب! لیکن آج جو بات میں کہنے آئی ہوں، وہ بہت خاص ہے۔'' فرزانہ نے اپنی سلک کی نیلی ساڑھی کا پلو درست کرتے ہوئے مدعائے خاص کا ذکر کیا۔

''جی کہیئے بھابی!'' سردار صاحب نے جواب دیا۔

''ایکسکیوز می ممی! میں ذرا اپنے ایک دوست کی کال سن کے آتا ہوں۔'' سلمان بہانا بنا کے وہاں سے نو دو گیارہ ہو گیا۔

''بھائی صاحب! ہم آپ سے بہت قیمتی چیز مانگنے آئے ہیں۔ وہ چیز جتنی آپ کے لئے خاص ہے، اتنی ہی ہمارے لئے بھی خاص ہے۔'' فرزانہ نے ابتداء کی۔

''بھابی جان! آپ کھل کے بات کریں۔ میں یقین دلاتا ہوں آپ مایوس نہیں ہو گی کبھی میرے جواب سے۔''

''بھائی صاحب! ہمارے درمیان دوستی کے ناتوں کی اس قدر گہرائی اور خلوصِ نیت کے باوجود بھی بہت برسوں تک فاصلے رہے۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ ہمارے درمیان کوئی مضبوط پہلو نہ تھا۔ کوئی ایسا نہ تھا جو آپ کی اور ہماری دوستی کی ڈھال بن سکے۔ میں اسی ڈھال کی تمنا میں آئی ہوں بھائی صاحب! میں چاہتی ہوں ہماری یہ دوستی، یہ ناتے زندگی بھر کے لئے محفوظ ہو جائیں۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ......... آپ اپنی بیٹی مہر النساء کو مجھے میرے سلمان کے لئے دے دیں۔'' فرزانہ نے اپنا مدعا کہہ دیا۔

سردار صاحب حیرت سے انہیں دیکھتے رہے۔ جس کی توقع نہ تھی، وہ ہو گیا تھا۔

''انکار مت کیجئے گا بھائی صاحب!......... بڑی اُمید باندھ کے آئی ہوں۔ زیب زندہ ہوتیں تو میں ان سے کہتی۔ لیکن ان کی غیر موجودگی میں مہرو کے ماں باپ دونوں

آپ ہیں اس لئے آپ سے مانگا ہے۔ مجھے مہرو دے دیں........تا کہ وہ چاند میرے آنگن میں چمک سکے۔''

سردار صاحب خاموش تھے۔ ساجد نے ان کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھا۔

''ہاں سردار! یہ صرف فرزانہ ہی کی نہیں، میری اور سلمان کی بھی خواہش ہے۔ سلمان بھی کسی ایسی لڑکی کا ساتھ چاہتا ہے جو مہر النساء کی طرح پڑھی لکھی، باشعور اور سمجھدار ہو اور ہمارے بیچ کا یہ نیا رشتہ شاید بہت سی تلخیاں مٹا دے گا۔''

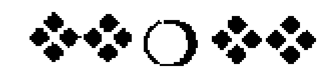
''ہاں........لیکن چوہدری! اتنا بڑا فیصلہ میں یوں لمحوں میں تو نہیں کر سکتا نا۔''

سردار صاحب عجیب کشمکش میں تھے۔

''ارے بھائی صاحب! آپ سوچ لیں۔ اچھی طرح غور کر لیں۔ مہرو بیٹی سے بھی مشورہ کر لیں۔ اس کے بعد جواب دیجئے گا۔ ہم تو بس اپنے دل کا ارمان آپ کو بتانے آئے تھے۔ یہ کچھ تحفے بھی لائی تھی میں مہر النساء کے لئے۔'' فرزانہ بیگم نے میز پہ رکھے کچھ سنہری ڈبوں کی جانب اشارہ کیا۔

''ان کی کوئی ضرورت تو نہیں تھی بھابی! اور یوں بھی مہرو آج کل لاہور میں ہے۔ واپس آئی تو ضرور آپ سے ملوا دوں گا اور آپ کے تحائف بھی دے دوں گا۔'' سردار صاحب بولے۔

''بہت شکریہ بھائی صاحب!'' کچھ تکلفانہ، کچھ دوستانہ ماحول میں اس نشست کا اختتام ہوا۔



بستر پہ لیٹے لیٹے زین کے جسم میں کانٹے سے چبھنے لگے تھے۔ وہ کتنی دیر سے کروٹ پہ کروٹ بدل رہا تھا۔

رات کے ایک بجے کا وقت تھا۔ ہاسٹل کے سبھی لڑکے گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ ماحول میں ہلکی سی خنکی تھی۔ نرم لحاف اور کمبل میں سبھی چین کی نیند سوئے تھے۔ لیکن زین کی نیندیں نجانے کہاں غائب ہو گئی تھیں۔ اس کے حلق میں کبھی پیاس کے کانٹے چبھتے تو کبھی ہڈیوں میں ایک لہر سی کوندتی۔ وہ بے چین ہو رہا تھا۔ بے قراری اور اضطراب اس کے انگ انگ سے پھوٹ رہا تھا۔

بالآخر وہ تھک کے، اضطراب سے تنگ آ کے بستر سے اٹھا۔ بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ رکھے جگ میں سے پانی کا گلاس بھرا اور غٹا غٹ پی گیا۔ پھر اسی سائیڈ ٹیبل کے لاک لگے خانے کی چھوٹی سی چابی اپنی جیب سے نکالی۔ خانہ کھولا اور اندر رکھی کاغذ میں لپٹی وہ سگریٹ نکالی جو اس نے سرظفر سے لی تھی۔ سگریٹ اور ماچس جیب میں ڈال کے وہ کمرے سے نکل آیا۔

کمرے سے نکلتے ہی ٹھنڈی ہوا کا ایک زوردار تھپیڑا اس کے چہرے سے ٹکرایا مگر اسے سردی کا احساس تک نہ ہوا۔ ہوادار، خنک اور قدرے ویران ہاسٹل کے کاریڈور کو وہ خاموش قدموں سے پھلانگتا کامن باتھ روم کی جانب جا رہا تھا۔

باتھ روم کے اندر آ کے اس نے کنڈی چڑھا لی۔ سنک کے بالکل اوپر ایک دھندلا سا آئینہ ٹنگا تھا جس میں زین کو اپنا بیمار سا سراپا نظر آیا........اس نے اپنی جیب سے سگریٹ نکالی، اسے ماچس کی مدد سے سلگایا اور کھڑے کھڑے اس کا پہلا کش لیا۔

پہلے کش کے ہمراہ ہی سکون اور راحت گویا اس کی نس نس میں اتر گیا۔ ایک کش، دوسرا کش پھر تیسرا کش........اضطراب، بے چینی، بے قراری پل بھر میں اس کے اندر سے ہوا ہو گیا۔

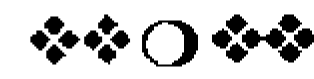
وہ زمین پہ اکڑوں بیٹھ گیا۔ اتنے آرام سے بیٹھ کے وہ سگریٹ پینے لگا جیسے وہ جگہ کوئی سپر لگژری واش روم ہو جہاں پنکھا، ٹیوب لائٹ اور کرسیاں رکھی ہوتی ہیں۔

کچھ دیر پہلے اس کے اندر پھوٹنے والی بے قراری اور بے چینی رفو ہو گئی۔ وہ ایک نشے سے بھری سگریٹ اس کے لئے زندگی کا کام کر رہی تھی۔ حالانکہ وہ اس کے لئے موت تھی اور وہ کمسن سا زین العابدین سردار اس موت کو زندگی سمجھ کے کش پہ کش اپنے اندر اتار رہا تھا۔

''آہ........'' اس نے ایک اور لمبے کش کے بعد دھوئیں کو اپنے اندر اتارا۔

وہ سردار واجد کے گھر کا اکلوتا چشم و چراغ، پہاڑی علاقے میں بنے ہاسٹل کے غسل خانے میں اپنی زندگی کو موت میں تبدیل کر رہا تھا........اپنے باپ کے تمام خوابوں اور خواہشوں اور بہن کی تمام دعاؤں پہ پانی پھیر رہا تھا........وہ لمحہ بہ لمحہ موت

کی طرف جا رہا تھا۔



پھر پکاریں اسے
آخری مرتبہ پھر پکاریں اسے
اَن سنی آہٹوں کے تعاقب میں ہم
تا کجا خواب تاروں کو بُنتے ہوئے
اس کے بے نقش پیکر کی تخلیق میں
اپنے رنگوں سے محروم ہوتے رہیں
اس کے انصاف کی بے نشان آس پر
خون دیتے رہیں، ظلم سہتے رہیں
یہ جہاں فاصلے کارواں کارواں لڑکھڑاتے ہوئے
گرد بادوں کو منزل بناتے ہوئے
زخم کھاتے ہوئے، مسکراتے ہوئے
زیرِ لب حمد یہ گیت گاتے ہوئے

نماز میں سجدہ کرتے ہوئے اس کی آنکھوں سے بے پناہ آنسو نکل آئے تھے۔ سبھی اپنوں کے چہرے بار بار ذہن میں آ گئے تھے۔ اس کا چہرہ، جائے نماز کا وہ حصہ بھی آنسوؤں سے بھیگ گئے تھے۔ وہ بلک پڑی تھی۔

کتنے سالوں بعد اس نے نماز پڑھی تھی۔ پاگل خانے کی سفاک چہار دیواری میں وہ اکثر اپنے رب کو پکارتی تو تھی مگر اس قدر مایوس تھی اپنی زندگی سے کہ اس نے نماز ترک کر دی تھی۔ اس قدر محرومی اس کے اندر جنم لے چکی تھی کہ اس نے دعا مانگنا تک چھوڑ دیا۔ سزا کو قبول کر لیا تھا۔ مگر گناہ کی معافی مانگنا گوارا نہ کیا تھا۔ اللہ کی رحمت سے مایوس سی ہو گئی تھی۔

اس نے سمجھ لیا تھا کہ جیسے دنیا بھر سے اس کا رشتہ ختم ہو گیا ہے، جس طرح وہ دنیا بھر کی نظروں سے پوشیدہ سی ہو گئی ہے، اسی طرح اللہ رب العالمین سے بھی اس کا ناتہ ختم ہو گیا ہے اور وہ اس کی نظروں سے بھی پوشیدہ ہو گئی ہے۔ شب معراجوں، شب

براتوں، رمضان اور تہجد کے اوقات میں اس نے کئی بار اس مالکِ کون و مکاں سے گفتگو کی تو سہی لیکن اپنے لئے نہیں، اپنے بچوں کی سلامتی کے لئے دعائیں مانگیں۔

اپنے لئے اسے کچھ چاہئے نہ تھا۔ کوئی خواہش، کوئی آس دل میں باقی نہ تھی۔

لیکن آج پاگل خانے کی فضاؤں سے آزاد ہونے اور زندہ لوگوں کی دنیا میں لوٹ آنے کے بعد وہ دوبارہ سے زندہ ہو گئی تھی اور اسی زندگی نے اسے دوبارہ آگہی دی تھی اور اسی آگہی نے دوبارہ اس کے اندر امیدیں جگائی تھیں۔ اس نے آسمان کی جانب دیکھنا اور امید رکھنا شروع کر دیا تھا اور ایک اور خیال اس کے اندر جاگا تھا۔

اپنے گناہوں کی تلافی کا خیال......سزا سے معافی کا خیال......عمر کی قید سے آزادی کی دعا کا خیال......اور انہی چند دعاؤں کی غرض سے وہ وضو کر کے نماز ادا کر رہی تھی اور نماز کی ادائیگی کے بعد اندر سے آنسوؤں کا آبشار سا پھوٹ پڑا تھا۔

ایک ایک آنسو ملتجی تھا۔ ایک ایک سسکی استغفار کر رہی تھی۔ ایک ایک آہ سربسجود تھی۔

"اے میرے پروردگار! مجھے معاف کر دے۔ میں گنہگار، سیاہ کار بندی ہوں تیری۔ میں تو تجھے بھولی ہوں مگر جانتی ہوں، تُو مجھے نہیں بھولا۔ میرے پاس کچھ نہیں۔ میں تہی داماں ہوں...... مجھے اپنے لئے کچھ نہیں چاہئے سوائے معافی کے...... مجھے بخش دے میرے مالک! میرے گناہ بخش دے...... میرے لئے جتنی سزا ہوئی ہے وہ بہت ہے۔ میری سزا میں کمی کر دے میرے مالکِ خیر و شر! میری سزا میں کمی کر دے۔ میں تجھے بار بار پکار رہی ہوں۔ مجھے جواب دے دے میری آواز کا۔ میں جانتی ہوں کہ تُو میری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ مجھے آواز دے دے میرے مالک!...... مجھے آواز دے دے۔"

آؤ مل کر ذرا آج ڈھونڈیں اسے
وہ جو کہتا ہے میں ہر جگہ ہوں، چلو آج دیکھیں اسے
اس قدر زور سے اس کو آواز دیں
آسمان اور زمیں ٹین کی چادروں کی طرح بج اٹھیں
اس کو اخبار کے ہر ورق میں جلی سرخیوں میں لکھیں
تم جہاں بھی ہو لوٹ آؤ، گر تم نہ آئے

تو سجدوں کی بیمار بوڑھی روایت بکھر جائے گی
ریڈیو اور ٹی وی پہ اس سے کہیں
اگر تم ہو تو آؤ، تمہارے لئے ہم گھروں میں دیے
اور دلوں میں عقیدت کی شمعیں جلائے ہوئے منتظر ہیں
تمہارے بنا روشنی اپنے سائے سے ڈر جائے گی
سب عبادت گاہوں کی بلند اور چوبی منقش دروں پہ یہ نوٹس لکھیں
تم اگر اپنے ان شیشہ خانوں سے باہر نہیں آؤ گے
تو سنو!
ہم بھی اندھے سفر پر نہیں جائیں گے
زخم کھائیں گے تو خود بھی خنجر کی صورت نکل آئیں گے
حمد یہ گیت لب پہ نہیں لائیں گے
آخری مرتبہ، پھر پکاریں اسے!



یہ لاہور کی انار کلی کی ایک کپڑے کی دکان کا منظر تھا۔

مہر النساء اپنے لئے کچھ کپڑے خریدنے کی غرض سے وہاں آئی تھی۔ کچھ تو گھر پہ بیٹھے بیٹھے بوریت کا عنصر پیدا ہو گیا تھا اور کچھ تفریح اور شاپنگ کی غرض بھی تھی۔ لہٰذا وہ ڈرائیور کے ہمراہ نکل آئی تھی۔

اس نے اپنے لئے کچھ کپڑے خریدے اور پھر بازار میں یونہی بے مصرف پھرنے لگی۔ مختلف دکانوں میں جاتی، چیزوں کو چھوتی، قیمت پتہ کرتی اور چھوڑ دیتی۔ مقصد تو صرف وقت گزاری تھا ورنہ اسے اتنی شاپنگ کی نہ ضرورت تھی اور نہ شوق۔

اسی طرح ایک جیولری شاپ پہ وہ ڈسپلے پہ لگے ہوئے کچھ ڈیزائن دیکھ رہی تھی کہ اسے کسی کے دیکھنے کا احساس ہوا۔ اس نے یہاں وہاں نظر گھمائی۔ اسے اپنے سامنے ایک ادھیڑ عمر شخص نظر آ رہا تھا جس کی ہلکی سفید داڑھی تھی۔ اس آدمی کی سرخ آنکھوں میں اک عجیب وحشت سی تھی۔ مہر النساء نے پہلی نظر ڈالنے کے بعد اسے نظر انداز کرنے کی کوشش کی۔ وہ جیولری کے ڈیزائنز کی طرف اپنا دھیان لگانے لگی۔ چھوٹے بڑے جھمکوں اور بالیوں کو پسند کرنے کے مراحل سے گزرنے لگی۔ اچانک اسے شیشے میں پھر وہ چہرہ نظر آ گیا۔ وہی وحشت بھری آنکھیں، وہی بکھرا بکھرا سا چہرہ۔

اب مہرو کے دل میں اک عجیب خوف سا پیدا ہونے لگا۔ دل میں اک عجیب ڈر نے انگڑائی لی۔

'کون ہے یہ شخص؟........ایسے کیوں دیکھ رہا ہے مجھے؟........کیا چاہتا ہے یہ مجھ سے؟' عجب سوال خود کلامی کی طرح دل میں پیدا ہونے لگے۔ وہ جیولری چھوڑ کے دکان سے نکلی۔ مگر لاشعوری طور پہ اس کی نظریں پیچھے جا رہی تھیں۔ وہ آگے چل رہی تھی۔ بھیڑ میں راستہ بنا رہی تھی۔ مگر آنکھیں اور ذہن اپنے پیچھے ہی تھا۔ اور اس نے

دیکھا، وہ شخص اس کے تعاقب میں ہے۔ وہ بھی اسی کی طرح بھیڑ کو چیرتا آگے بڑھ رہا ہے، اس کی آنکھوں کی وحشت مزید گہری لگ رہی ہے۔ وہ اور بکھرا بکھرا لگ رہا ہے۔ مہرو نے اپنی رفتار بڑھا دی۔

یوں تو وہ ڈرنے یا گھبرانے والی لڑکی سرے سے نہ تھی۔ کوایجوکیشن میں پڑھی تھی۔ لڑکوں کا ہمیشہ ساتھ دیکھا تھا۔ تقریری مباحثوں میں حصہ لیا تھا۔ بازاروں میں، ایئرپورٹ پہ اکثر تنہا جاتی تھی۔ لیکن کبھی اس طرح کسی چہرے سے گھبرائی نہ تھی۔ اس شخص کے چہرے سے لگتا تھا جیسے وہ نشہ کرتا ہے اور اس کے کپڑے بھی عجیب فقیرانہ قسم کے تھے۔ سیاہ ڈھیلا ڈھالا کُرتا، سفید شلوار، آستینوں کے بٹن کھلے ہوئے۔ پہلی نظر میں وہ شخص مستانہ یا پاگل محسوس ہوتا تھا۔

پہلے تو مہرو نے سوچا شاید وہ کسی اور کے پیچھے ہو۔ وہ کئی بار رکی، ٹھہری، دھیان بٹانے کی کوشش کی، مگر جب وہ رکتی، وہ شخص بھی رک جاتا اور کھڑا ہو کر اسے دیکھنے لگتا۔ وہ چلتی تو چلنے لگتا۔ وہ رفتار بڑھاتی تو وہ بھی بڑھاتا، کم کرتی تو وہ بھی کم کرتا۔

مہرو کے دل کی دھڑکن بہت تیز ہوگئی۔ وہ آگے ہی آگے بڑھنے لگی۔ بازار کی بھیڑ اب ختم ہوگئی تھی۔ مہرو اس طرف بڑھنے لگی جہاں گاڑی کھڑی تھی۔ سڑک اب خالی تو نہ تھی لیکن بازار کی بھیڑ ختم ہونے لگی۔ مہرو کی رفتار اب بھی بدستور تیز تھی اور وہ شخص بھی پیچھے پیچھے تھا۔ اس شخص کے پاؤں میں کڑا تھا جس کی چلتے ہوئے آواز ہوتی تھی۔ مہرو کو اپنی گاڑی نظر آگئی اور وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھنے لگی۔

''رک جاؤ!...... رک جاؤ!...... میں ہوں، بانکا...... رُک جاؤ...... مہرالنساء! رک جاؤ۔'' وہ شخص پکارنے لگا۔

مہرو کے قدم جیسے زمین میں گڑ گئے۔ وہ رک گئی۔ اس شخص نے مہرو کو نام سے پکارا تھا۔

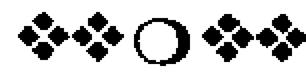
وہ خاموش کھڑی ہوگئی۔ دل کے اندر کا ڈر اور دھڑکن گویا تھم سی گئی۔ اجنبی انجان شہر میں کوئی مستانہ، وحشی انسان مہرو کو کیسے پہچان سکتا ہے؟ ...... وہ شخص مہرو کے قریب آگیا۔ وہ اسے دیکھنے لگی۔ اس شخص کے چہرے کو دیکھ کر جو خوف پہلی نظر میں جاگا تھا وہ ختم ہوگیا۔

''تم...... تم مہرالنساء ہونا؟...... زیب النساء کی بیٹی؟'' اس شخص نے کہا۔ مہرو گونگوں، بہروں کی طرح کھڑی تھی۔ کتنی دیر بعد اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''تم...... تم زیبو باجی کی بیٹی ہونا، مہرالنساء؟...... تم...... تم آگئیں...... آگئیں تم؟...... مجھے پتہ تھا تم آؤ گی...... کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں ضرور ملو گی مجھے...... ضرور ملو گی...... تم آگئیں...... تم آگئیں۔'' وہ مستانہ گویا سڑک پہ جھومنے لگا۔

مہرو کی حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ وہ تو اس سے یہ بھی نہ پوچھ سکی کہ تم مجھے اور میری ماں کو کیسے جانتے ہو۔ گھبراہٹ کے مارے وہ گاڑی میں آکے بیٹھ گئی۔ اس شخص نے بھی اسے روکنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ وہ سڑک پہ کھڑا دیوانہ وار جھومنے لگا، مسکرانے لگا۔ مہرو گردن موڑ موڑ کر اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔

وہ یہ بھول بیٹھی تھی کہ یہ شہر بے شک اس کے لئے انجان ہو لیکن یہ شہر اس کی پیدائش، اس کی اصلیت تھا...... اس کی ماں کا ماضی تھا...... ماضی کے اوراق ایک بار پھر پھڑپھڑا رہے تھے۔



اور اسی شام اسے وارث کی کال موصول ہوئی تھی۔

''کیسی ہیں آپ؟'' وارث کے لہجے میں اک کھنک تھی۔

''ویسی ہی جیسی ہمیشہ سے تھی۔'' وہ مسکرائی۔ وارث کی آواز سن کر وہ تمام پریشانی بھول بیٹھی۔

''آپ کی بہت یاد آرہی ہے یہاں۔ بہت اُداس اُداس ہے موسم آپ کے رنگ بدلتے چہرے کے بنا۔ وارث بولے۔''

''موسم کیا میرے چہرے کے محتاج ہیں؟''

''جی ہاں...... ہمارے لئے تو تمام کے تمام موسم آپ کے چہرے ہی کے محتاج ہیں۔ ہنستی ہیں تو بہاروں کے پھول کھل اُٹھتے ہیں۔ اُداس ہوتی ہیں تو خزاں کے سوکھے پتے سرسراتے ہیں۔ ناراض ہوتی ہیں تو گرمیوں کا احساس ہوتا ہے اور نظر کرم کرتی ہیں تو ٹھنڈک اُتر آتی ہے دل میں۔'' وارث نے کھلکھلا کے کہا۔

''کیا واقعی ایسا ہے؟''

''جی ہاں......ایسا ہی ہے۔ آپ کو پتہ ہے میں نے آپ کو کیوں فون کیا ہے؟''

''کیوں؟''

''میں نے آپ کو یہ بتانے کے لئے فون کیا ہے کہ آج شام میں سردار صاحب سے بات کرلوں گا۔ انہوں نے میرے ساتھ ڈنر پر جانا ہے، صرف میرے ساتھ۔ یہ ڈنر انہیں میں اپنی طرف سے کرا رہا ہوں، ان کی جیت اور ہماری محبت کی ضروری بات کرنے کے لئے۔'' وارث نے تفصیل سنائی۔

''واقعی وارث؟'' وہ مسکرائی۔

''جی......بس آپ دعا کیجئے گا میرے لئے اور ہماری محبت کے لئے۔''

''آج میں داتا دربار جاؤں گی شام میں۔ یوں بھی آج جمعرات ہے۔ بہت رونق ہوگی وہاں۔ میں ضرور دعا کروں گی۔''

''جی مہرو! آپ ضرور مانگئے گا اپنے دل کی مراد۔ اللہ تعالیٰ ہر دل کے بھید سے بخوبی واقف ہیں۔'' وارث مسکرائے۔

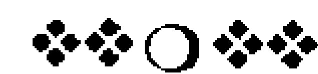
''وارث! مجھے آپ سے ایک بات کرنی تھی۔'' مہرو کے دل میں خیال آیا کہ وہ اُس عجیب شخص کے متعلق وارث کو بتائے۔ مگر اگلے ہی لمحے وارث کی خوشی کو پریشانی میں بدل دینے کا خیال اس نے دل سے نکال لیا۔

''ہاں بولیں مہرو!''

''بس، بس، یہی کہنا تھا کہ بابا کی عدالت میں ہماری محبت کا مقدمہ اس طرح سے پیش کیجئے گا کہ وہ ہمارے خلاف فیصلہ دے ہی نہ پائیں۔'' مہرو نے بات بدلی۔

''اور اگر میں اکیلا مقدمہ لڑ نہ پاؤں تو؟......اگر سردار صاحب نے وکیل صفائی کی موجودگی ضروری سمجھی تو؟'' وارث نے اسے چھیڑا۔

''تو وکیل صفائی اسی دن فلائٹ پکڑ کے کورٹ میں حاضری دینے آ جائیں گے۔ اور جج صاحب کے سامنے گڑگڑائیں گے۔ اور ہمیں اُمید ہے کہ لاڈلے وکیل صفائی کی درخواست محترم جج کبھی رد نہیں کریں گے۔'' مہر النساء پُر اعتماد تھی۔ وارث نے بھی مطمئن ہو کے فون رکھ دیا۔



''شہرین! یہ میں نے کچھ اپنے جوڑے نکالے ہیں، تمہاری بالی آنٹی کے لئے۔ میں انہیں دینے جا رہی ہوں۔'' شہرین کی والدہ نے فائل پہ جھکی بیٹھی شہرین سے کہا۔ اس نے مسکرا کے رضامندی کا اظہار کیا اور دوبارہ اپنی فائل پہ جھک گئی۔

ثمین اپنے ہاتھوں میں وہ کپڑے اٹھائے بالی کے کمرے میں آئیں۔ وہ ہاتھوں میں تسبیح اٹھائے کھڑکی سے خلاء میں گھور رہی تھی۔ چہرے پہ بے انتہا سکون اور اطمینان تھا۔ اِک مخصوص سا اُجلا پن تھا۔ ثمین چلتی چلتی اس کے پاس آئیں۔

''میں آپ کے لئے یہ کپڑے لائی تھی۔ تا کہ آپ انہیں تبدیل کر سکیں۔ جو آپ نے جوڑا پہن رکھا ہے، یہ بہت پرانا ہے۔'' ثمین نے کہا۔

''اس کی کوئی ضرورت تو نہیں تھی۔ جو کپڑا برسوں سے تن کو ڈھانپے وہ بھی تو زندگی کا حصہ بن جاتا ہے۔'' بالی کے لہجے میں اداسی سی تھی۔

''تو یہ جوڑا بھی آپ کے پاس ہی رہے گا۔ بہن ہونے کے ناطے میں اتنی فرمائش تو کر سکتی ہوں۔ چلیں اُٹھیں، اچھی طرح سے نہائیں اور ان میں سے ایک جوڑا پہن لیں۔ مجھے بہت اچھا لگے گا۔''

''لیکن......'' وہ اُلجھن میں تھی۔

''میرا دل ہی رکھ لیں۔'' ثمین نے اپنائیت سے کہا۔ وہ انکار نہ کر پائی اور ایک ہلکے فیروزی رنگ کے چکن کا سوٹ اٹھا کر غسل خانے کی جانب بڑھ گئی۔

ثمین باقی جوڑے اٹھا کر الماری میں رکھنے لگیں۔ الماری کے ایک کونے میں بالی نے اپنی چند چیزیں رکھی تھیں۔ ایک کپڑوں کی گٹھڑی نما تھیلی، ایک سبز رنگ کی اُونی چادر جس میں ملتانی کڑھائی تھی۔ ثمین کو وہ چادر بہت خوبصورت لگی۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے وہ چادر نکال لی۔ چادر کو نکالتے ہی چند چیزیں زمین پر گر گئیں۔

وہ دو تصاویر تھیں اور چند کاغذ تھے۔ ثمین نے جھک کے وہ تصاویر اٹھا لیں اور انہیں غور سے دیکھا۔ حیرت اور تعجب سے وہ ساکت سی رہ گئیں۔ جسم میں ایک عجیب لرزش سی دوڑ گئی۔ کاغذات پراپرٹی کے تھے۔ ثمین نے وہ کاغذات واپس چادر میں اور چادر الماری میں رکھ دی اور وہ دونوں تصویریں اٹھا کر اپنے کمرے میں آ گئیں۔ اپنی ڈریسنگ ٹیبل کے دراز میں ان تصویروں کو چھپایا اور دوبارہ بالی کے کمرے میں آ گئیں۔

کچھ ہی دیر میں غسل خانے کا دروازہ کھلا اور بالی باہر آ گئی۔ گیلے بال کمر سے نیچے تک ڈھلک رہے تھے اور ان بالوں میں کچھ کچھ سفیدی بھی تھی۔ اچھی طرح نہانے کے بعد چہرہ کافی نکھرا نکھرا لگ رہا تھا۔ ہلکے مگر خوبصورت سادہ سے لباس نے اس پگلی کی شخصیت گویا بدل دی تھی۔ وہ پچاس کی سرحد کی دوسری طرف جاتی ہوئی عورت اس وقت فقط اٹھائیس اُنتیس سال کی عورت لگ رہی تھی۔ ثمین نے غور سے اس کے چہرے کو دیکھنے کی کوشش کی جیسے پہچاننے کی سعی کر رہی ہوں، شناسائی کا کوئی عکس تلاش کر رہی ہوں اس کے چہرے پر۔ اور بالآخر ثمین نے اسے پہچان لیا...... وہ گومگو کی کیفیت میں کھڑی اسے دیکھتی رہیں۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہیں آپ؟...... میں وہی ہوں۔" وہ بولی۔

"میں جانتی ہوں، آپ وہی ہیں۔ بس اپنی آنکھوں پہ یقین کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔" ثمین نے نم لہجے میں کہا۔

"آپ بہت اچھی لگ رہی ہیں، آپ کی شخصیت نکھر آئی ہے۔" ثمین نے اسے آئینے کے سامنے بٹھاتے ہوئے کہا۔ وہ خاموش تھی۔ گویا آئینے میں خود کو پہچاننے کے مراحل سے گزر رہی ہو۔ ثمین کنگھی اٹھا کے اس کے گیلے بال سلجھانے لگی۔

"ایک بات کہوں، امید ہے آپ کو بری نہیں لگے گی۔" ثمین نے کہا۔

"کہیے۔"

"آپ کا نام جو پاگل خانے سے پتہ چلا، وہ بالی ہے۔ لیکن پتہ نہیں یہ نام آپ کی شخصیت سے میچ نہیں کھاتا۔ یوں لگتا ہے جیسے کوئی اپنا اصل چہرہ چھپانے کے لئے بہروپ رچاتا ہے۔ اسی طرح یہ نام ہے۔ اصلی نام پہ پردہ ڈال دینے والا ایک بہروپ۔" ثمین کی بات پہ وہ اُداس سی ہوگئی۔

"آپ کا اصل نام پوچھ سکتی ہوں؟"

کتنی دیر وہ خاموش رہی۔ پھر اس نے بے حد رازداری سے اس خاموشی کو توڑا۔

"پتہ نہیں...... بھول گئی ہوں...... اتنا یاد ہے کہ میرا کوئی نام کبھی تھا تو سہی، مگر وقت وحالات نے اسے بہت بے رحمی سے مجھ سے چھین لیا۔" اس نے کہا۔

"میرے لئے تو اس سے زیادہ باعث تکلیف بات اور کوئی نہیں کہ کوئی مجھ سے

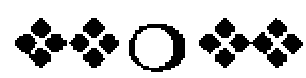
میرا نام اور شناخت چھین لے۔ گمنامی سے زیادہ بھیانک اور کوئی چیز نہیں۔" ثمین نے آئینے میں اس کچھ شناسا، کچھ انجان چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"کبھی کبھی گمنامی پردہ پوشی کا کام بھی تو کرتی ہے۔ جس طرح موت آتی ہے، انسان مر جاتا ہے، اس کے عیب چھپ جاتے ہیں، لوگ اسے بھول جاتے ہیں، اسی طرح گمنامی اس کے ہزاروں عیب چھپا لیتی ہے۔ اگر موت نہ ہوتی تو کس طرح چھپتے کروڑوں انسانوں کے بے شمار عیب؟" بالی کا انداز پرت در پرت اُداسی پھیلا رہا تھا۔

"یعنی آپ اپنا نام نہیں بتائیں گی؟"

"کہا نا، بھول گئی ہوں نام۔"

"ٹھیک ہے...... میں آپ کو آج سے باجی بلایا کروں گی۔ کیونکہ آپ میری بڑی بہن ہیں اور میں آپ کو آپ کا نام یاد دلانے میں بھرپور مدد کروں گی۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کو اپنا نام، اپنی شناخت بہت جلد یاد آ جائے گی۔" ثمین نے پُراعتماد لہجے میں کہا اور اس کے بال مکمل طور پر سلجھا کے پھیلا دیئے۔



"بھئی خان! ڈنر تو بے حد لاجواب تھا۔" کھانے کے بعد سردار صاحب اور وارث فائیو سٹار ہوٹل کی لابی میں کافی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ وارث خوبصورت سے ٹو پیس اور سردار صاحب کلف لگے شلوار قمیض اور ویسٹ کوٹ میں ملبوس تھے۔

"آپ کے پاس ہم میں سے کسی کے لئے وقت ہوتا ہی نہیں۔ یہ ڈنر تو پھر ایک بہانہ تھا آپ کا وقت چرانے کے لئے۔" وارث نے کہا۔

"ہمیں پتہ نہ تھا کہ وارث حسن خان، دراصل جو ہماری فتح کی خوشی سیلیبریٹ کرنے کے لئے ہمیں کھانا کھلا رہا ہے، وہ ہمارے وقت کی چوری کا اِک بہانہ ہے، ورنہ......" سردار صاحب کہتے کہتے رک گئے۔

"ورنہ کیا سردار صاحب؟"

"ورنہ یہ کہ ہم تمہیں خود وقت دے دیتے۔ چوری ڈاکہ ہمیں قطعاً پسند نہیں۔" سردار صاحب نے کافی میں چمچ ہلاتے ہوئے کہا۔ وارث بھی مسکرا دیئے۔ خوش شکل تو وارث

پہلے ہی تھے مگر محبت کی رمق نے اک اور ہی حُسن عطا کیا تھا ان کے چہرے کو۔

''یار خان! تم بہت اچھے لگ رہے ہو آج۔ پہلی بار دل کیا ہے کہ تمہاری شادی کروا دوں۔'' سردار صاحب کہے بنا نہ رہ سکے۔

''تم سے تو کئی رشتے ہیں میرے۔ بیٹے بھی ہو، بھائی بھی، دوست بھی ہو اور میرا دایاں ہاتھ بھی۔ تم نہ ہوتے تو تمام سفر میرے لئے دشوار ہوتے۔ سیاسی، کاروباری اور خاندانی زندگی سے انصاف کرنا میرے لئے ممکن نہ ہوتا۔'' جب تک سردار صاحب یہ کہہ رہے تھے، وارث اپنے دل میں الفاظ تراش رہے تھے۔

'کیا کہوں؟ کیسے کہوں؟ کہاں سے شروعات کروں؟ کہاں سے آگے چلوں؟ سردار صاحب! میں آپ کی بیٹی سے......... میں مہر النساء کو پسند......... وہ بھی مجھے پسند......... ہم دونوں شادی......... نہیں، نہیں۔' الفاظ کے جالے وارث کے ذہن میں بنتے رہے، ٹوٹتے رہے۔

''تم نے ہمارے لئے اتنا کچھ کیا ہے وارث! اب ہم چاہتے ہیں کہ تم بھی مکمل طور پہ سیٹل ہو جاؤ۔ شادی کر کے اپنا گھر بسا لو۔ ہماری دونوں گارمنٹس ملز اب تم اکیلے ہی سنبھالنا۔ بچوں کے شیئرز کے علاوہ جو میرا حصہ ہے، وہ میں تمہارے نام کر دوں گا۔'' کافی کے چھوٹے چھوٹے سپ لیتے ہوئے سردار صاحب کہہ رہے تھے۔ لیکن وارث کا تمام تر دھیان اپنے اندر بنتے اور ٹوٹتے جملوں میں تھا۔

''تم میری بات پر دھیان نہیں دے رہے خان! ذہن میں پھر کوئی فیکٹری میٹر چل رہا ہے؟'' واجد مسکرائے۔

''نہیں سردار صاحب! میں سن رہا ہوں۔ بس، دراصل.........'' وہ شروعات کرنا چاہتے تھے۔

''دراصل، دراصل چھوڑو خان۔ ذرا دیر تو کاروبار کو چھٹی دے دیا کرو۔ زندگی کی کچھ چیزیں بہت اہم ہوتی ہیں۔'' سردار صاحب آج بے حد اچھے موڈ میں تھے۔

'جو بات میں آپ سے کہنے لگا ہوں سردار صاحب! وہ میری زندگی کی اہم ترین اور خوبصورت ترین بات ہے۔' وارث کے دل سے آواز آئی۔ وہ بس الفاظ کے تانے بانے تقریباً بُن چکے تھے۔ اب انتظار میں تھے کہ کب سردار صاحب خاموش ہوں اور

وہ کچھ کہیں۔

''میں آپ سے کچھ ضروری گفتگو کرنا چاہتا ہوں سردار صاحب!'' بالآخر انہوں نے شروعات کر دی۔

''بھئی ضرور کرو۔ لیکن اپنی فیکٹری، مل، یونین ورکر پرابلم، پارٹی افیئرز کا موضوع مت کھولنا۔ کیونکہ میں بھی بے حد اہم مسئلہ تم سے شیئر کرنا چاہتا ہوں۔'' سردار صاحب نے کافی ختم کر کے بے حد ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

''کہئے سردار صاحب! میں ہمہ تن گوش ہوں۔'' وہ مسکرائے۔

''نہیں، نہیں۔ پہلے تم کہو۔ تمہاری بات ہم سے زیادہ مختصر ہوگی۔''

''ویسے اتفاق سے سردار صاحب! اس بار میری بات آپ کی بات سے زیادہ لمبی ہوگی۔ وہ موضوع ہی ایسا ہے۔'' وارث مسکرائے۔

''تو پھر ٹھیک ہے۔ ہم کہیں جو ہمیں کہنا ہے؟'' سردار صاحب نے کہا۔

''جی، شروعات کیجئے۔ آپ کا وقت شروع ہوتا ہے اب۔'' وارث نے کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں تو وارث! میں تمہیں یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ چوہدری ساجد نے اپنے چھوٹے بیٹے سلمان کے لئے مہر النساء کا ہاتھ مانگا ہے۔ لڑکا قابل ہے، اچھا، باشعور، پڑھا لکھا ہے۔ مہرو کا ہم عمر بھی ہے۔ مجھے تو اس رشتے میں کوئی قباحت محسوس نہیں ہوتی۔ تم کہو، کیا کہتے ہو؟''

''دھڑ......... دھڑ......... دھڑام.........

وارث کے اندر اک دھماکہ ہوا کہ ان کی ساعتوں کے پرخچے اُڑ گئے۔ عجیب چھناکے سے ہو رہے تھے دل میں۔ جیسے قد آدم آئینے اٹھا اٹھا کر توڑے جا رہے ہوں۔

''ہم جانتے ہیں تمہارے دل میں سو طرح کے احساسات جاگیں گے۔ کیونکہ مہرو ہم سے زیادہ تم سے اٹیچ ہے۔ لیکن مجھے پتہ نہیں، کیوں لگتا ہے کہ یہ رشتہ مہرو کے جوڑ کا ہے۔ بے شک چوہدری ساجد نے ہمیں کئی چرکے لگائے ہیں۔ لیکن اب اس کی معافی اور لڑکے کا اچھا ہونا ہمارے دل کو بھا گیا ہے۔ میں نے تو اپنی طرف سے فیصلہ کر لیا ہے۔ دیکھو نا وارث! اس سیاسی اور سماجی منصب پر فائز ہو کے اپنے جوڑ کا کوئی

رشتہ تلاش کرنا بہت مشکل کام ہے۔ پھر چوہدری کو ہم بہت برسوں سے جانتے ہیں۔ بالکل انجان آدمی کے ہاتھ اپنے جگر کا ٹکڑا سونپنے سے بہتر ہے کہ ہم اپنے جان پہچان کے شخص سے رشتہ جوڑ لیں۔''

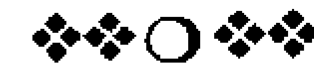
سردار صاحب اور بھی بہت کچھ کہہ رہے تھے۔ مگر وارث کی تمام کی تمام حسیات گویا ناکارہ ہوگئی تھیں۔ وہ گونگوں بہروں کی طرح سردار صاحب کے چہرے کو دیکھ رہے تھے۔ مگر اب ان کے سامنے سے سردار صاحب کا چہرہ بھی غائب ہوگیا تھا۔ ایک گھنا اور گہرا دھواں تھا اور اس دھوئیں کے اس پار مہر النساء کا چہرہ تھا۔ اس کی ڈوبتی آواز تھی۔

یہ کیا ہوگیا ان کے ساتھ؟

یہ کیسا کھیل کھیلا قسمت نے؟

کس طرح کا مذاق کیا تقدیر نے؟......کیوں، کیوں، کیوں؟

وہ عجب حیرانی سے سردار صاحب کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔



یہ داتا صاحب کے دربار کا کشادہ صحن تھا۔ جہاں لوگوں کی بے پناہ بھیڑ میں مہر النساء آسمان کی جانب ہاتھ اٹھائے اپنی قسمت کی لکیروں میں وارث کے نام کے حروف جوڑے جارہی تھی۔

جمعرات کا دن تھا۔ عقیدت مندوں، نیاز اور نذرانے پیش کرنے والوں سے سفید ماربل والا فرش، ٹین کی چھت سے ڈھکی ہوئی راہداری، مسجد کے پاس والا حصہ اور مزار کا اندرونی حصہ بھرے پڑے تھے۔ دکھوں کے مارے، حاجتوں کے بوجھ سے دبے، بیماریوں سے ٹوٹتے، پریشانیوں میں مبتلا لوگ سب داتا صاحب کے دروازے پہ اپنے خدا کے حضور دعا گو تھے۔

مہر النساء گلابی کاٹن کا جوڑا اور سفید شفون کا دوپٹہ سر پہ اوڑھے دونوں ہاتھ دعا کے لئے اٹھائے دعا گو تھی۔ پُر اُمید تھی۔ منتظر تھی۔

قوالی کے بول مہر علی شاہ کے تھے، جس کے مانوس پُر اثر اور جاندار الفاظ مہرو کے دل پہ اثر انداز ہو رہے تھے۔

کتھے مہر علی، کتھے تیری ثناء
گستاخ اکھیاں کتھے جا لڑیاں
اس صورت نوں میں جان آکھاں
جان آکھاں کہ جانِ جہان آکھاں
سچ آکھاں تے رب دی شان آکھاں
جس شاناں توں شاناں سن بنیاں
کتھے مہر علی کتھے تیری ثناء

دعا کے الفاظ کو قوالی کے الفاظ اوور لیپ کرنے لگے۔ مہرو کی آنسوؤں کی جھڑی سی بندھ گئی۔ وہ روتے روتے دعا مانگنے لگی۔

دعا مانگ کے وہ واپسی کے لئے قدم بڑھا رہی تھی کہ اچانک اس نے اپنے سامنے ایک عورت کو پایا۔ خوبرو چہرہ، بنی سنوری شخصیت، کانوں، گلے اور ہاتھوں میں سونا پہنے، خوبصورت ریشمی لباس زیب تن کئے وہ مسکرا کے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ مہرو اس کی طرف متوجہ تھی۔

''مہر النساء!'' عورت کے ہونٹوں سے بے اختیار ادا ہوا اور مہرو کے پاؤں میں وہی لرزش آئی جو پچھلے روز اس وحشت زدہ کے پکارنے پہ دوڑی تھی۔ مہرو نے غور سے اس عورت کے چہرے کو دیکھا۔ وہ ہو بہو تصاویر اور رسالوں سے نکلی عورت محسوس ہوئی تھی۔ بجی سجائی، صاف ستھری۔ اور مہرو نے دیکھا اس عورت کے بالکل پیچھے وہی کل والا شخص تھا۔ اسی لباس اور انہی سرخ آنکھوں کے ساتھ۔ مہرو کے دل کی دھڑکن ایک بار پھر دوڑنے لگ گئی۔

''مہر النساء......تم مہر النساء ہو نا؟......زیب کی بیٹی؟'' عورت نے وہی سوال دوہرایا جو کل اس شخص نے کیا تھا۔

''جی ہاں۔ میں مہر النساء ہوں۔ آپ کون ہیں؟'' وہ خود کو سنبھالتے ہوئے بولی۔

''ہم جہاں آراء ہیں، تمہاری خالہ، زیب کی چھوٹی بہن۔ آؤ، ہمارے سینے سے لگ جاؤ۔'' جہاں آراء نے مہرو کو پکڑ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ مہرو پہ اس وقت کوئی بات اثر انداز نہیں ہوئی۔ نہ اس عورت کے ملبوس سے پھوٹتی عطر اور تازہ پھولوں کی

خوشبو اور نہ اس کے لہجے کا جادو۔ لیکن اس کا وہ رشتہ جو اس عورت نے بتایا تھا، وہ مہرو کے اندر تک اثر انداز ہو رہا تھا۔

''مہر النساء! ہم تم سے ملنے آئے ہیں، تم سے بات کرنے آئے ہیں۔ اور نہ صرف ہم بلکہ تمہاری نانی جان بھی تم سے ملنا چاہتی ہیں۔ جب سے ہمیں اس بانکے نے بتایا ہے کہ اس نے تمہیں دیکھا ہے، ہم تب سے تڑپ رہے ہیں تم سے ملنے کو۔ تمہارے بنگلے پہ بھی گئے تھے مگر وہاں سے پتہ چلا کہ تم داتا دربار آئی ہو۔ بانکا تمہیں پہچانتا تھا، اس لئے میں اسے ساتھ لائی۔'' جہاں آراء نے اپنے نرم اور مخملی ہاتھوں سے مہرو کے گالوں کو چھوا۔

''اس نے کیسے مجھے پہچانا؟ اور میں کس طرح یقین کرلوں کہ آپ میری خالہ ہیں؟'' مہرو نے مشکوک انداز میں پوچھا۔

''تمہارے سبھی سوالوں کا جواب تمہیں مل جائے گا جان! تم ہمارے ساتھ چلو تو سہی۔ بانو بی چل نہیں سکتیں ورنہ وہ خود اپنے جگر کے ٹکڑے کو لینے آتیں۔'' جہاں آراء نے کہا۔

''بانو بی؟...... یہ بانو بی کون ہیں؟''

''تمہاری نانی جانی۔ میری اور زیب کی امی۔ ان کو بھی علم ہے تمہاری آمد کا۔ تم چلو تو ان سے ملنے۔'' جہاں آراء نے مہرو کا ہاتھ تھاما۔

''کہاں لے جائیں گی آپ مجھے؟...... ہیرا منڈی؟ میری نانی کا تعلق تو وہیں سے تھا نا؟'' مہرو کے لہجے میں طنز کی ہلکی سی جھلک تھی۔

جہاں آراء کے چہرے پہ اِک سایہ سا لہرایا۔

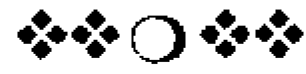
''بہت عرصہ ہوا، ہم نے وہ جگہ چھوڑ دی۔ ڈیفنس میں بنگلہ ہے میرا۔ وہ تم سے صرف ایک بار ملنا چاہتی ہیں۔ بہت علیل ہیں۔ کینسر نے ان کی زندگی کی امید بھی ختم کر دی ہے۔ ان سے صرف ایک بار مل لو، تڑپ رہی ہیں اپنی زیب کی نشانی کو دیکھنے کے لئے۔ تمہارے تمام سوالوں کے جواب تمہیں وہیں مل جائیں گے۔'' اب جہاں آراء کے لہجے میں منت اور التجا تھی۔ مہرو لحہ بھر سوچتی رہی۔

''ٹھیک ہے...... لیکن میں اپنی گاڑی میں جاؤں گی اور وہاں ایک گھنٹے سے

زیادہ نہیں رُکوں گی۔'' اس نے فیصلہ کرلیا۔ جہاں آراء کے چہرے پہ مسرت دوڑ گئی۔

''ہماری سرخ رنگ کی شیراڈ گاڑی ہے۔ بانکا اور میں اس میں جائیں گے۔ اور تم اپنی گاڑی میں آؤ میری جان!''

وہ مہرو کا ہاتھ تھامے دربار کی بھیڑ کو چیرتی اسے اپنے ساتھ لے جانے لگی۔ قوالوں کی مسحور کرتی آواز کہیں پیچھے رہ گئی۔



سردار صاحب کو گھر ڈراپ کرنے کے بعد وارث اپنے ٹوٹے پھوٹے منتشر دل کے ہمراہ ایک بار پھر ساحل سمندر پہ آ گئے تھے۔

لہروں سے زیادہ قیامت برپا تھی آج ان کے دل کے اندر...... کسی کو پانے سے پہلے ہی کھو دیا۔ آشیانے کے پہلے تنکے کو لگانے سے پہلے ہی طوفان کی ایک اندھی ہوا نے تنکا تنکا بکھرا دیا۔ خوابوں کو پامال کیا۔

وہ جانتا تھا کہ اگر مہر النساء کو پتہ چل گیا تو وہ اللہ کی پوری کائنات توڑنے پھوڑنے کو تیار ہو جائے گی۔ روئے گی، چلائے گی، احتجاج کرے گی۔ وارث کو کورٹ میرج پہ مجبور کرے گی۔ باپ کے خلاف اعلانِ جنگ کرے گی۔ یہاں تک کہ اپنی جائیداد اور حقوق سے بھی دستبردار ہو جائے گی۔

مہرو جیسی جذباتی، بہادر اور خواب دیکھنے والی لڑکی کے آگے کچھ بھی ناممکن نہ تھا۔ اسے اپنی محبت کے آگے بدنامی اور بربادی کی مطلق پرواہ نہ تھی۔

لیکن وارث جانتے تھے کہ سردار صاحب جیسے شخص جن کو ہر بات میں اپنی سیاسی جگہ، سماجی پوزیشن، اپنے روابط اور اسٹیٹس کی فکر ہوتی ہے وہ بیٹیوں کی اس طرح کی ضد کے آگے گردن تو جھکا لیتے ہیں۔ لیکن بیٹیوں کو فراموش کر کے ان جیسے لوگوں کے لئے عزتیں اور شملے زندگیوں اور خواہشوں سے زیادہ پیارے ہوتے ہیں۔

آنسو، آہیں، عشق کی تڑپ، ارمان، راتوں کی سلگتی خواہشیں، بھٹکتے خواب ان پتھر صفت سیاستدانوں اور بیوروکریٹس کے دلوں پہ اثر انداز نہیں ہوتے۔ ان کے لئے محبت، شادیاں فقط کاروباری لین دین کی حیثیت رکھتی ہیں۔ بیٹیاں دے کر دوستیاں نبھانے، سیاسی اور سماجی روابط مضبوط کرنے والے بچیوں کی کم عمری کے خوابوں کو کہاں

اہمیت دیتے ہیں؟

اور وارث خود بھی سردار صاحب کو دھکا دے کے یا ان کا دل دُکھا کے مہرو کو حاصل کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کی نس نس میں سردار صاحب کے نمک کا حصہ تھا۔ ان کی شخصیت کی بناوٹ، ان کی تعلیم سبھی کچھ خدا کے بعد سردار صاحب کی دین تھی۔

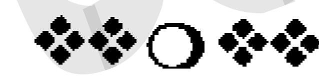
لٰہذا بغاوت پہ نہ دل آمادہ تھا اور نہ خود داری۔ سرکشی کا حوصلہ تھا تو سہی مگر ضمیر کے کچوکے روح کو لرزائے دیتے تھے۔

مگر کیا دل کے کھنڈر کو اپنی رنگ برنگی ہستی اور پھولوں جیسے سراپے سے منور کرنے والی لڑکی کو فراموش کرنا ممکن تھا؟...... کیا اسے کسی اور کو سونپ دینا، کسی اور کا ہوتے دیکھنا آسان تھا؟

نہیں...... نہیں...... نہیں۔

لہروں نے زوردار ٹکر ساحل کے پتھروں سے ماری۔ جھاگ اُڑاتا پانی دیوار پہ اُڑتا ہوا آسمان کو چھونے کی کوشش کرنے لگا۔ آسمان، جہاں پوری تاریخوں کا چاند تھا۔ چاند جس کی تمنا میں سمندر تڑپتا ہے۔ مگر اس کو پانا خواہشِ لاحاصل ہے، جیسے مہرو کو پانا وارث کے لئے خواہشِ لاحاصل ہے۔ مہرو اور چاند...... وارث اور سمندر......

اِک جھاگ اُڑاتی وحشی لہر اُڑی اور وارث کے دل سے ٹکراتی ہوئی آسمان کو چھونے لگی۔



''بانو بی! بانو بی! اُٹھئے، دیکھئے کون آیا ہے۔'' جہاں آراء نے بستر پہ لیٹی لاغر و لاچار سی بوڑھی عورت کو سہارا دے کر اٹھایا۔

یہ بنگلہ ڈیفنس کے علاقے میں نیا تعمیر شدہ تھا۔ طرزِ تعمیر اور اندرونی سجاوٹ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ چوبی منقش دروازے، مخملی دبیز غالیچے، روشنی دینے کے لئے جدید طرز کے فانوس اور لیمپ۔ لیکن بوڑھی عورت کے اس کمرے میں کچھ خاص نہ تھا سوائے فرنیچر کے۔ تپائی پہ ڈھیر ساری چھوٹی بڑی دوائیاں اور پانی رکھا تھا۔ ساتھ ہی ایک لکڑی کا فوٹو فریم تھا جس میں اک تصویر تھی۔

مہرو نے غور کیا، اس تصویر میں جہاں آراء اور اس عورت کے ساتھ ایک اور چہرہ تھا۔ اور پھر مہرو کیسے نہ پہچانتی اس چہرے کو۔ یہ وہی چہرہ تھا جسے اس نے آٹھ برس

تک ماں کے روپ میں دیکھا تھا۔ ہاں...... وہی صبیح، خوبصورت، دلفریب چہرہ۔ وہی جگمگاتی مسکراہٹ۔ وہی روشن آنکھیں۔ اور ان کے ساتھ ایک دو ڈھائی سال کی بچی کا چہرہ بھی تھا جس نے گلابی رنگ کی خوبصورت سی فراک اور ٹوپی پہن رکھی تھی۔

مہرو نے اندازہ لگایا کہ یہ بچی شاید وہ خود ہے، اپنی خوبصورت ماں کی گود میں ستارے کی طرح جھلملاتی ننھی سی۔ مہر النساء نے تصویر کے ساتھ لیٹی اس بیمار بوڑھی عورت کی طرف دیکھا۔

''کون آیا ہے جہاں آرا؟...... ہمیں تو مہرو کا انتظار ہے۔'' اس عورت نے پُراُمید آنکھوں سے جہاں آراء کی طرف دیکھا۔

''بانو بی! مہرو آئی ہے۔ میں مہرو کو اپنے ساتھ لائی ہوں۔ اُٹھئے، ملئے اس سے۔ یہ دیکھیں، آپ کے سامنے کھڑی ہے وہ۔ ہوبہو زیب جیسی۔ وہی آنکھیں، وہی ناک، وہی قامت۔ دیکھئے تو بانو بی!'' جہاں آراء نم آنکھوں سے مسکرانے لگیں۔

بانو بی نے کانپتے ہاتھوں سے آنکھوں پہ چشمہ چڑھایا اور مہرو کی جانب دیکھا جو ان کے سامنے حیرت سے بت بنی کھڑی تھی اور اس پہ ایک نظر ڈالتے ہی بانو بی کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ عینک کے دبیز شیشے کے اندر آنسوؤں کا غبار چھا گیا۔ انہوں نے کھینچ کے مہرو کو اپنے بیمار سینے میں چھپا لیا۔ مہرو بھی ان کے سینے سے لگ گئی۔ اس کی آنکھوں میں نہ مسرت تھی اور نہ نمی۔ ملنے کی کوئی خوشی بھی نہ تھی۔ اتنا تو اسے یقین آ گیا تھا کہ وہ اس کی نانی ہیں لیکن ان سے ملنا اس کے لئے کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔

وہ ان کے سینے سے لگی بھی اپنی ماں کی تصویر کی طرف دیکھتی رہی۔

''میری مہرو! میری زیب کی نشانی!...... تُو کہاں تھی میری بچی؟...... تجھے کتنا ڈھونڈا، تیرے باپ کو کتنے سالوں تک پیغام بھجواتی رہی کہ مجھے مہرو سے ملوا دو۔ مگر اس نے ایک بار بھی تمہارا چہرہ نہ دکھایا۔ سترہ سال سے تڑپ رہی ہوں تمہاری صورت دیکھنے کے لئے...... سترہ سال پہلے آخری بار تجھے زیب کے ساتھ دیکھا تھا اور اس کے بعد......''

بانو بی تڑپ کے رو دی تھیں۔ ہچکیاں بندھ گئیں۔ مہرو کے گلابی جوڑے والا کندھا آنسوؤں سے تربتر ہونے لگ گیا۔

''کینسر نے بری طرح جکڑ لیا ہے اپنے ظالم پنجوں میں......... کہیں آ جا بھی نہیں سکتی۔ لیکن اب عمر بھی تو جانے کی ہو گئی ہے......... اب تو زندگی میں نہ کوئی ارمان بچا ہے اور نہ کوئی رمق۔ زیب کیا بچھڑی، میری تو جیسے زندگی ہی اُجاڑ ہو گئی۔ اولاد کی جدائی سے بڑھ کر اور کوئی زخم نہیں ہوتا۔'' بانو بی آہستہ آہستہ مہرو سے باتیں کر رہی تھیں۔

''لیکن جہاں تک مجھے علم ہے، امی تو بہت پہلے آپ کو چھوڑ آئی تھیں۔ ریڈ لائٹ کی فضاؤں میں سانس لینا انہیں منظور نہ تھا......... انہوں نے علیحدہ سے اپنی زندگی کی شروعات کی اور میرے بابا سے شادی کر لی۔'' مہرو نے کہا۔

''یہ تو بہت پرانی باتیں ہیں مہر النساء! تمہارے والد سے شادی کے بعد میں نے زیب سے معافی مانگی تھی۔ اس کا اور ہمارا ٹوٹا تعلق دوبارہ سے جڑ گیا تھا۔ لیکن یہ تعلق تمہارے والد کو نامنظور تھا۔ وہ زیب کو ہم سے جدا کر کے فلم انڈسٹری چھڑوا کے کراچی لے گیا۔ پھر وہ ہم سے ایسی جدا ہوئی کہ دوبارہ نہ ملی۔'' بانو بی نے نہایت افسردگی سے تمام باتیں مہرو کو بتائیں۔

''مجھے نہیں پتہ حقیقت کیا ہے۔ لیکن آپ کی باتوں سے مجھے لگ رہا ہے کہ بابا آپ لوگوں کو پسند نہیں کرتے۔ شاید میرا یہاں آنا بھی گراں گزرے گا۔ مجھے یہاں سے جانا چاہئے۔'' وہ ہاتھ میں پکڑا جوس کا گلاس ٹیبل پر رکھتی اُٹھنے لگی۔

''رک جاؤ مہرو! اس طرح بے رخی برت کے تو نہ جاؤ۔ دل میں خلش چھوڑ کے تو نہ جاؤ۔'' جہاں آراء نے اسے کندھے سے تھام لیا۔

''میں نے آپ سے ایک گھنٹے کی ملاقات کا وعدہ کیا تھا اور یہاں پہ مجھے ایک گھنٹے سے زیادہ ہو گیا ہے......... مجھے جانے دیں۔'' وہ مصر تھی۔

''دوبارہ آؤ گی مہر النساء؟'' بانو بی نے پُر اُمید آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''مجھے نہیں معلوم۔ میں اپنے بابا سے بات کروں گی۔ اگر انہوں نے اجازت دے دی تو ضرور آؤں گی۔'' وہ بولی۔

''اس نے تمہیں کیا اجازت دینی ہے۔ وہ تو مرتے دم تک تمہیں یہ بھی نہ بتاتا کہ اس دنیا میں اقبال بانو نام کی کوئی عورت تمہاری نانی بھی ہے جو زندگی کے آخری دن

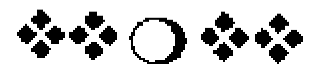
تمہیں دیکھنے کی تڑپ میں بسر کر رہی ہے۔'' بانو بی نے تمسخرانہ ہنسی ہنس کے کہا۔

مہر النساء نے ٹھنڈی سانس لی۔

''میرا یہاں پہ مزید رُکنا میرے لئے بھی مناسب نہیں۔ میں......... میں دوبارہ آنے کی کوشش کروں گی۔ خدا حافظ!''

یہ کہتی ہوئی مہرو تیزی سے کمرے کا دروازہ عبور کر گئی۔ اس سے پہلے کہ اسے کوئی عقب سے آواز دیتا، وہ خاموش قدموں سے دبیز غالیچوں پہ چلتی ہوئی باہر گاڑی تک آئی۔

آدھی رات بیت چکی تھی۔ اسے یوں لگا جیسے یہ سناٹا اسے ایک پراسرار، آسیب زدہ مکان میں لے گیا تھا اور جہاں آراء، بی بانو اور بانکا انسان نہیں، آسیب تھے۔



یہ باتیں جھوٹی ہیں، یہ لوگوں نے پھیلائی ہیں
تم انشاء جی کا نام لو، کیا انشاء جی سودائی ہیں؟
ہیں لاکھوں روگ زمانے میں کیوں عشق ہے رُسوا بیچارہ
ہیں اور بھی وجہیں وحشت کی، انسان کو رکھتیں دکھیارہ
ہاں بے کل بے کل رہتا ہے وہ پریت میں جس نے جی ہارا
پر شام سے لے کر صبح تلک یوں کون پھرے گا آوارہ؟
وہ لڑکی اچھی لڑکی تھی، تم نام نہ لو ہم جان گئے
وہ جس کے لانبے گیسو تھے، پہچان گئے پہچان گئے
ہاں ساتھ ہمارے انشاء جی اس گھر میں تھے مہمان گئے
پر اس سے تو کچھ بات نہ کی، انجان رہے، انجان رہے
یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں، یہ لوگوں نے پھیلائی ہیں

انشاء جی کی خوبصورت نظم کے بول خنک سے ماحول میں بکھرے بکھرے محسوس ہو رہے تھے۔ دُلہن کے کمرے میں سبھی لڑکیاں براجمان تھیں، سی ڈی پلیئر پہ عابدہ پروین کی آواز میں انشاء کے ذہن سے نکلے خوبصورت الفاظ ہر سُو بکھر رہے تھے۔

یہ رات گئے کا عمل تھا۔ اس سے پہلے لڑکیوں کی کھی کھی اور لطیف گفتگو کی آوازیں

آ رہی تھیں مگر اس نظم کے شروع ہوتے ہی ان کی آواز معدوم ہو گئی۔ بس گیت کے بول تھے جو خلاء تک پھیل رہے تھے۔

کاریڈور نما راہداری میں کھڑا شائل آسمان پہ ٹھہرے چاند کو بھی دیکھ رہا تھا اور نظم کے الفاظ بھی اپنے اندر اُتار رہا تھا...... عجیب کشمکش کے عالم میں تھا وہ دل۔ انکار و اقرار، خاموشی اور اظہار کے درمیان جھول رہا۔

جو ہم سے کہو ہم کرتے ہیں، کیا انشاء کو سمجھانا ہے
اس لڑکی سے بھی کہہ لیں گے کہ اب کچھ اور زمانہ ہے
یا چھوڑیں یا تکمیل کریں یہ عشق ہے یا افسانہ ہے
یہ کیسا گورکھ دھندا ہے، یہ کیسا تانا بانا ہے

گیت کے بول ایک بار پھر چاند کی چاندنی کے ہمراہ فضا میں رقص کرنے لگے۔ انشاء جی کے الفاظ میں چھپی بے پناہ معصوم محبت شائل کے دل میں بھی سانس لینے لگی۔ ماہا کا چہرہ بوتل کے دُھوئیں کی طرح کبھی چاند کے پاس تو کبھی گیت کے بولوں میں سے اُبھرنے لگا۔

اس کے بال، اس کی آنکھیں، اس کے ہونٹوں سے جھڑتے باتوں کے پھول، اس کا مہکتا ملبوس، اس کی رنگ برنگی ساڑھیاں، کوئی اس جیسا نہ تھا...... نہیں، کوئی اس جیسا نہیں۔ کسی لڑکی کی آنکھوں، ہونٹوں، بالوں، باتوں، کسی کے لباس، کسی کی چال ڈھال میں وہ بات نہیں جو ماہا میں ہے۔ چاہے وہ اٹھارہ سال کی کوئی اَن چھوئی کلی ہو یا پھر پچیس سال کی دوشیزہ۔ جو بات اس دو بچوں کی ماں میں ہے، وہ کسی میں نہیں۔

یہی تو تھا وہ چہرہ جسے میں نے تصورات اور تخیل کے کینوس پہ اپنے ہاتھوں سے نقش کیا تھا۔ یہی تو جھلملاہٹ تھی ان آنکھوں میں۔ یہی تو حُسن تھا اس مسکراہٹ میں۔ وہ خاموش، سادہ، مبہم سی مسکراہٹ۔

وہ نرم سے پنکھڑی ہونٹ جو اگر مائیکل اینجلو بھی دیکھتا تو وہ مونا لیزا کی سپاٹ اور گونگی مسکراہٹ کے پیچھے اپنا وقت برباد نہ کرتا۔

وہ آنکھیں اگر غالب دیکھتا تو وہ کسی مے میں، کسی جام میں ڈوبنے کی تمنا نہ کرتا، اپنی تمام تر شاعری ان آنکھوں کی تمنا میں رقم کرتا۔

وہ باتیں اگر میرؔ سنتا تو شاید اپنی شاعری میں اتنے درد و غم جمع نہ کرتا۔ ان خوشگوار باتوں کو سننے کی چاہ میں زندگی کو زندگی کرتا۔

اگر حسرتؔ دیکھتا تو چکی کی مشقت اور اسیری میں بھی اس کی زندگی بہت خوبصورت، بہت جاندار ہو جاتی۔

اگر شائل نے دل کھویا تھا تو کیا کمال ہوا تھا کہ آخر اس کا دل تھا۔ تھا تو معصوم، کم عمر، نیا نیا، کھلا کھلا...... تمام خواب ابھی ابھی نیند سے جاگے تھے۔ تمام آرزوؤں نے ابھی ابھی تو انگڑائی لی تھی اور ان خوابوں کے نیند سے جاگتے ہی ماہا عاطر اس کی آنکھوں کے سامنے آ گئی تھی۔ آرزوؤں نے جوں انگڑائی لی، ویسے ہی اس کے دل کے تمام راستے ماہا عامر نے بھر دیئے، روشن کر دیئے، منور کر دیئے۔

انشاء جی کی نظم سنتے سنتے شائل نے ارادہ کیا کہ وہ ماہا کو اقرار کی آگہی ضرور دے گا...... ضرور دے گا۔



وارث نے بہت سوچ سمجھ کے ایک فیصلہ کیا تھا۔ جانتے تھے کہ ان کا کیا یہ فیصلہ ان سے زیادہ مہرو کے لئے تکلیف دہ ثابت ہوگا۔ وہ شدت پسند جذباتی لڑکی ذہنی طور پر بہت ڈسٹرب ہو جائے گی۔ جتنا خود ٹوٹے گی، اس سے زیادہ دنیا کو توڑ پھوڑ دے گی۔ جانتے تھے کہ یہ لمحوں کا فیصلہ عمروں پہ محیط ہو جائے گا۔ مگر ان کے پاس اور کوئی راستہ نہ تھا۔ وہ سردار صاحب کی نظروں میں گرنا نہیں چاہتے تھے اور بغاوت کے علم ان سے اٹھائے نہ جاتے۔ لہٰذا انہوں نے خاموشی سے ہائر اسٹڈیز کی خاطر لندن جانے کا پلان بنایا اور کسی دوست کے توسط سے چند ہی دنوں میں ویزا حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ان چند دنوں میں مصروفیت کا بہانہ بنا کر انہوں نے ایک بار بھی مہرو سے بات نہیں کی۔ وہ اس کی آواز سن کے کمزور نہیں پڑنا چاہتے تھے۔

سردار صاحب کے سامنے جب انہوں نے اپنا ویزا اور ٹکٹ رکھا تو سردار صاحب حیرت اور بے یقینی سے ان کی جانب دیکھنے لگے۔

’’یہ کیا ہے خان؟‘‘ وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں بول پائے۔ وارث کے چہرے پہ اک مصنوعی مسکراہٹ آ گئی جو کہ مسکراہٹ کم اور دکھ کا تاثر زیادہ تھی۔

’’میں لندن جا رہا ہوں سردار صاحب! کل رات کی فلائٹ سے۔‘‘ وہ اطمینان سے بولے۔ حالانکہ یہ اطمینان انہیں اندر سے توڑ پھوڑ رہا تھا۔

’’لیکن کیوں؟........اس اچانک فیصلے کا مقصد جان سکتا ہوں؟........ یہ کوئی لاہور یا پنڈی جانے کی بات تو نہیں، سمندروں کا سفر ہے۔‘‘ سردار صاحب اس کو بغور دیکھنے لگے۔

’’آج کل تو یہ بھی لاہور یا پنڈی جانے کے مترادف ہو گیا ہے سردار صاحب! بھلا آٹھ نو گھنٹے کیا حیثیت رکھتے ہیں؟ آٹھ گھنٹے میں بندہ لندن سے کراچی پہنچ جاتا

ہے۔‘‘ وہ بولے۔

’’لیکن ہم تمہارے بغیر کیسے رہیں گے خان؟........زین اور مہر النساء کیسے رہیں گے؟ ہمیں تمہاری کتنی عادت ہے۔‘‘

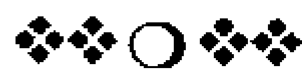
’’میں کوئی ہمیشہ کے لئے تھوڑی جا رہا ہوں سردار صاحب! صرف تین سال ہی کی تو بات ہے۔‘‘

’’لیکن تین سال کوئی معمولی عرصہ نہیں ہوتا۔ ہم چند ماہ میں مہرو کی شادی کا سوچ رہے ہیں اور تمہاری موجودگی لازمی ہے۔‘‘

’’میں مہرو بی بی کو سمجھا دوں گا، سب کچھ ٹھیک طرح سے ہو جائے گا۔‘‘

’’خان! ہمیں اکیلا کر کے جا رہے ہو۔‘‘ سردار صاحب نے دکھ سے ان کے چہرے کو دیکھا۔

’’نہیں سردار صاحب! میں خود اکیلا اور تنہا ہو کے جا رہا ہوں۔‘‘ وارث بے حد تاسف سے بولے۔ آنکھوں میں نمی سی جھلملا رہی تھی۔ سردار صاحب ان کا چہرہ دیکھتے رہ گئے۔



حد نگاہ تک پھیلا ہوا وہ خاموش قبرستان تھا، جہاں مہر النساء اپنی والدہ کی قبر دیکھنے آئی تھی۔ جہاں آراء اور بانکا اس کے ہمراہ تھے۔ یوں تو وہ ان لوگوں سے زیادہ روابط نہیں رکھنا چاہتی تھی لیکن والدہ کی آخری آرام گاہ دیکھنے کی خواہش اس کے اندر مچل رہی تھی۔ کیونکہ اس نے آج تک اپنی ماں کی قبر نہیں دیکھی تھی۔ کئی بار اس نے بابا سے کہا مگر وہ ہمیشہ یہ کہہ کے ٹال گئے کہ عورتیں قبرستان نہیں جاتیں۔ اسے علم ہی نہ تھا کہ اس کی ماں کہاں اور کس قبرستان میں مدفون ہے۔ لہٰذا اس نے فون کر کے جہاں آراء کو ساتھ جانے کے لئے کہا۔

وہ بانکے اور جہاں آراء کے درمیان میں چل رہی تھی۔ آج جہاں آراء نے کریم رنگ کی شلوار قمیض کے اوپر کالی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ چلتے چلتے وہ ایک نیم پکی قبر کے سامنے رک گئی جو ایک کونے میں تھی۔ جس کے اوپر کوئی کتبہ، کوئی سایہ نہ تھا۔

’’یہ ہے تمہاری والدہ کا مقبرہ۔‘‘ جہاں آراء نے اشارہ کیا۔

مہرو کے چہرے پہ ایک ویرانی سی آ گئی۔ وہ برسوں بعد اپنی ماں کے روبرو تھی۔ مگر درمیان میں بھربھری مٹی اور اینٹوں کی ایک مضبوط تہہ تھی جس نے اس کی ماں کا چہرہ اس سے چھپا رکھا تھا۔ مہرو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

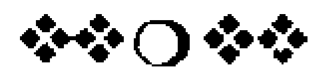
ہائے میری ماں کا خوبصورت اور نازک چہرہ!
وہ آنکھیں، وہ ہونٹ، وہ اپسراؤں کا سا روپ!
یوں تنہا اور لاوارث جنگل میں سویا ہے
یوں ویرانے میں پڑا ہے
کسی کا منتظر
کسی کی آس لگائے!
کہ کوئی تو آئے جو میری قبر پر تازہ پھولوں کی چادر بچھائے!
میرے سرہانے کوئی مٹی کا ننھا سا دیا جلائے!
کوئی تو چند دانے میرے اردگرد بکھرائے
تاکہ پرندے اس کو چگنے آئیں
اور مجھے اس ویرانے میں کسی کی آمد کا احساس ہو!
کوئی اگربتی آ کے جلائے تاکہ اس کی خوشبو مجھے کچھ شگفتگی کا احساس دلائے

مہرالنساء دوزانو ہو کے قبر کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ جہاں آراء ذرا آگے جا کے کونے میں کھڑی ہو گئی اور بانکا ساتھ لائے چاول اردگرد پھیلانے لگا۔ مہرالنساء اسی طرح نیچے بیٹھی مٹی کو اپنے آنسوؤں سے نم کرتی رہی اور دل ہی دل میں ماں سے محو کلام ہونے لگی۔

'ماں! میں آ گئی ہوں ماں!...... دیکھو ماں! تمہاری مہرالنساء آ گئی ہے...... میں نے تمہیں ڈھونڈ لیا ہے ماں!...... مجھے کسی نے تمہارا پتہ نہیں بتایا۔ بابا نے بھی نہیں، مگر ماں! دیکھو، میری لگن سچی تھی۔ میں نے تمہیں ڈھونڈ لیا ماں!...... لیکن مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا ماں! کہ یہ تمہاری قبر ہے...... تم کہ جو اپنے اردگرد خوشبوئیں بسائے بیٹھی رہتی تھیں...... آوازوں سے، سازوں سے تمہیں اتنا پیار تھا، تمہاری قبر اتنی ویران کیسے ہو سکتی ہے ماں؟...... تم تو خوشبوؤں کا پیکر تھیں، تم تو مسکراہٹوں کا

مجمع تھیں، تم تو رنگوں کا محور تھیں، تم تو روشنی کا مرکز تھیں...... کیوں انسان مرنے کے بعد ویرانوں میں بھٹکتا ہے؟ وہی انسان جو ایک دن بھی تنہا گزار نہیں سکتا، اسے اپنے ہی تنہائیوں کے سپرد کر جاتے ہیں، اسے خود کھنڈروں میں دفنا جاتے ہیں، اس کے صبیح چہرے کے اوپر خود ہی منوں مٹی کی تہہ ڈال دیتے ہیں۔ کیونکر ماں؟ کیونکر؟...... یہ موت اور زندگی کا کھیل خدا نے کیوں رچایا ماں؟ کیونکر؟...... تم کہاں ہو ماں؟...... کہاں ہو؟...... مجھے آواز دو...... مجھے آواز دو!'

مہرو بری طرح بلکنے لگی تھی۔ آنکھوں سے لگاتار اشک بہہ رہے تھے۔



آنکھیں موندے ''اللّٰہُ نُورُ السمٰوٰتِ وَالْاَرض'' کی تسبیح کرتی بالی چونک کے، گھبرا کے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اسے یوں لگا جیسے کسی نے اسے پکارا ہو۔ وہ تیزی سے چادر درست کرتی شہرین کے کمرے کی طرف جانے لگی۔ عصر کا وقت تھا۔ ڈھلے دن کی دھوپ پورے کاریڈور میں بکھری پڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں تسبیح تھی، سر پہ چادر، ننگے پاؤں اور چہرے پہ اضطراب۔

شہرین ابھی ابھی آفس سے لوٹی تھی اور کپڑے تبدیل کرنے کے بعد نماز کی غرض سے وہ امی کے کمرے میں جانے کا ارادہ کر رہی تھی کہ اس کے دروازے پہ زور کی دستک ہوئی۔ اس نے دروازہ کھولا۔ سامنے وحشت زدہ سی بالی کھڑی تھی۔

''آنٹی! آپ؟...... خیریت تو ہے؟'' وہ اس کا چہرہ دیکھ کے گھبرا سی گئی۔

''میری...... میری مہرالنساء سے بات کروا دو...... خدا کے لئے شہرین! میری اس سے بات کروا دو۔'' بالی نے دونوں ہاتھ اس کے آگے جوڑ دیئے۔ اس کی آنکھیں نم تھیں۔

''اندر آئیں آنٹی! اور مجھے بتائیں کہ کیا مسئلہ ہے؟'' وہ اس کا ہاتھ تھام کے اسے اندر لے آئی۔ وہ خاموشی سے اندر آ کے اس کے بستر پہ بیٹھ گئی۔

''اب بتائیں، کیا بات ہے؟'' شہرین نے بالی کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

''مجھے مہرالنساء سے ملنا ہے، اس سے بات کرنی ہے...... اسے بتانا ہے کہ اس کی بے قصور ماں کس کس امتحان سے گزری ہے۔'' بالی ٹھہرے ٹھہرے مگر نم ناک لہجے میں بولی۔

"آنٹی! میں نے آپ کو بتایا تھا کہ وہ لاہور گئی ہوئی ہے اور اس کی واپسی کی کوئی خبر نہیں۔ وہ جیسے ہی آ جائے گی، میں اس کی ملاقات آپ سے کروا دوں گی۔"

"لیکن مجھے ابھی بات کرنی ہے۔ مجھے اس کی آواز سننی ہے۔" وہ رو رہی تھی۔

شہرین نے ٹھنڈی سانس لی اور خاموشی سے امی کے کمرے میں آ گئی۔ امی نماز کے بعد بیٹھی تسبیح کر رہی تھیں۔

"امی! آپ جا کے بالی آنٹی کے پاس بیٹھ جائیں۔ ان کی طبیعت خراب ہے۔ میں مہرالنساء سردار کو فون کرتی ہوں۔"

"بیٹا! خیریت تو ہے نا؟" ثمین پریشان ہو گئیں۔

"وہ مہرالنساء سے بات کرنا چاہتی ہیں...... بہت ڈسٹرب ہیں۔ آپ چلیں ان کے پاس، میں آتی ہوں۔" شہرین یہ کہہ کے لاؤنج میں رکھے ٹیلی فون کے پاس گئی اور ثمین اٹھ کے بالی کے پاس آ گئی۔

کچھ دیر بعد شہرین اپنا موبائل فون اٹھائے اس کے پاس آئی۔

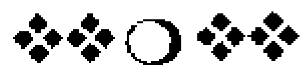
"مہرالنساء کا موبائل نمبر مل گیا ہے۔ میں نمبر ملاتی ہوں۔" وہ کونے میں جا کے اپنے موبائل پہ مہرو کا نمبر پش کرنے لگی۔ بالی کا اضطراب اور بے قراری حد سے سوا ہو گئی۔



قبرستان میں اسی طرح بے قرار بیٹھی مہرو کے موبائل پہ بیل ہوئی۔ وہ بھیگی آنکھوں اور کانپتے ہونٹوں کے ساتھ اپنی ماں سے محو کلام تھی۔ موبائل فون کی یہ ڈسٹربنس اسے قطعاً منظور نہ تھی۔ گھنٹی اسی طرح بجتی رہی۔ بجتی رہی۔ مگر وہ اسے نظر انداز کرتی رہی۔ بالآخر اس نے موبائل نکال کر اسے آف کر دیا۔ وہ اپنی ماں کی آخری آرام گاہ سے دل کھول کے باتیں کرنا چاہتی تھی...... گزشتہ سولہ سال کے تمام دکھ، تمام محرومیاں وہ ماں کے گوش گزار کر دینا چاہتی تھی۔ اس لئے وہ کسی باہر کی دنیا کے بندے سے گفتگو کرنا نہیں چاہتی تھی۔

شہرین نے کئی بار اس کا نمبر ملایا۔ آخر تنگ آ کے اس نے کوشش چھوڑ دی اور بالی کی جانب افسوس بھری نگاہوں سے دیکھا جس کی آنکھیں نم تھیں اور ہونٹ اسی طرح

کسی وِرد کی جنبش میں تھے۔



وارث بھی مہرو سے آخری مرتبہ گفتگو کرنا چاہتے تھے لیکن اس کا فون مسلسل بند تھا۔ وارث عجیب کرب کے عالم سے گزر رہے تھے۔ کل ان کی فلائٹ تھی، مہرو سے کوئی رابطہ ہو نہیں پا رہا تھا اور وہ مہرو کے آگے اپنا آپ بے وفا اور قصور وار ٹھہرائے بغیر جانا نہ چاہتے تھے۔ جانتے تھے کہ مہرو تب ہی انہیں بھلا پائے گی جب وہ انہیں بے وفا اور دھوکے باز تسلیم کر لے گی۔ ورنہ وہ انہیں دنیا کے کسی حصے سے بھی کھوج نکالے گی۔ اس کی شدت پسندی پہ وارث کو یقین تھا اور شاید اس کا ڈر بھی۔ لہٰذا انہوں نے مہرو کو خط لکھنے کا فیصلہ کیا۔

ایک آخری خط...... جو مہرو اور وارث دونوں کی زندگی بدلنے والا تھا۔

جو سچائی کے اوپر کچھ نئے چہرے، کچھ نئے بہروپ چڑھانے والا تھا۔

جو دل کی دنیا کو پامال کرنے والا تھا...... جو آرزوؤں کو قتل کرنے والا تھا۔

اِک آخری خط...... جو محبت کی آخری سانس بن سکتا تھا۔ خواہشوں کے لب سے نکلی آخری آہ بن سکتا تھا...... کپکپائے ہوئے ہونٹوں کی آخری التجا بن سکتا تھا۔

وارث نے کاغذ اور قلم اٹھایا اور مہرو کے نام ٹوٹے پھوٹے لفظوں سے اک آخری تحریر لکھنے لگے۔ لیکن کاغذ پہ لفظوں کی جگہ درد پھیلنے لگا تھا۔

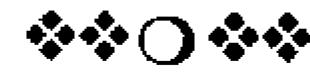
درد پھیل جائے تو
اِک وقت آتا ہے
دِل دھڑکتا رہتا ہے
آرزو گریزوں کے حوصلے نہیں چلتے
دشت بے یقینی میں آسرے نہیں چلتے
رہروؤں کی آنکھوں میں
منزلیں نہ جب تک ہوں، قافلے نہیں چلتے
اِک ذرا توجہ سے دیکھیے تو کھلتا ہے
لوگ ان پہ چلتے ہیں، راستے نہیں چلتے

سوچنے، سمجھنے سے، ساتھ ساتھ چلنے سے
دُوریاں سمٹتی ہیں، فاصلے نہیں چلتے
خواب خواب آنکھوں میں رتجگے نہیں چلتے
درگزر کے حلقے میں مسئلے نہیں چلتے
دو دلوں کی قربت میں تیسرا نہیں ہوتا
''واسطے'' نہیں چلتے
عشق کے علاقوں میں حکمِ یار چلتا ہے
ضابطے نہیں چلتے
حُسن کی عدالت میں، عاجزی تو چلتی ہے
مرتبے نہیں چلتے

وارث کو اپنا دل اپنی انگلیوں میں دھڑکتا محسوس ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں آنسو تھے، دل پہ جبر تھا اور وہ خود اپنے ہاتھوں سے اپنی تقدیر لکھنے چلے تھے۔

اِک تنہا، بے بس، ویران محبت دل کی کھڑکی سے جھانک کے، دو زانو بیٹھی، دونوں ہاتھ جوڑے اپنے آپ کو پامال نہ کرنے کی التجا کر رہی تھی کہ خدارا میرے ساتھ یہ ظلم مت کرو۔ مجھے یوں رُسوا مت کرو۔

مگر آج وارث حسن خان کسی کھنڈر میں رکھا بت بن گئے تھے۔ پتھر کا بت........!



قبرستان سے واپسی پر جہاں آراء اسے اپنے بنگلے پہ لے آئی۔ وہ آنا نہیں چاہتی تھی لیکن آج وہ ذہنی طور پر اس قدر بجھی بجھی تھی کہ زیادہ تردّد بھی نہ کر پائی۔

جہاں آراء کے ڈیفنس والے بنگلے کا صدر دروازہ عبور کر کے وہ جہاں آراء کے ہمراہ اندر آئی ہی تھی کہ سامنے رکھے صوفوں پر اسے دو افراد نظر آئے۔ وہ ان دونوں کو دیکھ کر لمحہ بھر کو رک گئی۔ ان دونوں کی نظر بھی اسی پر ٹک گئی۔ دونوں کی آنکھوں میں عجیب بھوک اور لالچ سی تھی۔ مہرو اندر تک لرز گئی۔

''بیٹا! تم اندر چلو، میں ابھی آتی ہوں۔'' جہاں آراء نے اسے بازو سے تھام کے اندر کی طرف دھکیلا۔ وہ اس طرح دھکیلے جانے پر گھبرا سی گئی اور تیز رفتاری سے لاؤنج

کی راہداری عبور کر کے بانو بی کے کمرے کی جانب جانے لگی۔

'میں یہاں کبھی نہیں آؤں گی..... یہ ٹھیک لوگ نہیں ہیں.....ان دو آدمیوں کی آنکھوں میں کیسی گندگی تھی.....نہیں، میرا ان لوگوں سے کوئی واسطہ نہیں.....شریفوں کے محلوں میں آ بسنے والے کبھی اپنے کاروبار نہیں بدلتے۔' وہ من ہی من میں بڑبڑاتی چلتی رہی۔

اس کے جانے کے بعد جہاں آراء صوفوں پر بڑی بے تکلفی سے بیٹھے ان دونوں افراد کے پاس آئی۔ ان میں سے ایک چوہدری سلمان تھا اور دوسرا اس کا دوست فاروق۔ فاروق پہلے بھی جہاں آراء کے پاس آتا تھا، سلمان کو آج وہ پہلی مرتبہ لایا تھا چونکہ سلمان اس کا خاص دوست تھا۔

''فاروق صاحب! کہئے کیسے ہیں؟ بڑے دنوں بعد آنا ہوا۔'' جہاں آراء بڑی ادا سے بولی۔

''بس کچھ کاروباری مصروفیات تھیں اس لئے ذرا دن لگا دیئے۔ یہ ہیں ہمارے دوست چوہدری سلمان۔ بہت بڑی پولیٹیکل شخصیت کے فرزند ہیں۔ ہمارے مہمان ہیں۔ آج کی رات ان کی مہمان نوازی ہم آپ کو سونپتے ہیں۔'' فاروق ایک آنکھ دبا کے بولا۔

جہاں آراء مسکرا دی۔ اچانک اس کے چہرے پر ایک مخصوص چمک در آئی تھی۔

''زہے نصیب........مہمان نوازی میں ہم سے بڑھ کر اور کون ہو گا۔ کہئے، کس طرح کی چیز پسند فرمائیں گے؟ بلکہ ہم ایسا کرتے ہیں کہ تمام لڑکیوں کو آواز دے دیتے ہیں۔ آپ خود ہی پسند کر لیجئے۔'' جہاں آراء کرسی سے اٹھنے لگی۔

''رُکیے۔'' سلمان نے اسے روکا۔ ''زیادہ پریشان مت ہوں۔ مجھے وہی لڑکی چاہئے جو ابھی آپ کے ساتھ آئی تھی۔'' سلمان نے کہا۔ جہاں آراء کے چہرے پہ اِک تاثر سا اُبھر آیا۔

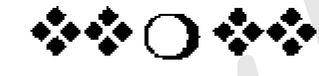
''وہ لڑکی؟........نہیں چوہدری صاحب! وہ لڑکی یہاں کی نہیں ہے۔ ہماری مہمان ہے وہ۔'' جہاں آراء نے نفی میں گردن ہلائی۔

''ہمیں بس ایک رات کے لئے چاہئے۔'' سلمان بضد تھا۔

''چوہدری صاحب! وہ اس بازار کی لڑکی نہیں ہے۔ کسی شریف باپ کی بیٹی ہے۔

وہ آپ کونہیں مل سکتی۔ میرے پاس بیسیوں لڑکیاں ہیں، کوئی ایک پسند کر لیجئے۔''
جہاں آراء نے اسے سمجھایا۔

''نہیں....... وہ نہیں تو کوئی بھی نہیں۔'' سلمان یہ کہتا تیز رفتاری سے باہر کی طرف نکل گیا۔ جہاں آراء اور فاروق دیکھتے رہ گئے۔



وارث نے کراچی ایئرپورٹ کے انٹرنیشنل ڈیپارچر لاؤنج میں قدم آگے بڑھانے سے قبل مڑ کر ایک بار پیچھے دیکھا۔ یقین تو انہیں تھا کہ پیچھے کوئی نہ ہوگا مگر اُمیدیں تو بہرحال زندہ رہتی ہیں۔ چہروں کی بھیڑ میں وہ مہرو کے چہرے کو تلاش کرنے لگے کہ شاید وہ روتی بسورتی، چیختی دھاڑتی، ناراض ہوتی یہاں تک آ جائے۔ ان کا ٹکٹ پھاڑ کے ہوا میں اچھال دے اور انہیں ہاتھ سے کھینچ کے گاڑی میں بٹھا دے۔

کچھ تو ایسا ہو جیسا ہمیشہ ہوتا آیا ہے۔ لیکن ویسا کب ہوتا ہے جیسا انسان سوچتا ہے.....انہوں نے کب سوچا تھا کہ ان کی اور مہرو کی لاہور والی ملاقات آخری ملاقات ثابت ہوگی۔

وہ تو محبت کا دیا جلا کے اسے سلامت رکھنے کے وعدوں کے ساتھ مہرو سے رخصت ہوئے تھے۔ انہیں کیا علم تھا کہ اسی دیے کو خود ہی پھونک کے وہ دُور دیس کی اُڑان بھر لیں گے۔ خوابوں کی تعبیروں کی منتظر اس لڑکی کو تنہا چھوڑ کے اک دن ان دیکھے سفر کی طرف نکل جائیں گے.......اک تنہا، ان دیکھا، طویل سفر۔

وارث نے کلائی پہ بندھی گھڑی کی طرف دیکھا اور قدم آگے بڑھا دیئے۔ مہرو ان کے گھڑی دیکھنے سے ہمیشہ چڑ سی جاتی تھی۔ وہ ہمیشہ انہیں کہتی۔

''آپ کا دل آپ کی گھڑی میں دھڑکتا ہے۔''

قدم قدم پہ آج انہیں مہرو کے جملے یاد آ رہے تھے۔

''وارث! بابا سے بات ضرور کیجئے گا۔''

''میں قصرِ زیب کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی وارث!''

''میں آپ کے وجود کی بہت عادی ہو چکی ہوں۔''

''آپ کی محبت میرے روم روم میں بس چکی ہے وارث!''

''ایک دن بھی آپ کی صورت دیکھے بغیر میری زندگی میں آیا تو میں اس دن سے منہ موڑ لوں گی۔''

کئی ہزار جملے وارث کے راستے میں دیوار بنے کھڑے تھے۔ مہرو کے رنگ بدلتے چہرے کے بے شمار تاثرات، اس کے الفاظ، اس کے آنسو۔

وارث کو اپنے قدم کئی کئی من بھاری محسوس ہو رہے تھے۔ وہ محبت کی تمام دیواروں کو پاؤں سے روندتے آ رہے تھے۔ انہیں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ صحرا میں سفر کر رہے ہوں۔ ریت ہی ریت ہے۔ ان کے قدم آگے بڑھ رہے تھے مگر انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے ان کا ہر ہر قدم مہرو کے خواب کے اوپر پڑ رہا ہو اور وہ اس کے خوابوں کے قتل کے مرتکب ہو رہے ہوں۔

لاؤنج میں بیٹھنے کے بعد بھی انہوں نے کوشش کی کہ وہ مہرو کے موبائل پہ فون کر کے اس سے بات کریں۔ مگر ہمت ہی نہ کر پائے۔ جانتے تھے کہ ابھی وہ خط مہرو تک نہیں پہنچا ہوگا۔ ابھی وہ اس تمام فریب سے انجان ہوگی۔ ابھی اسے علم ہی نہ ہوگا کہ اس کے ساتھ کیا ہو چکا ہے.......لیکن پھر بھی وہ مہرو کی آواز سے گھبرا رہے تھے، ڈر رہے تھے جیسے جلتی بھڑکتی آگ بارش کے پانی سے ڈرتی ہے۔ وارث کے دل کا جنگل بھی آگ کی لپیٹ میں تھا اور اس آگ کو مہرو کی محبت کی بارش بجھا سکتی تھی۔ اسی لئے وہ اس بارش کا سامنا کرنے سے بھی کترا رہے تھے۔ بدک رہے تھے۔ بھاگ رہے تھے۔

جہاز میں بیٹھنے کے بعد بھی ان کے دل کی حالت عجیب سی تھی۔ ان کے دل کو کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا تھا۔ ان کی آنکھوں میں مہرو کا چہرہ نقش ہو کے رہ گیا تھا۔ کبھی پھولوں کی طرح ہنستا، کھلتا، لاڈ کرتا تو کبھی روتا، بسورتا اور ناراض ہوتا وہ پری پیکر چہرہ۔

جہاز پرواز کے مراحل میں تھا۔ وطن کی سرزمین سے اُٹھنے کو تھا۔ وارث نے اِک ٹھنڈی آہ بھری۔

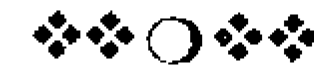
''آہ.......میرا وطن.......قصرِ زیب.......مہر النساء!''

جہاز کا اگلا حصہ فضا میں بلند ہوا۔ شہرِ روشنی جہاز کے پاؤں کے نیچے ہوا۔ ننھے ننھے گھر نظر آنے شروع ہوئے اور وارث کی نم آنکھوں کو محسوس ہوا کہ قصرِ زیب کے

پائیں باغ میں نرگس و لالہ کے پھول کھلے ہیں۔ ننھے سے حوض میں مہرو کی سفید بطخیں تیر رہی ہیں۔ ہلکی ہلکی بوندیں پڑ رہی ہیں۔ اور مہر النساء سفید پھولوں والا سوٹ پہنے، اپنے دراز بال بھگوئے بطخوں سے کھیل رہی ہے۔ یہ منظر وارث کی آنکھوں میں دُھندلا رہا تھا۔ ان کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔ کلیجہ حلق تک آ رہا تھا۔

'میں تمہیں چھوڑ کے جا رہا ہوں مہر النساء!........ میں تمہیں چھوڑ کے جا رہا ہوں۔ مجھے معاف کر دینا۔'

انہوں نے اپنی گیلی آنکھیں بھینچ کے بند کر دیں اور سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا دی۔ جہاز پندرہ ہزار نو سو میٹر کی بلندی پہ فضا میں پَر پھیلائے لندن کے ہیتھرو ایئرپورٹ کی جانب سفر کر رہا تھا۔



وارث کا خط مہرو کے ہاتھوں میں تھا۔ وہ ابھی نیند سے جاگی ہی تھی کہ کوریئر والا اسے وہ خط پہنچا گیا تھا۔ خط کی پشت پر وارث حسن کا نام دیکھ کر وہ مسکرا دی۔ خط اٹھا کے وہ اپنے کمرے میں لگے لکڑی کے جھولے پہ آ کے بیٹھ گئی اور وہ سفاک کاغذ کھول کر پڑھنے لگی۔

''اچھی مہر النساء!

دل تو بہت کر رہا ہے کہ آپ کے نام سے پہلے میں، میری لکھوں۔ لیکن جو بات حقیقت سے کوئی تعلق نہ رکھتی ہو، اس کے خواب دیکھنے سے کیا حاصل؟ آپ میری نہ کبھی تھیں، نہ ہیں اور نہ کبھی ہو سکتی ہیں۔ شاید دنیا میں کوئی کسی کا نہیں ہوتا۔ جو ہوتا ہے وہ فریب ہوتا ہے، دھوکا ہوتا ہے جو ہم سب ایک دوسرے کو دیتے ہیں۔

یہ خط آپ کے لئے غیر متوقع ہے۔ اس خط میں آپ کے لئے سوائے دکھ کے اور کچھ نہیں۔ لیکن یہ دکھ حقیقت ہے اور حقیقت کا سامنا ہر کسی کو کرنا چاہئے۔ میں بھی کر رہا ہوں، آپ کو بھی کرنا ہو گا۔ جب تک یہ خط آپ کے ہاتھوں میں ہو گا، میں اس ملک کو چھوڑ چکا ہوں گا۔ آپ کی دسترس سے، آپ کے شہر سے دور جا چکا ہوں گا۔ اور یہ صدمہ آپ کے لئے بہت بڑا ہو گا۔

لیکن زندگی کبھی کبھی اس طرح کے امتحان لے لیا کرتی ہے۔

میں نے آپ کو اپنانے کا فیصلہ کیا تھا، آپ کو چاہا تھا۔ گو کہ یہ چاہت بہت پرانی تھی مگر اس فیصلے کو کرنے کا حوصلہ مجھ میں آپ نے پیدا کیا۔ آپ مجھ سے زیادہ حوصلہ مند ہیں۔ اگر آپ مجھے اپنی محبت کی آگہی نہ دیتیں مہر النساء! تو شاید میں کبھی بتا نہیں پاتا کہ مجھے آپ سے محبت ہے۔ محبت، محبت ہوتی ہے۔ ضروری نہیں کہ اسے شادی تک پہنچایا جائے۔ شادی تو ضرورت کے تحت کی جاتی ہے اور مجھے شادی کی کوئی ضرورت نہیں۔ مجھے آپ سے محبت ضرور ہے لیکن شادی کی خواہش نہیں۔

میں آپ سے وعدہ کر کے آیا تھا کہ میں آپ کے بابا سے آپ کو مانگوں گا۔ لیکن ہمت ہی نہ کر پایا۔ اس لئے نہیں کہ وہ انکار کر دیتے بلکہ اس لئے کہ میں شادی کے لئے ذہنی طور پہ تیار نہیں۔ شادی ایک کمٹ منٹ ہوتی۔ ایک ایگریمنٹ۔ ایک کانٹریکٹ۔ زبردستی رواج اور مذہب کے نام پہ دو انسانوں کو مجبور کر دیا جاتا ہے کہ وہ اکٹھے رہیں، ایک دوسرے کے غلام بن جائیں اور اسی غلامی کو اپنی اگلی نسلوں تک منتقل کریں۔

مجھے اس ایگریمنٹ اور اس غلامی کی کوئی ضرورت نہیں۔ عمر کے چالیس برس تنہا گزار چکا ہوں، مجھے اب کسی کی رفاقت کی طلب نہیں۔ اور مہرو! آپ بھی مجھ سے شادی کر کے کہیں نہ کہیں ضرور پچھتاتیں۔ عمروں اور سوچ کا یہ تضاد ہمیں آگے چل کے بہت پریشان کرتا۔ نباہ وہیں ہوتے ہیں جہاں Similarities ہوں۔ ذہنی اور روحانی مطابقت اور ہم آہنگیاں ہوں۔ آپ کے اور میرے درمیان کہیں بھی کوئی ہم آہنگی نہیں۔ کلچر، عمر، سوچ اور خیالات کا بہت زیادہ فرق ہے۔

میرے یہ تمام فلسفے آپ کی سمجھ میں شاید ابھی نہ آئیں۔ لیکن ایک موڑ پر جب آپ کی شادی کسی بہتر فرد کے ساتھ ہو جائے گی، اس کی خوشحال زندگی کا حصہ بننے کے بعد آپ کو یہ فیصلہ بچگانہ لگے گا جو آپ نے مجھ سے شادی کا کیا تھا۔ اور پھر وقت تو ہر زخم کو مرہم لگا دیتا ہے۔ آپ بہت جلد مجھے بھول

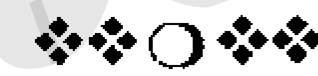
جائیں گے۔ بہتر یہی ہے کہ آپ مجھ سے شادی کے فیصلے کو دل سے نکال دیں۔ زندگی کو اک نیا رخ دیں۔ زیادہ مت سوچیں اور یہ فیصلے اپنے بڑوں کو ہی کرنے دیں۔ اس سے آپ کو بڑوں کی دعائیں نصیب ہوں گی، عزت ملے گی اور ذہنی سکون بھی۔ زندگی بہت سہل ہے، اسے دشوار مت کریں۔ ہمیشہ کے لئے الوداع کہنا دشوار ہے۔ لیکن دشوار مرحلے بھی نبھ ہی جایا کرتے ہیں۔

وارث حسن خان۔''

مہرو سکتے کی کیفیت میں تھی۔ جسم ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ آنکھیں خط کی تحریر پہ جم سی گئی تھیں۔ نبض تھم گئی تھی۔ وقت رک گیا تھا۔ فقط وارث کی بے وفائی سینہ تانے اس پہ مسکرا رہی تھی۔ ان کی سفاکی، ان کی بزدلی دل کھول کے مہرو کا مذاق اُڑا رہی تھی۔

انہوں نے عمروں کا فیصلہ لمحوں میں کر دیا تھا، تنہا کر دیا تھا۔ پوچھنے کی زحمت بھی گوارا نہ کی تھی۔ کیا وارث واقعی پتھر کے تھے؟ .... کیا واقعی وہ روبوٹ کی طرح جذبوں سے عاری تھے؟........ وہ جیسے لگتے تھے ویسے ہی نکلے تھے؟

مہرو کا ذہن سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کھو چکا تھا۔ چوٹ نئی تھی، ظالم تھی اور دل بہت نازک۔ اور پھر آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے........ سفاک خط کی بے حس تحریر بھیگنے لگی۔ الفاظ مٹنے لگے۔



مہرو کے نیم تاریک کمرے میں ڈھیر ساری موم بتیاں جل رہی تھیں۔ مہرو سیاہ لباس میں ملبوس تھی۔ بال کھلے تھے اور تنہا اپنی محبت کی پامالی کا سوگ منا رہی تھی۔

وارث کا خط اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ وہ اس خط کو سو سے زیادہ مرتبہ پڑھ چکی تھی اور ہر پڑھنے کے بعد وہ دوبارہ رونے لگتی، پھر اُداس ہو جاتی۔ دل کی دھڑکن نئی طرح سے دوڑنے لگتی اور پھر ٹھہر جاتی۔ اضطراب نئی طرح سے رگ و پے میں دوڑ جاتا۔ کبھی دل کرتا کہ اس سفاک خط کو پھاڑ کے، اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے، ان ٹکڑوں کو جلا کے راکھ کر ڈالے۔ اس راکھ کو پانی میں بہا دے اور اسی پانی میں خود بھی ڈوب جائے۔ اس نے ایک بار پھر اس خط کو پڑھنا شروع کیا۔

''آپ میری کبھی نہ تھیں اور نہ کبھی ہو سکتی ہیں۔ میں آپ کی دسترس

سے، آپ کے شہر سے دور جا چکا ہوں۔ محبت، محبت ہوتی ہے۔ ضروری نہیں کہ اسے شادی تک پہنچایا جائے۔ مجھے آپ سے محبت ضرور ہے لیکن شادی کی طلب نہیں۔''

مہرالنساء نے یہ جملہ پڑھ کے دل کھول کے قہقہہ لگایا۔

''یہ کیسی محبت ہے تمہاری وارث حسن خان! جس میں فقط چاند کو دیکھنے کی چاہت ہے، اسے حاصل کرنے اور چھونے کی تمنا نہیں۔ بچے بھی کسی کھلونے کو پسند کرتے ہیں تو اسے خریدنے کو مچلتے ہیں، تڑپتے ہیں۔ تم کس طرح کے انسان ہو وارث! کہ تم محبت کے کھلونے کو پسند تو کرتے ہو لیکن تمہیں اس کی کوئی طلب نہیں۔''

مہرو کے قہقہوں سے پورا کمرہ گونج اٹھا تھا اور قہقہوں کے ہمراہ آنسو اس کے گالوں پہ پھسل رہے تھے۔ موم کی شمع اور مہرو ایک دوسرے کے ساتھ مل کے رو رہی تھیں۔

خط کی تحریر اب وارث کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ وارث اس کے سامنے کھڑے بول رہے تھے۔ وہی خال و خط، وہی ہونٹ اور وہی شائستہ لب و لہجہ۔

'میں شادی کے لئے ذہنی طور پر تیار نہیں........ آپ میری کبھی نہ تھیں، نہ کبھی ہو سکتی ہیں۔'

''میں تو آپ کی ہو چکی ہوں وارث!........ اتنی آپ کی ہو چکی ہوں کہ میں تو اپنی بھی نہیں رہی۔ کسی کی نہیں ہو سکتی۔'' وہ نم آنکھوں سے بولی۔

وارث تمسخرانہ مسکرائے۔

''شادی ایک کمٹ منٹ ہوتی ہے، ایک ایگریمنٹ۔ مجھے اس ایگریمنٹ اور اس غلامی کی کوئی ضرورت نہیں مہرو!''

''میں آپ کو کسی غلامی پر مجبور نہیں کر رہی وارث! میں آپ سے کچھ نہیں مانگ رہی۔ لیکن خدا کے لئے مجھے اس طرح تنہا کر کے، ٹھکرا کے تو نہ جائیں۔ میں بہت تنہا ہو جاؤں گی۔ آپ ہی سے تو میں لڑتی ہوں، ناراض ہوتی ہوں، آپ ہی کے ساتھ ہنستی اور خوش ہوتی ہوں، آپ ہی سے تو ہر خواب منسلک کیا ہے۔ آپ کے سوا میرا کون ہے؟ آپ کیسے بھلا سکتے ہیں مجھے وارث؟........ کیا آپ بھلا سکتے ہیں المنظر کے کنارے بارش میں بھیگتی ہوئی اس شام کے پہلے اقرار کو؟ ان وعدوں کو؟ اس عہد د

پیاں کو؟......کیا آپ بھلا سکتے ہیں؟'' وہ نم آنکھوں کے ساتھ وارث کے ہیولے سے مخاطب تھی۔

''مہرو! آپ مجھ سے شادی کر کے ضرور پچھتائیں گی۔ عمر اور سوچ کا یہ تضاد آگے چل کے بہت پریشان کرتا ہے۔ آپ کے اور میرے درمیان کہیں بھی کوئی ہم آہنگی نہیں۔'' وارث بضد تھے۔

''وارث!......وارث!......وارث!......آپ اتنے کٹھور اور سنگدل نہیں ہو سکتے۔''

وارث اپنی کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھنے لگے۔ ''اچھا مہرو! میں جا رہا ہوں۔ آپ کے شہر سے، آپ کی دسترس سے، آپ کی محبت کی حدود سے۔''

مہرو کا دل کیا کہ وہ وارث کی رِسٹ واچ اتار لے۔ اسے اپنے پاؤں تلے روند ڈالے۔ مسل ڈالے۔ کچل ڈالے۔ اس کے ڈائل کو کرچی کرچی کر ڈالے۔

''مت جائیں وارث! مت جائیں۔'' وہ رو رہی تھی۔ بلک رہی تھی۔

''مجھے تنہا کر کے مت جائیں۔ میں بکھر جاؤں گی، ٹوٹ جاؤں گی، پامال ہو جاؤں گی۔'' وہ ہاتھ بڑھا بڑھا کر التجا کرتی رہی مگر وارث موم بتی کے ہیولے میں تحلیل ہوتے گئے، دُھواں بنتے گئے۔ وہ روتی رہی، روتی رہی۔

محبت یکایک عشق کی منزلوں میں داخل ہو رہی تھی۔ ہجر کی راکھ میں وصال کے پھول کھل رہے تھے۔ عشق کی اوکھی منزل دل کی گلیوں میں آندھی لے آ رہی تھی۔

عشق دی منزل اوکھی اے
کتھے سوکھی دیکھ نہ بھُل پوویں
سوکوہاں دے پینڈے ہن
کتھے پا پیادہ ناں جل پوویں

اور پھر اپنا آپ کھونے کے لئے تو ایک عشق بہت ہوتا ہے۔ مہرو بھی اپنا آپ اس عشق میں کھونے چلی تھی۔ کملی ہونے چلی تھی۔



کلاس میں بیٹھے بیٹھے زین پہ ایک بار پھر خارش کا دورہ سا پڑ گیا۔ پہلے یہ خارش اسے ٹانگوں میں محسوس ہوئی۔ وہ سفید جوگر پہنے ہوئے پاؤں سے اپنی دوسری ٹانگ کھجانے لگا۔ آہستہ آہستہ وہ خارش بڑھتی گئی۔ ٹانگوں سے گھٹنے، گھٹنے سے بازو، پیٹ، کولہے، بغلیں۔ رفتہ رفتہ پورا جسم اس خارش کی لپیٹ میں آ گیا۔ وہ جس قلم سے لکھ رہا تھا اسی قلم سے اپنا جسم کھجلانے لگا۔ لیکن کھجلی اس قدر جان لیوا تھی کہ جلد چھلتی سی محسوس ہوئی تھی۔

اس نے قلم کاپی کے اوپر پھینک دیا اور دونوں ہاتھوں سے اپنا جسم کھجلانے لگا۔ چہرہ، بازو، پیٹ، پیٹھ، وہ بیک وقت تمام کا تمام جسم کھجلا رہا تھا۔ عجب اِک وحشت سی نظر آ رہی تھی اس کے چہرے پر۔ اس کے ساتھ بیٹھے لڑکے نے گھبرا کے اس کی جانب دیکھا۔ وہ ڈر کے ذرا فاصلے پہ کھسک گیا اور آگے والے ڈیسک پہ بیٹھے لڑکے کو ٹہوکا مارا۔

''سلمان! دیکھو زین کو کیا ہو گیا ہے۔''

ایک ایک کر کے تمام لڑکے زین کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ٹیچر بلیک بورڈ پہ کوئی سوال حل کر رہا تھا۔

''سر! دیکھئے، زین واجد کو کیا ہو گیا ہے؟'' ایک لڑکے نے ٹیچر کو متوجہ کیا اور ٹیچر اپنا کام چھوڑ کے اس کے پاس آیا۔ وہ واقعی زین کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ زین بری طرح جسم کو نوچ رہا تھا۔ عجیب اِک جنون اور وحشی پن تھا اس کے انداز میں۔ اس کے بال بکھر گئے تھے۔ شرٹ کے بٹن کھل گئے تھے۔ آستین ذرا سی پھٹ گئی تھی۔

''بچو! اُٹھو، اسے سہارا دے کر نیچے ہاسپٹل لے جاؤ۔'' ٹیچر نے لڑکوں کو کہا۔ تین

چارلڑکے فوراً اُٹھے اور زین کو پکڑ کے کلاس روم سے باہر لے گئے۔

''مجھے سر ظفر کے پاس لے جاؤ۔ مجھے ڈاکٹر کی نہیں، سر ظفر کی ضرورت ہے۔'' وہ راستہ بھر ان لڑکوں سے مخاطب تھا۔ لیکن لڑکوں نے اس کی ایک نہ سنی اور زبردستی اسے کھینچ کے کالج ہی کے احاطے میں بنے ہاسپٹل کے اندر لے گئے۔

ڈاکٹر نے اسے دیکھا، اس کا چہرہ، آنکھیں چیک کرنے کے بعد ایک عجیب سی تشویش اس کے اندر دوڑ گئی۔ اسے ایک انجکشن لگایا جس کے بعد وہ مکمل طور پہ سو گیا اور جسم میں دوڑتی زہریلی خارش بھی ختم ہوگئی۔

اس کی آنکھ کھلی تو سر ظفر اس کے سامنے تھا جس کی آنکھوں میں بلا کی کمینگی اور شیطانیت تھی۔

''اُٹھ جاؤ میرے راجہ! بہت سو لئے اب تو۔''

''میں کہاں ہوں؟'' وہ اپنے بھاری سر کو پکڑ کے بولا۔

''جنت میں ہے تُو شہزادے! وہ جنت جہاں تجھے تیری ضرورت کی چیز مل سکتی ہے۔ بڑی مشکل سے لایا ہوں تجھے اس منحوس ڈاکٹر کی نگرانی سے۔'' سر ظفر نے کہا اور زین کو سارا واقعہ یاد آ گیا۔

''مجھے ایک سگریٹ دے دیں سر پلیز! چوبیس گھنٹے ہو گئے۔ میرا جسم خارش سے چھل رہا ہے۔''

''چندا! سگریٹ مل جائے گی۔ مگر اس کی قیمت تو ادا کر دو۔ پتہ تو ہے تجھے کہ یہ اتنی آسانی سے دستیاب نہیں ہوتی۔ بڑی دور سے منگوانی پڑتی ہے۔''

''لیکن سر! پرسوں ہی تو آپ نے مجھ سے تین ہزار لئے تھے۔ میں نے اپنی پوری پاکٹ منی آپ کو دے دی۔'' زین بے بسی سے بولا۔

''تو بچے! تین ہزار کی تین سگریٹ۔ حساب مکمل۔ رہی بات پیسوں کی تو میرے لال! امیر باپ کا بیٹا ہے تُو۔ منسٹر صاحب کو ایک فون کھڑکا دے کہ تیری پڑھائی کے لئے تجھے روپے درکار ہیں۔ بھجوا دے گا تیرا باپ۔'' ظفر کمینگی سے مسکرایا۔

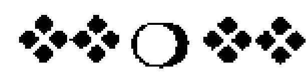
''کیا تھا کل میں نے بابا کو فون۔ وہ مصروف تھے۔ وارث بھائی بھی کہیں چلے گئے ہیں۔''

''اور تیری ایک چہیتی بڑی بہن بھی تو ہے۔'' ظفر نے اسے یاد دلایا۔

''مہرو آپی...... ہاں، میں ان سے مانگ سکتا ہوں۔ مگر ابھی تو مجھے دے دیں ایک سگریٹ۔'' وہ دونوں ہاتھ جوڑ کے بولا۔

ظفر نے اپنی جیب سے ایک سگریٹ نکالی اور اس کے آگے لہرائی۔ زین نے لپک کے وہ سگریٹ پکڑ لی۔ ظفر نے جیب سے ماچس نکال کے اس زہر سے بھری سگریٹ کو سلگا لیا۔

زین نے ایک لمبا کش بھرا۔ یکایک اس کے جسم کی خارش مٹنے لگی۔ وہ نارمل ہونے لگا۔ اس کے چہرے، کاندھوں، کولہوں، بازوؤں، ٹانگوں پہ رینگنے والے ننھے ننھے کیڑے سگریٹ کے ایک ہی کش سے مرنے لگ گئے۔ وہ سرور اور سکون پانے لگا۔ اندر زہر جاتا رہا اور اعصاب کو پُرسکون کرتا رہا۔



ثمین نے دونوں تصاویر شہرین کے آگے رکھ دیں۔

شہرین بے حد حیرت سے دونوں تصویروں کو دیکھ رہی تھی۔ عجیب حیرت اور بے یقینی سی جھلک رہی تھی اس کی آنکھوں میں۔ کتنی دیر اس کی آنکھیں تصویروں پہ ساکت و جامد ٹکی رہیں اور اس کی گردن نفی کی جنبش میں ہلتی رہی۔

''کیا یہ حقیقت ہے؟'' وہ بڑی دیر بعد بولی۔

''ہاں بیٹا! یہ حقیقت ہے۔ وہ حقیقت جس سے کوئی آشنا نہیں۔ جو سالوں سے تاریخ کے کسی چیپٹر کی طرح کتابوں میں بند تھی اور آج تک اپنے کھلنے کا انتظار کر رہی تھی۔ یہ تصویریں سچ ہیں، جھوٹ نہیں۔'' ثمین نے بیٹی کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ دیا۔

''تو کیا واقعی .... بالی آنٹی.......''

''ہاں شہرین! یہ تصاویر اسی کی ہیں۔ بالی، بالی نہیں زیب ہے۔ زیب النساء۔ ماضی کی مشہور اداکارہ، گلوکارہ۔ سردار واجد کی بیوی، اس کے بچوں کی ماں جسے آج تک سبھی مُردہ تصور کرتے آئے ہیں۔ آج تک جو ایک معمہ بنی ہوئی ہے، وہی زیب۔''

ثمین نے ماضی کی زیب کی تصویر شہرین کو دکھائی۔

''زیب اس وقت جہانِ فن کا چمکتا ستارہ تھیں اور میں کالج میں شوقیہ گایا کرتی

تھی۔ ایک بار ہمارے کالج میں اینوئل فنکشن ہوا۔ جج کی حیثیت سے زیب کو مدعو کیا گیا۔ انہوں نے ہمارے گانے کو سنا اور مجھے پہلا انعام دیا۔ یہ تصویر اسی دن کی ہے۔ اس کے بعد میں کبھی ان سے نہیں ملی۔ گو کہ میں نے ریڈیو کے لئے گانا شروع کر دیا۔ لیکن پھر زیب نے شادی کر لی اور آہستہ آہستہ ان کی خبریں ملنی بند ہوگئیں۔ وہ ایک مصروف گھریلو عورت بن گئیں۔ اور ایک دن ٹی وی پر ایک سفاک خبر سنائی دی کہ زیب سردار کی ایک ایکسیڈنٹ میں موت واقع ہوگئی۔ یہ صدمہ ہر کسی کے لئے بہت بڑا تھا۔ زیب کے بچوں اور شوہر کے لئے، ان کے چاہنے والوں اور خصوصاً میرے لئے۔ زیب سے مجھے ایک روحانی لگن سی ہو گئی تھی۔ اور پھر .... اتنے سالوں بعد ایک بھولی ہوئی داستان کی طرح زیب میرے سامنے کھڑی تھیں۔ پہلی نظر ہی میں مجھے گمان ہو گیا تھا کہ یہ وہی ہیں، وہی عورت، وہی آنکھیں۔ لیکن اس گمان کو یقین کرنے کی ضرورت تھی۔ اور پھر مجھے اس دن ان کے کپڑوں سے یہ تصویر ملی جس میں وہ اپنے بچوں اور شوہر کے ہمراہ ہیں۔ بس میرا گمان، میرا یقین سب پختہ ہو گیا کہ دنیا کی نظروں سے بظاہر چھپ کے گمنامی کی زندگی بسر کرنے والی عورت زیب ہی ہے۔" ثمین کے انکشافات شہرین کے لئے بے حد حیرت ناک تھے۔

"لیکن ان کو پاگل خانے تک پہنچانے والا کون ہے؟ .... ان کا گھر تھا، شوہر اور بچے تھے، سوسائٹی میں ایک مقام تھا۔ اتنا بڑا جھوٹ کیسے چھپ سکتا ہے کہ کسی زندہ فرد کو پاگل خانے بھجوا کے اسے مُردہ تسلیم کروایا جائے؟" شہرین نے کہا۔

"یہ تو بہت ہی اُلجھی ہوئی گتھی ہے شہرین! اور یہ بات سوائے زیب کے اور کسی کو معلوم نہیں ہو گی۔ وہی حقیقت بتا سکتی ہیں۔ وہی ان چہروں پر سے مکاری کا نقاب ہٹا سکتی ہیں جنہوں نے انہیں اس حال تک پہنچایا۔"

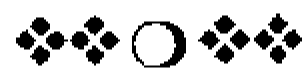
"کیا وہ بتا دیں گی؟ .... وہ جنہوں نے سولہ سترہ سال اپنی اصل شناخت لوگوں سے چھپائے رکھی، کیا وہ اپنی کہانی بتا پائیں گی؟ مجھے، آپ کو، پوری دنیا کو؟" شہرین نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں .... وہ بتا سکتی ہیں۔ اگر انہیں یہ احساس دلایا جائے کہ ہم ان کے اپنے ہیں۔ انہیں جانتے، انہیں پہچانتے ہیں۔ اتنے سالوں پاگل خانے میں محبوس رہنے کے

بعد انہوں نے اپنی ہر حقیقت تمہیں بتائی اور تم پہ اعتبار کر کے تمہارے ساتھ آئیں۔ آگے بھی ان کو اعتماد میں لے کر ان سے ہر بات پوچھو۔ ان کے بچوں سے انہیں ملواؤ۔ انہیں اس دنیا میں واپس لاؤ شہرین! مجھے یقین ہے تم ایسا کر سکتی ہو۔" ثمین نے شہرین کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھا اور اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

"بہت مشکل ہے امی! .... بہت مشکل۔"

"لیکن ناممکن نہیں ہے بیٹا! ممکن ہے۔" ماں کے چہرے پہ یقین دیکھ کر شہرین کے اندر اک رمق پیدا ہو گئی تھی۔



شیشے کے جام میں سلمان نے وہسکی اُنڈیلی۔ جام میں ٹپکتی وہسکی میں اس کو مہر النساء کا چہرہ نظر آیا۔ وہ چہرہ جسے وہ جانتا نہ تھا، پہچانتا نہ تھا، جس کے نام تک سے وہ واقف نہ تھا۔ قطرے قطرے میں اسے وہ صبیح چہرہ نظر آتا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ گھبرائی گھبرائی سی بڑی بڑی آنکھیں، وہ لرزتے ہونٹ، وہ کشادہ روشن پیشانی اور روئی روئی سی آنکھیں۔ نہ چہرے پہ کوئی رنگ، نہ تاثر۔ بہت شفاف، بہت سپاٹ چہرہ۔

اس نے ہزاروں لڑکیاں دیکھی تھیں۔ کئی لڑکیوں کی قربت حاصل کر چکا تھا۔ مگر ویسا چہرہ اس نے کہیں نہیں دیکھا تھا۔ بہت اُکھڑا اُکھڑا سا مگر پھر بھی حسین۔ بہت روٹھا روٹھا سا مگر پھر بھی پُر رونق۔

وہ اسے دیکھنا چاہتا تھا، پانا چاہتا تھا، چھونا چاہتا تھا۔ دل میں ایک عجیب وحشت سی جاگ رہی تھی۔

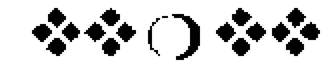
"مجھے وہ لڑکی ہر حال میں درکار ہے۔ نہیں ملی تو میں اسے کبھی بھول نہیں پاؤں گا۔ I want that girl." وہ پورا کا پورا جام اپنے اندر انڈیل کے خود سے مخاطب ہوا۔ اُسے جہاں آراء کی آواز یاد آئی۔

"وہ تمہیں نہیں مل سکتی .... وہ لڑکی یہاں کی نہیں .... وہ تمہیں نہیں مل سکتی۔"

"کیوں نہیں مل سکتی مجھے وہ .... مجھے وہ ہر حال میں چاہئے .... یہاں کی ہو چاہے وہاں کی، مجھے وہ لڑکی حاصل کرنی ہے، ہر حال میں۔"

اس نے شیشے کا خالی جام اٹھا کے فرش پہ دے مارا۔ ٹوٹے ہوئے جام میں سنہرے

رنگ کی شراب تھی اور اس شراب میں ابھی تک مہر النساء کا چہرہ رقص کر رہا تھا۔



پانیوں پانیوں جب چاند کا ہالہ اُترا
نیند کی جھیل پہ اِک خواب پرانا اُترا
آزمائش میں کہاں عشق بھی پورا اُترا
حُسن کے آگے تو تقدیر کا لکھا اُترا
یاد سے نام مٹا، ذہن سے چہرہ اُترا
چند لمحوں میں نظر سے تیری کیا کیا اُترا
آج کی شب میں پریشاں ہوں تو یہ لگتا ہے
آج مہتاب کا چہرہ بھی ہے اُترا اُترا
میری وحشت رم آہو سے کہیں بڑھ کر تھی
جب میری ذات میں تنہائی کا صحرا اُترا
اِک شب غم کے اندھیرے پہ نہیں ہے موقوف
تُو نے جو زخم لگایا ہے وہ گہرا اُترا

مہر النساء مسلسل چار دن سے رو رہی تھی۔ رو رو کے اس کا حلیہ عجیب ہو گیا تھا۔ میلے کپڑے، بکھرے بال، اُلجھی بکھری ہوئی۔ جسم میں بھی واضح کمزوری نظر آ رہی تھی اور چہرہ بجھا بجھا سا تھا۔ لیکن پانچویں دن اس نے ارادہ کیا۔

"نہیں وارث حسن خان! نہیں........ میں تمہارے عشق میں دیوانگی کی حد تک نہیں جاؤں گی۔ میں اور نہیں روؤں گی۔ اگر تم بے حس اور بے وفا ہو تو انا مجھ میں بھی ہے۔ عزتِ نفس میرے اندر بھی سانس لیتی ہے۔ نہیں وارث! میں مظلوم نہیں بنوں گی جسے کوئی بھی تمہاری طرح تنہا چھوڑ کے، حالات کے حوالے کر کے فرار ہو جائے۔ نہیں، میں تمہارے غم میں دیوانگی کی حد تک نہیں اُتروں گی۔"

اُس نے تہیہ کیا۔ کسی پرانی غزل کے بول اس کے کانوں میں گونجنے لگے۔

جو بادلوں سے بھی مجھ کو چھپائے رکھتا تھا
بڑھی جو دُھوپ تو بے سائبان چھوڑ گیا

عقاب کو تھی غرض فاختہ پکڑنے سے
جو گر گئی تو یونہی نیم جان چھوڑ گیا

اسے وارث پہ کبھی غصہ آ رہا تھا تو کبھی افسوس ہو رہا تھا۔ کبھی اس کا دل کر رہا تھا کہ کاش وہ سامنے آ جائیں اور وہ انہیں نوچ ڈالے۔ ان کا چہرہ سامنے ہو اور وہ عمر اور تہذیب کو بھلا کر ان کے چہرے پہ کس کے طمانچے مارے، ڈھیروں ڈھیر بے عزتی کرے، گالیاں دے، انہیں ان کی اوقات یاد دلائے۔ روئے، دھاڑے، چیخے۔ انہیں اپنی اہمیت کا احساس دلائے۔ مگر وہ ایسا کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی اس لئے اکیلے میں روئے چلی جا رہی تھی۔

اسی طرح روتے روتے اسے کئی گھنٹے گزر گئے کہ جب ملازمہ نے اسے سردار صاحب کے فون کی اطلاع دی تو اس کا دل کیا کہ وہ انکار کر دے کہ اس نے بات نہیں کرنی۔ آخر بابا خود بھی تو اکثر بات کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ میٹنگ کا، مصروفیت کا، پارٹی یا پھر اجلاس کا بہانہ بنا کر فون بند کر دیتے ہیں۔ اگر اس نے بات کرنے سے انکار کر دیا تو کون سا گناہ کر دیا۔

لیکن اگلے ہی پل اس نے اپنی اس سوچ سے انکار کیا اور بابا کا فون سننے چلی گئی۔

"کیسی ہو مہر النساء بیٹے؟" سردار صاحب کی آواز آئی۔

"بابا!........ آپ کہاں ہیں بابا؟........ مجھے آپ کی بہت یاد آ رہی ہے........ آپ کی بہت کمی محسوس ہو رہی ہے۔" وہ روہانسی آواز میں بولی۔

"کیا ہوا بیٹا؟ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" اس کی آواز کی تڑپ سردار صاحب کو پریشان کر گئی۔

"بس بابا! بہت اکیلا محسوس کر رہی تھی خود کو۔ امی تو کبھی پاس جیسے تھیں ہی نہیں۔ آپ بھی اتنے دور رہتے ہیں بابا! اور وارث........ وہ جو ہمیشہ ساتھ رہنے کے دعوے کیا کرتے تھے، وہ اس طرح ساتھ چھڑا کے چلے گئے جیسے وہ کسی انسان کو نہیں، کسی اینٹ پتھر کے مکان کو چھوڑ کے جا رہے ہوں۔ بابا! خدا کبھی کسی انسان کو اتنا تنہا نہ کرے۔" مہرو کی آواز میں بے پناہ مایوسی اور تنہائی تھی۔

"مہر النساء! کیا ہو گیا ہے میری جان؟........ میری مصروفیات کوئی آپ سے ڈھکی

چھپی تو نہیں ہیں نا۔ اور وارث........ اس کا جانا بہت اچانک اور غیر متوقع تھا۔ اور ہمیں خود اس کے جانے کے بعد تنہائی محسوس ہو رہی ہے۔ وہ مجھ سمیت ہم سب کی ضرورت تھا۔'' سردار صاحب نے بہت پیار سے اسے سمجھایا۔

''لیکن کم از کم اطلاع تو دی جاتی ہے نا بابا! انسان، انسان ہوتا ہے کوئی مشین نہیں جس کے جذبات و احساسات نہ ہوں، جس پہ حادثوں کا کوئی اثر نہ ہو۔ کسی کا چلے جانا بھی تو حادثہ ہی ہوتا ہے نا بابا!'' مہرو کی آنکھیں سرخ اور نم ہو رہی تھیں۔

''ہم آپ کو اس کا نمبر دے دیں گے مہر النساء! آپ اپنے تمام گلے شکوے اسی سے شیئر کر لیجئے گا۔ اور یوں بھی یہ تمام Tender feelings اس کے لئے آپ کے دل میں ہی ہو سکتی ہیں۔ کیونکہ آپ لڑکی ہیں اور لڑکیوں کا دل تو ہر کسی کے لئے نرم ہوتا ہے۔''

''اور شاید اسی چیز کا فائدہ مرد ہمیشہ اٹھاتے ہیں۔'' مہر النساء نے جلے ہوئے انداز میں کہا۔

''بیٹا! زیادہ Disappoint ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ زندگی ہے۔ زندگی میں لوگ آتے ہیں، ساتھ رہتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ ان کے افسوس میں انسان اپنے آپ کو تباہ نہیں کر لیتا۔ بھول کے زندگی کو آگے بڑھانا ہی سمجھداری ہوتی ہے۔ میں کل شام کی فلائٹ سے لاہور آ رہا ہوں، آپ سے ضروری گفتگو کرنے کے لئے، بطور خاص۔ مجھے یقین ہے کہ کل مجھے میری بیٹی بہت فریش اور کھلکھلاتی ہوئی ملے گی۔ بنا کسی اُداسی کے۔'' سردار صاحب نے کہا۔

''کوشش کروں گی بابا!'' وہ اسی کھوئے پن سے بولی۔

''اوکے بیٹا! اللہ حافظ۔'' سردار صاحب نے گفتگو ختم کر کے فون رکھ دیا۔ مگر مہرو کتنی دیر ریسیور ہاتھ میں تھامے خاموش کھڑی رہی۔



آئینہ مجھ سے میری پہلی سی صورت مانگے
میرے اپنے ہونے کی نشانی مانگے
آئینہ مجھ سے میری پہلی سی صورت مانگے

گیت کے بول لہروں پہ سفر کرتے کرتے زیب کی اپنی سماعتوں تک آ پہنچے تھے۔ وہ جو کسی گہری سوچ میں ڈوبی کھڑکی کے پاس بیٹھی تھی، اچانک چونک اٹھی۔ یہ اس کی اپنی آواز میں گائی غزل تھی جسے ثمین نے اپنے کیسٹ پلیئر پہ لگا دیا تھا۔ یہ کیسٹ ثمین کے پاس سالوں سے محفوظ رکھی تھی اور وہ اکثر اس کی غزلیں تنہائی میں سنا کرتی تھیں۔ لیکن آج اسے لگانے کا مقصد فقط زیب کو یاد دلانا تھا، وہ وقت، وہ دل، وہ آواز اور وہ احساس۔

زیب تڑپ کے اُٹھی تھی اور کاریڈور کا احاطہ پھلانگ کے ثمین کے کمرے میں چلی گئی۔ ثمین کو اس کے اس طرح آنے پہ کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ کیونکہ وہ اسی طرح اسی کی آمد کی توقع کئے بیٹھی تھیں۔ اسے سامنے دیکھ کر ثمین لمحہ بھر کو مسکرائیں اور اسے اندر آنے کا اشارہ کیا۔

''آ جائیں اندر۔'' ثمین نے مسکرا کے کہا۔ زیب کچھ گھبرائی، کچھ حیران سی اندر آئی اور ثمین کے پاس بیٹھ گئی۔ ثمین نے اس کے ہاتھوں پہ اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

''کیا ہوا؟ آپ کے چہرے پہ اس قدر گھبراہٹ کیوں ہے؟'' ثمین نے پوچھا۔

''یہ غزل........ یہ غزل........'' زیب نے انگلی سے بجتے ہوئے پلیئر کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ غزل بہت خوبصورت ہے۔ میری پسندیدہ غزلوں میں سے ایک ہے۔ زیب واجد، بہت اچھی گلوکارہ تھیں۔ انہی کی غزل ہے۔ کیا یہ غزل آپ کو بھی پسند ہے؟'' ثمین نے پوچھا۔ زیب کی آنکھوں میں نمی سی آ گئی۔

''بہت قریب ہے یہ غزل میرے دل کے۔'' زیب نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

''کچھ یاد دلاتی ہے؟'' ثمین نے سوال کیا۔

''کچھ کھرنڈ ہوتے ہیں جو اکثر کسی کی آواز کو سن کر اتر جاتے ہیں اور زخم دوبارہ سے درد کرنے لگتے ہیں۔'' زیب کے لہجے میں اُداسی تھی۔

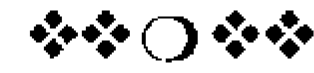
''کیا وہ زخم اور درد اپنے تک رکھنے سے سب کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے؟........ میرا تو خیال ہے کہ دل کی حالت کسی سے بانٹ لینے سے زخم کا احساس کافی حد تک معدوم ہو جاتا ہے۔'' ثمین نے نرمی سے کہا۔

"اکثر کبھی کوئی دل کا حال بانٹنے والا نہ ملا ہو تو؟" زیب نے کہا۔

"شاید پہلے نہ ملا ہو۔ لیکن اب تو میری صورت میں مل سکتا ہے۔ اگر آپ سمجھیں تو۔ بتا دیں، مجھے جو بتانا ہے زیب باجی!"

ثمین نے اس کا نام لیا اور وہ حیرت سے بت بنی اسے دیکھتی رہی۔ سترہ اٹھارہ سالوں بعد اسے کسی نے اس نام سے پکارا تھا اور وہ خود کو پہچان ہی نہ پا رہی تھی۔

"میں آپ کو پہچان گئی ہوں زیب باجی!......آپ وہی ہیں جس کی یہ آواز تھی۔ اور آپ کا چہرہ بھی وہی ہے۔ آپ مجھ سے اپنا آپ چھپا نہیں سکتیں۔" ثمین نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ دیا اور وہ حیرت کا بت ٹوٹ گیا۔ زیب ثمین کے کندھے سے لگ گئی اور بلک بلک کے رونے لگی۔ اپنی شناخت ہو جانے کے یہ آنسو کس قدر میٹھے تھے۔ دل سے گمنامی کا غبار ڈھل رہا تھا۔ آئینے کو پہلی سی صورت مل گئی تھی۔



"میں شادی کرنے کے لئے تیار ہوں بابا!" ذرا سے توقف کے بعد مہر النساء نے جواب دیا اور اس کے اس طرح فوری طور پر رضامندی ظاہر کرنے پر سردار صاحب حیرانی سے اسے دیکھتے رہے۔ وہ جو ہر چھوٹی سی بات پہ ہزاروں دلائل دیتی تھی، اپنا نقطہ نظر پیش کرتی تھی، سوال پہ سوال کر کے تکرار کی صورت پیدا کر دیتی تھی، اپنی زندگی کے اتنے بڑے فیصلے پہ اس طرح خاموشی سے کیسے ہاں کر سکتی ہے؟ نہ اس نے لڑکے کا نام پوچھا، نہ خاندان اور بس ہاں۔

"مہر النساء! آپ سوچ سمجھ کے جواب دیجئے گا۔ اتنی جلدی نہیں ہے۔"

"نہیں بابا! آپ کا فیصلہ مجھے منظور ہے۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ اس طرح کے فیصلے بہتر عمر میں ہی اچھے لگتے ہیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" وہ اسی ڈھٹائی سے بولی۔

"لڑکے کا نام سلمان ہے۔ انگلینڈ سے اس نے ایم بی اے کی ڈگری لی ہے۔" سردار صاحب نے شروعات کی۔

"اوکے، فائن بابا! آپ لیس بول دیں۔ مجھے کوئی مسئلہ نہیں۔" وہ ان کی بات کاٹ کے بولی۔ اسے کوئی دلچسپی نہ تھی کہ لڑکا کون ہے اور کیا کرتا ہے۔ اسے تو بس وارث سے بدلہ لینا تھا اپنے ٹھکرائے جانے کا۔ اسے تو بس اسے دکھانا تھا کہ اگر تم

مجھے ٹھکرا کے چلے گئے تو دنیا میں اپنانے والے ختم نہیں ہو گئے۔

سردار صاحب کو اُس کے اس رویے پہ ذرا سی تشویش ہوئی۔ اتنی انڈر اسٹینڈنگ اور فرمانبردار وہ کبھی نہیں رہی۔

"اگر کوئی بات ہے مہر النساء! جو آپ کو پریشان کر رہی ہے تو آپ مجھ سے شیئر کر سکتی ہیں۔" سردار صاحب نے اپنے لہجے میں نرمی پیدا کی۔

اب وہ بابا کو کیا بتاتی کہ وہ کس کرب سے گزر رہی ہے۔ معصوم محبت کی پامالی اسے کیسے کنوئیں میں دھکیل رہی ہے۔ وہ احساسات کے کن جنگلوں میں بھٹک رہی ہے۔ ٹھکرائے جانے کی، ریجیکٹ ہونے کی تذلیل اسے کس طرح تڑپا رہی ہے۔ کس طرح بتاتی وہ اپنے باپ کو کہ جسے اس نے سالوں اپنے دل کی دھڑکنوں کے اندر محسوس کیا، جس کے نام اس نے اپنے خواب کا ایک ایک چراغ جلایا، وہ اسے کس طرح بنا بتائے، بنا پوچھے فرار ہو گیا۔ اس کے دل کی بستی کو جلتی آگ کے حوالے کر کے، اس کے خوابوں کے چراغوں کو بجھا کے اسے تنہا کر کے۔

"کوئی خاص بات نہیں بابا! بس میں اب پریکٹیکل لائف میں داخل ہونا چاہتی ہوں۔ میرا نہ کوئی دوست ہے اور نہ ماں۔ اور اگر شادی ہو جاتی ہے اور کسی مکمل فیملی کی میں فرد بن جاتی ہوں تو شاید زندگی کو بہتر طور پر دیکھ سکوں۔ تنہائی کا احساس ختم ہو جائے گا۔" مہر النساء اپنی دلیلیں دے رہی تھی۔

"ٹھیک ہے بیٹا! پھر میں انہیں منگنی کے لئے کوئی مناسب تاریخ دے دیتا ہوں۔"

"بابا! منگنی نہیں۔ مجھے یہ پسند نہیں۔ ڈائریکٹ شادی اور رخصتی۔" اس نے دوٹوک انداز میں بے حسی سے کہا۔ سردار صاحب حیرت سے اس کا چہرہ دیکھتے رہے۔ وہ چپ چاپ ان کے کمرے سے جانے لگی۔



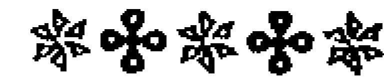
ماہا کے دل میں پھول سے کھل اٹھے تھے۔ شمائل کے کہے فقط چند الفاظ سے اس نے نئی زندگی سی پا لی تھی۔ محبت اور چاہت کے جن کواڑوں کو اس نے اپنے اندر قفل لگا کے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا تھا، نجانے شمائل نے ان دروازوں کے مقفل کواڑ کس طرح سے کھولے تھے۔ کس چابی کو ہاتھ میں تھاما تھا، کس پٹ کو توڑا تھا؟......

وہ اپنی عمر سے دوگنی چھوٹی ہو کر عجیب کھٹے میٹھے احساسات میں گھر گئی تھی۔ بات بات پہ مسکرا رہی تھی۔ گام گام پہ خود کو خاص محسوس کر رہی تھی۔

کون کہتا ہے محبت عمروں کی محتاج ہوتی ہے، یا زندگی میں فقط ایک بار ہوتی ہے، یا کسی ایک چہرے سے ہوتی ہے۔ یہ تو وہ چیز ہے کہ جس سے خرد مندی کا، عقل و ہوش کا کوئی تعلق ہی نہیں۔ یہ تو وہ شہر ہے کہ جس کے تمام مکین اندھے ہیں۔

یہ تو وہ دریا ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں۔ یہاں تو بس موجیں ہی موجیں ہیں، ڈوبنا ہی ڈوبنا ہے۔ کوئی پار لگنے کا امکان نہیں۔ کوئی عقل و ہوش کی آہٹ نہیں۔

محبت کی تو الگ اِک زباں ہے!
محبت کے تو الگ اپنے اصول ہیں!
محبت تو محبت ہے!



شمائل کی بہن کی شادی سے لوٹے بہت دن گزر گئے تھے۔ وہ یونیورسٹی بھی جا رہی تھی۔ لیکن شمائل کا سامنا کرنے سے گریز کر رہی تھی۔ بے وجہ ایک فاصلہ بنائے رکھنے کی کوشش میں تھی۔ اور اس کا یہ گریز شمائل بھی بخوبی سمجھ رہا تھا۔ بہت دوستانہ بے تکلفی اور اپنائیت کو دو ہی لمحوں میں بیگانگی اور گریز میں تبدیل کر دیا تھا۔ یوں تو ماہا ایک عجیب سی فیلنگ کے زیرِ اثر تھی۔ چاہے جانے کی فیلنگ، ایک موہوم سی سرشاری، ایک میٹھی سی کیفیت۔ مگر وہ پھر بھی شمائل سے زیادہ سمجھدار تھی۔ میچور تھی۔ زندگی کو بہتر طور پر سمجھ سکتی تھی لہٰذا وہ کوئی بھی احساس اپنے اوپر حاوی کرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ بہر حال ایک ماں تھی، ایک خود مختار عورت تھی، ایک ذمہ دار استاد تھی اور کسی کی بیوہ تھی۔ لہٰذا اس کا گریز صحیح تھا۔

''مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔'' کلاس کے بعد جب وہ کاریڈور سے گزر رہی تھی تو شمائل اس کے سامنے آ گیا۔

''مجھے اگلی کلاس لینی ہے۔ میرے پاس وقت نہیں۔'' وہ رُکھائی سے بولی اور آگے جانے کے لئے بڑھنے لگی۔

''رُکیں...... پلیز مجھے ایک موقع دے دیں۔ اس طرح اگنور مت کریں۔ صرف ایک بار بات کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ اس کے آگے ہی آ کے کھڑا ہو گیا۔ ماہا خاموش رہی۔ اپنی گھڑی دیکھنے لگی۔

''اچھا ٹھیک ہے...... فی الحال میں اسٹاف روم جا رہی ہوں۔ آدھے گھنٹے بعد میں گھر کے لئے نکلوں گی۔ شام کو گھر آ کے مل لینا۔ کالج میں لوگ خواہ مخواہ باتیں بناتے ہیں۔''

''میں شام پانچ بجے آ جاؤں گا۔'' وہ مختصراً بول کر آگے سے ہٹ گیا۔

اور ٹھیک شام کے پانچ بجے وہ ماہا کے دروازے کے عین سامنے تھا۔ وہ دروازہ کھول کے خاموشی سے چلتی ہوئی اندر لاؤنج میں آ گئی۔ گھر خالی تھا۔ بچے بوا کے ساتھ باہر پارک میں کھیلنے گئے تھے۔ شائل بھی اسی خاموشی سے آ کے لاؤنج کے صوفہ پر بیٹھ گیا۔ دونوں کے مابین ایک گہری خاموشی تھی، جس کو توڑ پانا دونوں کے لئے مشکل تھا۔

''چائے پیو گے؟'' بہت لئے دیئے انداز میں ماہا نے کہا۔

''نہیں۔''

ایک بار پھر خاموشی کی مکڑی جالا بُننے لگ گئی۔

''مجھ سے کیا غلطی ہو گئی ہے کہ آپ مجھ سے بات نہیں کر رہیں۔'' بہت ہمت کر کے شائل نے موضوع کی شروعات کی۔

''غلطی آپ سے نہیں، مجھ سے ہوئی ہے شائل! میں ہی عمروں اور جگہوں کا فرق بھلا بیٹھی تھی۔'' وہ بہت آہستگی سے گویا ہوئی

''کیسا فرق میم؟........ کس طرح کا فرق؟........ میرے لئے کوئی معنی نہیں رکھتا یہ فرق۔'' وہ بولا۔

''تمہارے لئے نہیں رکھتا لیکن میرے لئے ضرور رکھتا ہے معنی۔ اس معاشرے کے لئے رکھتا ہے۔''

''میں معاشرے کی، دنیا کی پرواہ نہیں کرتا۔'' وہ یقین سے بولا۔

''میری پرواہ بھی نہیں کرتے؟''

شائل نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

''آپ ہی کی تو پرواہ کرتا ہوں۔ صرف آپ کی۔ محبت کرتا ہوں میں آپ سے۔'' وہ بہت شدت سے بولا۔

''چپ ہو جاؤ شائل! میں نہ تمہاری ہم عمر ہوں اور نہ دوست۔ ہم میں کوئی برابری نہیں۔ مت بھولو کہ میں تمہاری ٹیچر ہوں، ایک بیوہ ہوں، ایک ماں ہوں۔ تمہاری ہم عمر لڑکی نہیں۔'' اس کے لہجے میں کرختگی تھی۔

''بار بار ریپیٹ مت کیا کریں۔ میں یہ تمام باتیں اچھی طرح جانتا ہوں۔ علم ہے

مجھے ان تمام حقیقتوں کا۔''

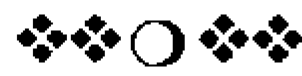
''تو پھر باز آ جاؤ۔ اپنی تعلیم پر توجہ دو۔ اپنی فیملی کی کسی اچھی سی لڑکی سے شادی کر کے گھر بسا لو۔'' ایک مخلصانہ مشورہ آیا۔

''مجھے آپ ہی سے شادی کرنی ہے۔'' اب تمام فرق مٹ گیا تھا اس کے دل سے۔

''بی ہیو یور سیلف شائل! اپنی حدود میں رہو۔'' وہ گرجی۔

''آئی لو یو ماہا!........ آئی لو یو سو مچ۔'' وہ نم آنکھوں سے اس کے سامنے کھڑے ہو کے بولا۔

''شٹ اپ اینڈ گیٹ لاسٹ۔ کبھی دوبارہ یہاں مت آنا۔ نیور۔'' حتمی طور پہ کہتی ہوئی ماہا اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس کی بے رخی شائل کی آنکھیں بھگو گئی تھی۔



بہت کچھ اچانک، آناً فاناً ہو گیا تھا۔

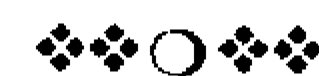
وہ کب لاہور سے لوٹی، کب قصرِ زیب میں اس کی منگنی ہوئی اور کب وہ کسی بت کی طرح کسی کے نام کی انگوٹھی پہنے اس سے منسوب ہو گئی اور کب دو ماہ بعد اس کی شادی کی تاریخ طے ہوئی، اسے پتہ بھی نہ لگا۔ وہ تو بس کہیں کھوئی ہوئی سی تھی۔ محبت نے اس سے اس کا سب کچھ چھین لیا تھا اور جو کچھ اس کے پاس بچا تھا اسے وہ خود اپنے آپ سے چھین لینا چاہتی تھی۔ انتقام لینا چاہتی تھی اس عشق سے جو اس کے اندر پنپ رہا تھا۔ اس شخص سے، جو اسے اکیلا چھوڑ کے چلا گیا تھا۔ اس قسمت سے جس نے اسے کبھی کسی کا پیار نہیں دیا۔ کسی کے نرم بازوؤں میں بھری محبت کا احساس نہیں دیا تھا۔ اسے کوئی دلچسپی نہ تھی کہ وہ کس سے شادی کر رہی ہے، کیوں کر رہی ہے، شادی کے بعد کیا کرے گی۔ محبت میں وہ تو اپنا اعتماد ہی کھو بیٹھی تھی۔

سارا سارا دن اس کا قصرِ زیب کے پائیں باغ میں چپ چاپ بیٹھے گزر جاتا۔ محبت نے کچھ الہام اتارے تھے اس کے اوپر جن کے زیرِ اثر وہ کبھی گنگنایا کرتی، کبھی نظمیں کہتی تو کبھی تصور ہی تصور میں وہ وارث کے پاس جا پہنچتی، اس سے باتیں کرتی، اس سے لڑتی، اس کی آغوش میں سمٹ کے ڈھیر سارا روتی۔ کبھی کسی جھیل کے

تو کبھی المنظر کے کنارے کسی بھیگتی بارش میں وہ وارث کا ہاتھ تھامے دیر تک چلتی جاتی۔ کسی گھنے پیڑ کے جھنڈ میں چھپی اسے دیکھتی، کبھی چاند کے اس پار جا کے اسے آوازیں دیتی، کبھی بادل کے پیچھے چھپ جاتی۔ وہ عشق کی اَن دیکھی راہوں میں بھٹک رہی تھی۔ ہواؤں کی، بادلوں کی، پرندوں کی اور گیتوں کی دنیا میں بس گئی تھی۔ عشق نے اس سے اس کی ذات چھین لی تھی اور اسے لاشعور کی دنیا کے حوالے کر دیا تھا۔

آج کی شام بھی اس کے ہونٹوں پہ اک نظم لے کر اُتری تھی۔

وہ باتیں جو وہ کرتا ہے
مرے دل میں بھی ہوتی ہیں
خیالوں کی وہی دنیا
جو مجھ کو راس آتی ہے
اسے بھی خوب بھاتی ہے
بڑے دلکش ہیں جو منظر
وہ ہم دونوں کو بھاتے ہیں
مجھے بھی یاد ہیں بیتے ہوئے گزرے سہانے دن
اسے بھی ان دنوں کی یاد ہر لحہ رُلاتی ہے
اسے بھی زعم ہے اپنا
مجھے بھی ''میں'' ہی پیاری ہے
سمندر کی تلاطم خیز لہروں کا مقابل وہ
زمانے کی پیاپے ٹھوکروں کا اِک تسلسل ہے
بظاہر کوئی بھی تفریق کا عنصر نہیں ہم میں
مگر اِک فرق مجھ میں اور اس میں صاف رہتا ہے
میں سب کچھ یاد رکھتی ہوں
وہ اکثر بھول جاتا ہے



اگلے دن فرزانہ چوہدری اس کے گھر اس سے ملنے آئی۔ یہ اس کی مہرو سے

دوسری ملاقات تھی۔ پہلی ملاقات منگنی کے روز ہوئی تھی، وہ بھی سرسری سی۔ براؤن کلر کی ساڑھی میں سجی سجائی سی فرزانہ چوہدری اسے کچھ کچھ پرانی گلوکاراؤں سے مشابہہ محسوس ہوئی۔ آتے ہی بہت پُرتپاک انداز میں وہ اس سے ملی۔

''ارے بیٹا مہر النساء! یہ کیا حال بنا رکھا ہے تم نے اپنا۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا تمہاری؟...... اور اتنی اُداس اور کھوئی کھوئی سی کیوں ہو؟'' فرزانہ اسے اپنے ساتھ لپٹا کے بولی۔

''نہیں...... میں ٹھیک ہوں۔ بس ابھی ابھی اُٹھی ہوں نیند سے۔'' وہ بمشکل مسکرائی۔

''او کے بیٹا! اپنا خیال رکھو۔ تمہاری شادی نزدیک ہے۔ بیوٹی پارلر جایا کرو۔ میری بیوٹیشن گھر بھی آتی ہے، کہو تو اسے بھجوا دوں۔''

''نہیں آنٹی! میں چلی جاؤں گی۔ ابھی تو کافی دن ہیں۔'' وہ بولی۔

''صرف ڈیڑھ مہینہ ہے باقی۔ مجھے دیکھو میں کتنی بزی ہوں۔ سارا سارا دن ہال کی بکنگ، ارینجمنٹ، کارڈز کا جھنجٹ۔ بیٹا! تمہاری ہیلپ ہو جائے گی اگر تم اپنا برائیڈل جوڑا خود سلیکٹ کرو۔'' فرزانہ بڑی ٹینشن والے مصنوعی لہجے میں بولی۔

''میں...... لیکن مجھے کوئی تجربہ تو نہیں۔''

''کیا ضرورت ہے تجربے کی؟ اپنی شادی پہ ہر کوئی نا تجربہ کار ہی ہوتا ہے۔ تجربہ سارا بعد میں آتا ہے۔ میں بہت مشہور ڈیزائنر کو جانتی ہوں۔ اس سے اپائنٹ منٹ لے لوں گی۔ تم اس سے مل لینا اور اپنے آئیڈیاز دے دینا اسے۔ بہت اچھی برائیڈل ڈیزائنر ہے۔'' فرزانہ اسے مشورے دینے لگی۔ اور اس طرح کی چند اور باتیں کہہ کے وہ چلی گئی۔ مہر النساء پہ مطلق اثر نہیں ہوا۔

یہ تمام باتیں اس کے لئے بے وقعت تھیں۔ شادی کا ہونا لڑکیوں کے لئے خوشنما احساس ہوسکتا ہے لیکن مہرو کے لئے ایک انتقام تھا۔ وارث کی محبت سے انتقام، اس کے توڑے ہوئے وعدوں کا انتقام۔ وہ اگر وارث کی نہیں ہوسکی تو اپنی بھی ہونا نہیں چاہتی تھی۔ شادی کا یہ ڈھونگ فقط وارث کو دکھانے کے لئے تھا۔ فقط ان پہ جتانے کے لئے تھا، اور کچھ نہیں۔

مہندی، اُبٹن، رنگ، خوشبو اس کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتے تھے۔ اس کے لئے

سب بنجر تھا۔ سوکھا، بے رنگ تھا۔ وہ، وہ نہیں رہی تھی، اس کا بت تھا۔ جس کے اندر دھڑکنوں کا گمان بھی نہیں ہوتا تھا



''سچویشن کو ہم کتنا آسان سمجھ رہے تھے لیکن ہے کس قدر مشکل۔ زیب کا کردار تو اس پوری کہانی میں تھا ہی نہیں۔ اچانک سے زیب النساء کی اس انٹری نے تمام سچویشن ہی بدل دی ہے۔'' چائے کا سپ لیتے ہوئے ہمایوں نے بے حد فکرمندی سے کہا۔

''لیکن موجودگی تو پہلے بھی تھی نا ہمایوں! ایک عورت جو کہ اتنے سال اس قدر تکلیف میں گزارے، وہ عورت کہ جو معمولی بھی نہ ہو، عام بھی نہ ہو، بہت اس کے اپنے ہی آشنا نہ ہوں، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھی شہرین، ہمایوں سے ڈسکس کر رہی تھی۔

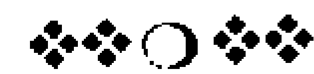
''میرا تو خیال ہے شہرین! کہ زیب کی شہرت سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ ان کے انٹرویوز، ان کے فوٹوز پریس اور ٹی وی پہ جاری کر دینے چاہئیں۔ Return of a star کے نام سے آرٹیکل چھاپے جائیں۔ ان کے ساتھ گزرے سالوں کے واقعات پہ روشنی ڈالی جائے اور ناانصافی کرنے والوں کو سزا دلوائی جائے۔'' ہمایوں نے کہا۔

''لیکن ہومی! زیب آنٹی اس سب کے لئے تیار بھی تو ہوں۔ وہ تو صرف اپنی پراپرٹی اپنے بچوں کے نام ٹرانسفر کرنا چاہتی ہیں اور پھر خود بھی اسی گمنامی میں رہنا چاہتی ہیں۔''

''لیکن کیوں؟ گمنامی کا یہ لبادہ مسلسل اوڑھے رہنے کی وجہ آخر کیا ہو سکتی ہے؟''

''وجہ تو انہی کو پتہ ہے۔ لیکن میں نے ان سے کھل کر بات کی ہے۔ وہ اس راز کو پردے میں ہی رکھنا چاہتی ہیں کہ وہ زندہ ہیں۔ وہ موت کی سی گمنامی کو اپنی ذات کا حصہ بنائے رکھنا چاہتی ہیں۔''

''تو پھر ان کو کنونس کرو۔ اصلی وجوہات کا پتہ لگانے کی کوشش کرو۔ پھر کوئی نہ کوئی حل تلاش کرتے ہیں۔'' ہمایوں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ وہ خاموش رہی۔



''مہرو بیٹا! ذرا باہر آنا۔'' اس کے کمرے کے دروازے کے عین سامنے کھڑے

سردار صاحب اسے آواز دے رہے تھے۔

''جی بابا........!'' وہ بستر پہ نیم دراز کسی رسالے کی ورق گردانی میں مصروف تھی، فوراً اٹھ آئی۔

''بیٹا! تمہاری شادی اور ولیمہ کے کارڈ چھپ کے آ گئے ہیں۔ آج سے ان تمام کارڈز کو بانٹنا بھی ہے۔ تمہیں اگر کسی کو کارڈ دینا ہو تو بھجوا دو۔'' سردار صاحب نے خاکی لفافے میں بندھے کارڈز کا بنڈل اس کی جانب بڑھایا۔

''میری تو کوئی سہیلی نہیں ایسی جسے میں انوائٹ کروں۔'' وہ بہت سادگی سے بولی۔

''پھر بھی بیٹا! ایک نظر دیکھ تو لو۔'' سردار صاحب بضد تھے۔ مہر النساء نے بے دلی سے کارڈ لے لئے۔ سردار صاحب واپس جانے لگے۔ اچانک مہرو کے دل میں خیال آیا۔

''بابا جانی!''

اس کی آواز پہ سردار صاحب پلٹ آئے۔

''جی بیٹا!''

''آپ کے پاس وارث کا ایڈریس ہے؟........سوچ رہی ہوں ایک عدد کارڈ ان کو بھی پوسٹ کر دوں۔'' مہرو کے انداز میں ایک کاٹ تھی۔

سردار صاحب مسکرا دیئے۔

''خان کو تمہاری شادی کی اطلاع ہے بیٹا! کارڈ بھجوانے کا کوئی فائدہ تو نہیں۔ وہ کوئی آ تھوڑی سکیں گے۔''

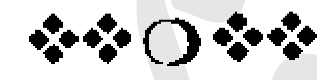
''ان کے آنے یا نہ آنے سے اب کوئی فرق بھی نہیں پڑتا بابا! بس میں چاہتی ہوں وہ اس کارڈ کو دیکھیں۔'' وہ ڈھٹائی سے بولی۔

''ٹھیک ہے بیٹا! میں ابھی اس کا ایڈریس آپ کو ایس ایم ایس کئے دیتا ہوں۔ آپ بے شک انہیں پوسٹ کروا دیجئے گا۔'' سردار صاحب یہ کہہ کے چلے گئے۔

مہرو اپنی رائٹنگ ٹیبل پہ آ کے بیٹھ گئی اور کارڈ نکال کے دیکھنے لگی۔ کارڈ پہ چوہدری سلمان کے نام کو دیکھ کر وہ کتنی مرتبہ تمسخرانہ مسکرائی۔

''تو یہ ہے میرے نئے آقا کا مکمل نام۔'' وہ دل ہی دل میں بولی۔

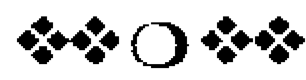
کچھ ہی دیر بعد اس نے فقط دو کارڈز کے اوپر ایڈریس لکھے۔
ایک لاہور میں جہاں آراء کے گھر کے پتے پر .... اور دوسرا وارث کے لندن والے اپارٹمنٹ کے پتے پر۔



وارث کے ہاتھوں میں ایک ٹھنڈا یخ بستہ لفافہ تھا اور اس لفافے کے اندر ایک تپتی تحریر تھی۔
''سردار واجد علی کی بیٹی مہر النساء کی شادی چوہدری ساجد کے فرزند سلمان ساجد کے ساتھ مورخہ بارہ دسمبر کو ہو رہی ہے۔''
وارث کے منہ پر اک زور دار طمانچہ لگا۔ لفافے کے اوپر وارث کا نام تحریر تھا اور نیچے مہر النساء سردار کا۔ یہ سراسر مہرو کی رائٹنگ تھی جسے وہ ہزاروں میں پہچان سکتا تھا۔ مہرو نے اسے یہ کارڈ خود پوسٹ کیا تھا، اپنے ہاتھوں سے۔ وارث کو محسوس ہوا جیسے یہ کارڈ اس خط کے بدلے میں آیا ہو........ اس بے حس سفاک خط کا بدلہ شادی کا ایک کارڈ۔

اس ایک کارڈ نے ہزار طرح کے احساسات جگا دیئے تھے ان کے دل میں۔ وہ بارہ تاریخ سے قبل ہی مہرو کی شادی کے دن میں پہنچ گئے تھے۔ ابھی تو بارہ تاریخ میں چار دن باقی تھے مگر وہ اپنی آنکھوں کے سامنے نکاح نامہ دیکھ رہے تھے۔ مہرو کا اس پہ سائن کرنا اور کسی کا ہو جانا........ کسی کے پھولوں بھرے بستر کی زینت بننا، کسی کی بانہوں میں سما جانا........ وہ ٹوٹ ٹوٹ کے بکھر رہے تھے۔
وہ فوراً اپنے اپارٹمنٹ سے نکلے اور دیر تک بھیگی خنک رات میں پیدل چلتے رہے۔ انہیں کوئی احساس نہ تھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔ بھیگی سردی کے برفیلے موسم میں اوور کوٹ پہنے بغیر ہی گھر سے نکل آئے تھے۔ اسی طرح چلتے چلتے انہیں اچانک سردی کا احساس ہوا اور وہ ایک قہوہ خانے کے اندر چلے گئے اور کافی منگوا کے پینے لگے۔
کافی کے گرم گرم احساس نے اک درد کا احساس بھی ان کے اندر جگایا تھا۔ ہولے ہولے پھر اس پتھر کے آنسو نکلنے لگے........ وہ رونے لگے۔
''شاید اسی طرح کے کھونے کا احساس تمہیں بھی ہوا ہوگا مہرو! کہ جب میں نے وہ

خط تمہیں بھیجا تھا۔ اور اس کے ملنے سے پہلے ہی میں چلا آیا تھا۔ شاید مجھ میں ہمت نہیں تھی تمہارا سامنا کرنے کی۔'' وہ دل ہی دل میں مہرو سے ہم کلام تھے۔
مہرو کا انتقام ایک بے حس اور مضبوط نمک حلال دل میں ٹیس جگا رہا تھا۔ اسے توڑ رہا تھا۔



''مہر النساء کی شادی ہے بانو بی!'' چائے میں جوشاندہ ملاتی جہاں آراء نے بانو بی کو مخاطب کیا تھا۔
''اچھا...... مگر کیسے پتہ چلا تمہیں؟ اور کب ہے شادی؟'' بانو بی حیرانی سے بولیں۔
''کارڈ بھیجا ہے مہر النساء نے آپ کے اور میرے نام۔ بارہ تاریخ کو شادی ہے۔ جہاں آراء نے چائے آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔
''کس سے کر رہا ہے اس کا باپ اس کی شادی؟'' بانو بھی متفکر تھیں۔
''چوہدری سلمان سے۔ چوہدری ساجد کا بیٹا ہے۔ آتا ہے یہاں بھی وہ۔'' جہاں آراء نے کہا۔
''کیا؟........ کیا کہہ رہی ہو جہاں آراء؟........ دشمن کے بیٹے سے بیاہ رہا ہے اپنے جگر کے ٹکڑے کو؟ کیا اور رشتے دنیا میں ختم ہو گئے ہیں؟'' بانو بی کا منہ جوشاندے سے کم اور چوہدری ساجد کے نام سے زیادہ کڑوا ہو گیا تھا۔
''پتہ تو ہے آپ کو اس شخص کا۔ اس کے فیصلے اسی طرح کے ہوتے ہیں۔ جلد بازی اور بے وقوفی کے۔ آج تک کون سا صحیح فیصلہ کیا ہے اس شخص نے۔'' جہاں آراء کے لہجے میں سردار صاحب کے لئے نفرت تھی۔
''چوہدری ساجد اس شخص سے سو طرح کی چالبازیاں کیا کرتا تھا۔ کئی سو بار تو مجھ سے ملا زیب کو پانے کے لئے۔ اور اسی کو بیٹی دینے چلا ہے یہ شخص۔ بھلا وہ خوش رکھ پائے گا اس معصوم بچی کو؟ میری زیب کی کیا حالت کر دی، اب مہرو کی باری ہے۔ تاریخ دوہرا رہی ہے خود کو۔'' بانو بی کا لہجہ بے حد اُداس اور پریشان تھا۔
''تاریخ نہیں دوہرائے گی خود کو بانو بی! آپ پریشان مت ہوں۔ مہر النساء، زیب نہیں ہے۔ وہ آج کی لڑکی ہے۔ مضبوط اور شدت پسند۔ ہر بات کی تہہ تک پہنچ

والی۔ وہ کسی کی زور زبردستی میں نہیں آسکتی اور نہ کسی کا ظلم برداشت کرسکتی ہے۔ وہ لڑے گی اپنے تمام حقوق کی خاطر۔" جہاں آراء مطمئن تھی۔

"رب ہی جانے، تمام راز۔ ویسے وہ لڑکا کیسا ہے؟ تم کہتی ہو کہ آتا ہے ادھر۔"

"ہاں آتا ہے۔ دو ایک بار آیا ہے۔ ویسا ہی ہے جیسے ہوتے ہیں سیاستدان، جاگیردار، نواب زادے۔ پچھلی بار اس نے مہرو کو بھی یہاں میرے ساتھ دیکھا تھا۔ ضد کر رہا تھا کہ اسے یہی لڑکی چاہئے۔" جہاں آراء کی مطمئن سی اطلاع پہ بانو بی اچھل پڑیں۔

"کیا........ کیا؟........ جہاں آراء! مہر النساء کے ہونے والے شوہر نے اسے دیکھا تھا یہاں؟ جانتی ہو کیا اثر پڑسکتا ہے اس کا مہر النساء کی زندگی پہ؟ اس کا یہاں پہ دو لمحے اسے دیکھ لینا زندگی بھر کا روگ بن سکتا ہے اس بچی کے لئے۔" بانو بی گھبراہٹ سے بولیں۔

"فکر مت کریں بانو بی! میں نے اسے کہہ دیا تھا کہ یہ لڑکی یہاں کی نہیں ہے اور نہ یہ کام کرتی ہے۔ لیکن جس طرح ان دونوں نے انجانے پن سے ایک دوسرے کو دیکھا تھا، میرا نہیں خیال کہ وہ پہلے سے جانتے ہیں ایک دوسرے کو۔"

"پھر بھی جہاں آراء! مہر النساء ہماری اپنی ہے۔ ہمارے جگر کا گوشہ ہے۔" بانو بی کی آنکھیں نم تھیں۔

"جگر کا گوشہ تو زیب بھی تھی۔ مہرو تو پھر بھی تا عمر آپ کی آنکھوں سے دور رہی، لیکن زیب نے تو آپ کے آنگن میں ہی آنکھ کھولی تھی۔ پاؤں پاؤں چلنا سیکھا تھا۔ پھر آپ نے اس کے ساتھ ایسا کیوں کیا بانو بی!" جہاں آراء کے مطمئن اور خشک لہجے میں بہت طنز تھا۔

بانو بی خاموش ہوگئیں۔ اُداسی، ویرانی اور بے بسی کے ملے جلے تاثرات تھے ان کے چہرے پر۔

"کبھی کبھی انتقام اس طرح سے دل پہ سوار ہو جاتا ہے کہ کبھی رشتوں کو بھلا دیتا ہے۔ اس وقت اقبال بانو کے سر پہ بھی انتقام سر چڑھ کر بول رہا تھا اور اسی انتقام نے بھلا دیا کہ زیب میری ہی بیٹی ہے۔"

"تو پھر آپ یہ بھی بھلا دیں کہ مہرو بھی آپ کی کچھ لگتی ہے۔ میں اسے یہاں آپ سے ملوانے اس لئے لائی تھی تاکہ آپ اپنے احساسِ جرم کو کچھ کم کرسکیں۔ ورنہ اگر مہرو کو پتہ چل جاتا کہ اس کی ماں کی قاتل........"

"بس کرو جہاں آراء! بس کرو........ کتنی بار کہا ہے کہ مت دوہرایا کرو یہ الفاظ۔ زیب کا چہرہ ہمیں سونے نہیں دیتا، جینے نہیں دیتا۔ کمبخت نہ موت آتی ہے اور نہ زندہ رہ سکتی ہوں۔" بانو بی کی آواز میں لرزش سی آگئی۔

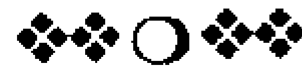
"معافی مانگا کریں بی بانو! گناہ بخشے جانے والی بارگاہ ہے۔ یوں تو ہمارے گناہ بخشے جانے کے قابل بھی نہیں۔ لیکن معافی مانگنے کا حق تو رکھتے ہیں نا۔" جہاں آراء مسہری کے سرہانے بیٹھ کر بانو بی کو سنبھالنے لگیں۔

"کہاں ہے وہ دعوت نامہ جہاں آراء! ہمیں دکھاؤ۔"

"ہم نے کون سا وہاں جانا ہے بانو بی! اس کا باپ ہمیں جانے تھوڑی دے گا وہاں۔ وہ تو بچی ہے۔ کسی بات سے آگاہ نہیں۔ بھیج دیا ہوگا محبت میں۔" جہاں آراء دھیمے پن سے بولیں۔

"پھر بھی، دکھاؤ تو مجھے۔" بانو بی بضد تھیں۔

'وہ تو وہاں پہنچ چکا جہاں اسے پہنچنا چاہئے تھا بانو بی!' جہاں آراء نے دل ہی دل میں سوچا مگر خاموش رہیں۔



اور اگلے ہی دن شہرین کو وہی کارڈ ایک ڈاک کے ذریعے ملا۔ جو پاگل خانے میں موجود ریحانہ نے شہرین کے دیئے پتے پہ پوسٹ کر دیا تھا۔ ریحانہ اس سے قبل بھی زیب کی کچھ اور چیزیں شہرین کے پتے پہ بھیج چکی تھی۔ شہرین کارڈ پڑھ کے کچھ دیر خاموش ہوگئی۔ اور شام کو وہی کارڈ زیب کے حوالے کیا اور کارڈ پڑھ کر زیب کی تو آنکھیں ہی پتھرا گئیں۔

"یہ کیا کرنے چلیں ہیں سردار صاحب؟........ کیا ہوگیا ہے ان کو؟........ کیسے کر سکتے ہیں وہ اتنا بھیانک فیصلہ؟........ نہیں، نہیں........" زیب نفی میں اپنی گردن ہلانے لگی تھیں۔

"لیکن کیوں آنٹی؟........ چوہدری ساجد بہت مضبوط پولیٹیکل ہستی ہیں اور سردار صاحب کے پرانے دوست بھی۔ الیکشن کے بعد تو وہ دونوں بہت قریب آ گئے ہیں۔" شہرین آہستگی سے بولی۔

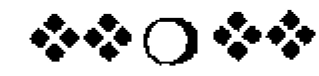
"کمینہ ہے وہ۔ ذلیل آدمی ہے اول نمبر کا۔ سردار کی بربادی میں اسی کا تو ہاتھ ہے۔ جڑیں کاٹنا ہی تو جانتا ہے وہ۔ اس بار سردار کی بہت مضبوط جڑ پہ ہاتھ ڈالا ہے اس نے شہرین! کسی طرح یہ شادی رُکوا لو۔ مت ہونے دو یہ شادی۔" زیب کے لہجے میں ممتا بھری التجا تھی اور بے پناہ کرب بھی۔ وہ اپنے جگر کے ٹکڑے کو اپنی بانہوں میں بھر لینا چاہتی تھیں۔

"لیکن کس طرح آنٹی؟........ پرسوں شادی ہے۔ آج رات مہندی اور مایوں ہے۔ اور سکیورٹی اس قدر سخت ہے کہ اندر جانا ناممکن ہے کسی بھی انجان فرد کا۔" شہرین نے اطلاع دی۔

"لیکن مہرو سے رابطہ تو ہو سکتا ہے نا۔" ثمین نے کہا۔

"موبائل تو مسلسل آف ہے اس کا۔ گھر کے نمبر پر ٹرائی کر کے دیکھتی ہوں۔ اصل میں وہ اتنی ریزرو رہتی ہے کہ اس تک پہنچنا یا اس کے کسی گہرے ساتھی تک رسائی حاصل کرنا بے حد مشکل ہے۔" شہرین بولی۔

"میں اس سے خود ملنا چاہتی ہوں۔" زیب کا لہجہ نم تھا۔ دس سالوں سے چھپا کرب تھا اس کے اندر۔ شہرین خاموشی سے ان کی جانب دیکھتی رہ گئی۔



ہوا کے مقابل
اگر پھول آئے
تو پھر پنکھڑی پنکھڑی
اُجلے بادل کے خوابوں کی صورت بکھر جائے گی
سو ایسے میں، جھکنے میں ہی خیر ہے
بارشِ سنگ میں
خواب کے شیش محلوں کو کب تک بچائے رکھیں

اتنے ہاتھوں میں پتھر ہیں
کوئی تو لگ جائے گا
اور پھر گھپ اندھیرے میں
کب تک نظر ان کی کرچیاں ڈھونڈے گی
کیا یہ بہتر نہ ہو گا
کہ ایسی قیامت سے پہلے ہی
ان شیش محلوں کو ہم
مصلحت کی چمکتی ہوئی ریت میں دفن کر دیں
اور پھر خواب بُنتی ہوئی آنکھ کو موند لیں!

مہر النساء اپنے ہاتھوں میں لگی خشک ہوتی مہندی کے پھولوں کو ویران آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ ایسی آنکھیں کہ جو پتھرا گئی ہوں، گنگ ہو گئی ہوں۔ اس مہندی میں اسے کسی نئے خواب کی چمک اور رعنائی کی جگہ آج تک دیکھے ہوئے تمام خوابوں کی کرچیاں نظر آ رہی تھیں۔ ان تمام خوابوں کی لاشیں لہو بن کے اس کی مہندی کو رچا رہی تھیں۔

کسی کا بدل جانا، اپنے وعدوں سے مکر جانا، اپنے ارادوں سے پھر جانا کتنا اذیت ناک ہوتا ہے۔ پتھر تو یوں بھی دنیا والے دامن پہ لگاتے ہیں۔ لیکن وہ پتھر کس قدر اذیت ناک ہوتے ہیں کہ جو اس شخص کی طرف سے تحفہ ہوں جس کو آپ نے فقط محبت دی۔

جس کے نام خوابوں کے کچے شیش محل ہر آن جوڑے۔ جس کے نام پہ زندگی کی ہر سانس تحریر کر دی، جس کے لئے تمام کی تمام کشتیوں کو اپنے ہاتھ سے آگ کے حوالے کیا۔ اگر وہی جلتی آگ والی کشتیوں کو بیچ بھنور کے چھوڑ دیا جائے تو زندگی کتنی بے وقعت ہو جاتی ہے۔

اس کی مہندی کا فنکشن تھا۔ وہ اوپر والے کمرے میں بیٹھی بہت کھوئی کھوئی آنکھوں اور بجھے بجھے دل کے ساتھ ہاتھوں میں لگی مہندی کو دیکھے جا رہی تھی۔

'کاش، آپ آج یہاں ہوتے وارث! اور دیکھتے کہ حسرتوں کے خون میں رچی

مہندی آپ کی مہرو پہ کتنی جچ رہی ہے۔' وہ دل ہی دل میں وارث سے مخاطب ہوئی۔

سسرال سے آیا مہندی کا سبز اور پیلا جوڑا پہن کے اسے نیچے ہال میں لے جایا گیا۔ ہم عمر لڑکیاں، سہیلیاں مہندی کے گیتوں سے اس کا استقبال کر رہی تھیں۔

فوٹو گرافر مختلف اینگلز سے اس کی تصاویر اتار رہا تھا اور وہ مہندی اور اُبٹن کی خوشبو میں بسی مندر میں رکھی پتھر کی دیویوں کی طرح خاموش تھی۔ وہ دیویاں کہ جن کے اوپر چڑھاوے چڑھائے جائیں، جنہیں سنہری گوٹوں والی چیزوں سے ڈھانپا جائے، ان کے لئے ڈھیروں ڈھیر چیزیں لائی جائیں مگر ان پتھرزادیوں کو مطلق پرواہ نہ ہو۔

مہندی اور مایوں کی رسم ہوتی رہی۔ سات سہاگنیں اس کی پیشانی پہ صندل اور تیل سے اپنے اپنے سہاگوں کے اسم تحریر کرتی رہیں۔ اپنی اپنی دعائیں اسے سونپتی رہیں کہ وہ جنگل کی بھیانک رات میں تنہا بھیڑیے کے پاس جا رہی تھی۔



''میں اندر آ سکتی ہوں بابا؟''

دیوار سے لگے صوفہ پہ بیٹھے سردار صاحب کسی کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے۔ کمرہ نیم روشن تھا۔ ماربل کے ایک خوبصورت اسٹیچو کے ہاتھ میں تھامی مشعل لیمپ کا کام کر رہی تھی۔

''مہر النساء! آ جاؤ اندر بیٹا۔'' وہ اٹھ کر اسے اندر بلانے لگے۔

جھلمل جھلمل کرتے پیلے جوڑے اور سبز چنری میں، ہاتھوں پہ گہرے رنگ کی مہندی کے پھول سجائے، گلے اور کلائیوں میں پھولوں کے ہار پہنے وہ مہر النساء تھی۔ ان کی لاڈلی بیٹی اِک نئے اور انوکھے روپ میں ان کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ اندر آ گئی۔

''میں کچھ دیر آپ کے پاس بیٹھ سکتی ہوں بابا؟ .... بہت اُداس اور بہت تنہا محسوس کر رہی تھی۔ اور اس گھر میں آپ کے علاوہ اور کوئی ہے بھی تو نہیں نا بابا!'' اس کی آواز بھیگی بھیگی سی تھی۔

سردار صاحب کے دل میں اِک ٹیس اُٹھی۔ انہیں پہلے احساس ہی نہ ہو سکا تھا کہ ان کی اکیلی بیٹی، بن ماں کی بچی کیسا تنہا محسوس کرتی ہو گی۔ شادی سے پہلے چند دن تو یوں بھی قیامت کے سے گزرتے ہیں ہر لڑکی پر۔ اپنا گھر آنگن چھوڑ کے اِک بالکل انجانی دنیا میں چلے جانا اِک بہت عجیب تجربہ ہوتا ہے ہر لڑکی کے لئے۔ ایک ہی احساس دل میں مضبوط ہوتا ہے کہ ایک شخص اسے بیچ رہا ہے اور دوسرا خرید رہا ہے۔ اس کی قید، اس کا پنجرہ اور اس کا مالک تبدیل ہو رہا ہے اور آئندہ زندگی میں شاید اس کی بچی کھچی مسکراہٹیں بھی اس سے چھن جائیں گی۔

''آ جاؤ میری جان! میری بچی!'' سردار صاحب نے اپنی دونوں بانہیں پھیلا دیں۔ محبت کا یہ اظہار بہت برسوں بعد انہوں نے مہرو کے لئے کیا تھا۔ وہ تڑپ کے

ان کے گلے سے لگ گئی۔ ان کے سینے سے لگتے ہی آنسوؤں کا اِک سمندر اُبل پڑا اور خود پہ کیا گئی دنوں کا ضبط چھناکے سے ٹوٹ پڑا اور وہ پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔ اس وقت سردار صاحب اسے باپ نہیں بلکہ ماں محسوس ہوئے۔ اس وقت ان کے سینے میں سے اسے ممتا کی لو اُٹھتی محسوس ہوئی۔

''بابا! میں بہت تنہا محسوس کر رہی ہوں بابا! میرا کوئی نہیں ہے۔'' وہ بہت روہانسے پن سے بولی۔

''ارے بابا کی جان! بیٹھو، یہاں میرے پاس بیٹھ جاؤ۔'' بابا اسے شانوں سے تھام کر صوفہ تک لے آئے اور اپنے پاس بٹھا دیا۔

''آپ اپنے آنسو پونچھیں اور میری بات غور سے سنیں۔'' وہ بہت پیار سے بولے۔ وہ بھی فرمانبردار بچی کی طرح اپنی آنکھیں صاف کرنے لگی۔

''آپ کو اس قدر تنہا محسوس کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں ہوں آپ کے ساتھ۔ زین ہے، وارث ہیں۔''

''ان کا آپ نام بھی مت لیں بابا! پلیز۔'' وہ تڑپ اُٹھی۔

سردار صاحب مسکرا دیئے۔ شاید وہ سمجھے کہ مہرو، وارث کے یوں اچانک چلے جانے پہ ان سے ناراض ہے۔ وہی لاڈ بھری ناراضگی جو وہ ہمیشہ دکھایا کرتی تھی۔

''لگتا ہے خان سے بہت ناراضگی ہے۔ وہ بے چارہ بھی کیا کرتا، اس کی بھی تو اپنی زندگی ہے۔ وہ اپنے تمام فیصلے خود کرنے پر قادر ہے۔ کوئی تمام عمر کے لئے کسی کو اپنا آپ دے تھوڑی دیتا ہے؟'' بابا بہت آہستگی سے بولے۔ وہ نم آنکھوں سے فقط بابا کا چہرہ دیکھے گئی۔

''آپ نے کھانا کھایا ہے مہرو؟'' بابا نے اس کا چہرہ دیکھ کے کہا۔ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

''میں ابھی کھانا منگواتا ہوں۔ آپ یہاں میرے سامنے کھانا کھائیں۔'' وہ بولے۔

''مجھے بھوک نہیں بابا!''

''ایسا نہیں کرتے بیٹا! کھانے سے کیسی ناراضگی؟'' وہ اس کے گال کو تھپتھپاتے ہوئے بولے۔ آج مہرو انہیں وہی ننھی منی گڑیا محسوس ہو رہی تھی۔ زیب اور واجد کی

ننھی گڈی۔ اس کا بچپن لمحہ لمحہ ان کی آنکھوں کے آگے دوڑ رہا تھا۔

''آپ بھی میرے ساتھ کھائیں گے بابا؟'' وہ سوالیہ نظروں سے پوچھنے لگی۔ سردار صاحب مسکرا دیئے۔ وہ اٹھے اور دیوار پہ لگے انٹرکام پہ کھانا منگوایا۔

کچھ ہی دیر میں نوکر ٹرالی میں انواع و اقسام کی ڈشز لئے اندر آ گیا اور کھانا سرو کرنے لگا۔

''آپ جاؤ کرم دین! آج اپنی بیٹی کے لئے کھانا ہم خود نکالیں گے اور اپنے ہاتھوں سے کھلائیں گے۔'' انہوں نے کہا اور مہرو حیرت سے اپنے سخت مزاج اور کرخت دل باپ کو دیکھ رہی تھی۔ یہ آج انہیں کیا ہو گیا تھا؟

''کیا کھاؤ گی مہرو؟ چاول یا پھر یہ شامی کباب؟........ چکن کڑاہی بھی ہے اور ماش کی دال بھی۔'' وہ پلیٹ اٹھائے اسے پوچھنے لگے۔

''کچھ بھی بابا!'' وہ نم آنکھوں سے بولی۔ سردار صاحب نے چاول اور شامی کباب نکالے اور چمچ میں ڈال کر اسے کھلانے لگے۔ وہ کھانے لگی۔

''ایک بات کہوں بابا؟''

''بولو بیٹا!''

''آج آپ میرے بابا نہیں، امی لگ رہے ہیں۔'' کتنی دیر سے آنکھ میں اٹکا آنسو پھسل کے گال پہ گر پڑا۔ سردار صاحب خاموش ہو گئے۔ ان کے دل میں آج کانٹا سا چبھا تھا۔

''آج اگر تمہاری امی یہاں ہوتیں تو شاید تم خود کو اتنا تنہا محسوس نہ کرتیں۔ میں سمجھ سکتا ہوں ان دنوں میں ہر لڑکی اپنی ماں کو اپنے نزدیک دیکھنا چاہتی ہے بیٹا! لیکن قسمت کے آگے کوئی کیا کر سکتا ہے؟'' آج سردار صاحب نے پہلی بار اس کے سامنے زیب کا ذکر کیا تھا۔ مہرو کو بے پناہ مسرت ہو رہی تھی۔

''بابا! جب امی کی شادی ہو رہی تھی، تب ان کے پاس بھی تو ان کی امی نہ تھیں۔ پھر حساب تو برابر ہوا نا۔'' مہرو روانی سے بولی۔

سردار صاحب حیرت سے اس کا چہرہ دیکھ رہے تھے کہ اسے کہاں سے یہ باتیں پتہ چلیں۔ زیب ہمیشہ سے ہر کسی کے لئے راز ہی رہی تھیں۔

"وہ حالات کچھ اور تھے بیٹا! وہ ماحول کچھ اور تھا۔ آپ کے حالات اور ماحول بہت الگ ہے۔" سردار صاحب نے بہت دھیمے سے لہجے میں کہا اور ایک ایک چمچ کر کے اسے کھلاتے رہے۔

"کتنا مشکل ہوتا ہے نا بابا! اس طرح کے حالات میں سروائیو کرنا، جس طرح کے حالات میں میری امی نے سروائیو کیا۔ اتنی چھوٹی عمر میں اپنا گھر بار چھوڑ آنا اور اکیلے زندگی گزارنا۔" مہرو کی نظریں خلاء میں تھیں اور سردار صاحب کی نظریں اس کے چہرے کے بدلتے تاثرات پر۔

"یہ تمام باتیں تمہیں کس نے بتائیں مہر النساء؟" وہ پوچھ بیٹھے۔ وہ مزید سرک کے ان کے پاس آئی اور ان کے گھٹنے پہ اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"میں جب لاہور میں تھی نا بابا! تو میں نے امی کا وہ کمرہ کھولا تھا۔ اس کمرے سے مجھے امی کی لکھی کچھ ڈائریاں ملی تھیں۔ بابا! میں نے وہ تمام کی تمام ڈائریاں پڑھ لیں۔" مہرو نے انکشاف کیا۔ سردار صاحب کھلی کھلی آنکھوں سے بیٹی کو دیکھتے رہے۔

وہ ڈائریاں زیب کی امانت تھیں اور انہوں نے کبھی بھی انہیں کھول کر پڑھا نہ تھا۔ نجانے کیا کیا لکھا تھا ان میں۔

"امید ہے ان ڈائریوں میں ماضی کا کوئی ایسا حصہ نہیں ہوگا کہ جو تمہیں اپنے باپ سے متنفر کر سکے۔" وہ کھوئے کھوئے پن سے بولے۔

"نہیں بابا! ماں کی ڈائریوں میں تو آپ کے لئے صرف اور صرف پیار ہے، محبت ہے اور احترام ہے، اِک اَن دیکھی پرستش ہے، بے پناہ شدت ہے۔ ان ڈائریوں سے تو مجھے فقط امی کی شادی سے قبل کے حالات اور آپ کی شروع کی ملاقاتوں کے بارے میں پتہ چلا ہے۔" وہ بولی۔

سردار صاحب نے اپنا ہاتھ بیٹی کے ہاتھ پہ رکھ دیا۔

"اور بابا! میں امی کے مزار پر بھی گئی تھی۔ میں وہاں بہت دیر بیٹھی رہی۔ میں نے امی سے ڈھیروں ڈھیر باتیں بھی کیں۔" وہ بولی۔

ایک اور انکشاف تھا۔ سردار صاحب کو حیرانی کا ایک اور جھٹکا لگا۔

"تمہیں وہاں کا پتہ کیسے چلا؟ میں نے تو تمہیں کبھی نہیں بتایا۔" وہ بولے۔

"بابا! میں وہاں اپنی خالہ اور نانی سے ملی تھی۔"

اس بار کا انکشاف سردار صاحب کے لئے بہت حیرت انگیز اور کٹھن تھا۔ انہیں غصہ آیا مگر وہ ضبط کرنا جانتے تھے۔

"مجھے پتہ ہے بابا! آپ کو وہ لوگ پسند نہیں اور نہ ماں کو تھے۔ بابا! میں وہاں جانا بھی نہیں چاہتی تھی مگر انہوں نے خود ہی مجھے ڈھونڈا۔ ان کا کوئی عجیب شکل والا نوکر تھا، بانکا۔ اس نے مجھے نجانے بازار میں کس طرح پہچان لیا۔ اور پھر داتا دربار میں مجھے خالہ ملنے آ گئیں اور مجھے اپنی والدہ سے ملوانے لے گئیں۔" مہر النساء نے تفصیل بتائی۔ سردار صاحب نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر سے پرے ہٹا دیا تھا۔

"آپ کو وہاں نہیں جانا چاہئے تھا۔ وہ لوگ اچھے نہیں ہیں۔" بابا کمال ضبط کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

"بابا! مجھے ان سے کوئی انس، کوئی رغبت نہیں۔ مجھے کوئی اشتیاق بھی نہیں تھا۔ دوسری بار فقط امی کی قبر پہ جانے کے لئے ملی تھی میں جہاں آراء سے۔ اور بابا! آپ کو بے خبر رکھنے کی اور اجازت نہ لینے کی میں معافی مانگتی ہوں۔" وہ بہت پیار سے ان کے گھٹنے پر جھک کے بولی۔

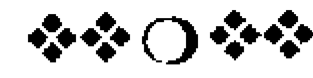
"کوئی بات نہیں بیٹا! لیکن آئندہ ان سے کوئی رابطہ نہ رکھنا۔ وہ لوگ فقط دکھ دینا جانتے ہیں، خوشیاں چھیننا جانتے ہیں۔ وہ لوگ نہ ہوتے تو شاید آج تم اتنی تنہا بھی نہ ہوتیں۔ زیب آج تمہارے ساتھ ہوتیں۔" سردار صاحب اس کے سر پر اپنا ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔

"بابا! مجھے معاف کر دیجئے۔ نہ صرف اس فعل کے لئے بلکہ ہر اس فعل کے لئے جس نے آپ کا کبھی بھی دل دُکھایا ہو۔ آج میری یہاں آخری رات ہے بابا! مجھے معاف کر دیجئے بابا!" ٹپ ٹپ آنسو اس کی آنکھوں سے اتر کے سردار صاحب کے دامن میں سمٹنے لگے۔

"بیٹیاں اپنے والد سے معافیاں نہیں، دعائیں لیتی ہیں۔ خدا تمہارا سہارا بنے میری بچی!.......تم سدا شاد و آباد رہو۔" وہ ڈھیروں ڈھیر دعائیں دیتے ہوئے بولے۔

وہ دیر تک روتی رہی۔ اور سردار صاحب اپنی لاڈلی بیٹی کی زندگی اور صحت کے لئے

دعائیں مانگتے رہے۔



"میں نے بڑی کوشش کی آنٹی! مگر مجھے مہر النساء کے کمرے تک کسی نے جانے نہیں دیا۔ میں اوپر چلی بھی گئی تھی مگر مجھے پتہ چلا کہ مہرو اپنے بابا کے کمرے میں ہے۔ اس وقت رات کے بارہ بجے تھے اور زیادہ انتظار کرنا مناسب نہیں تھا اس لئے میں چلی آئی۔" شہرین، زیب کے سامنے بیٹھی نہایت پریشانی سے کہہ رہی تھی۔ ہزار کوشش کے باوجود بھی مہندی کی رات وہ مہرو سے مل نہیں سکی تھی۔

"لیکن شہرین! تم کسی ملازم سے کہہ دیتیں کہ تم مہرو کی سہیلی ہو۔ یا کلاس فیلو۔" ثمین نے کہا۔

"امی! میں نے کہا تھا۔ کئی بار کہا تھا۔ لیکن سبھی کے پاس ایک ہی جواب تھا کہ رسم کے بعد ملاقات ہو سکتی ہے۔ اور رسم کے بعد مہرو کسی سے بھی ملاقات کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کی طبیعت شاید خراب تھی۔"

"کیا وارث تھا وہاں پہ؟" زیب نے اچانک پوچھا۔

"وارث؟ .... یہ وارث کون ہے؟" شہرین حیران تھی۔

"وارث اس گھر کا بہت اہم اور مضبوط حصہ ہے۔ سردار صاحب کا دایاں ہاتھ۔ مہرو کا سب سے بڑا رازدار اور زین کا دوست۔ اگر وارث مل جاتا تو وہ بہت آسانی سے تمہیں مہرو سے ملا دیتا۔" زیب نے تفصیل سے تعارف کروایا۔

"لیکن آنٹی! اگر آپ مجھے کل وارث کے متعلق بتا دیتیں تو شاید میں ان سے مل لیتی۔ مجھے تو علم ہی نہ تھا۔ ویسے ایک بار مہرو کو جب میں نے فون کیا تھا تب ملازم نے وارث کا ذکر کیا ضرور تھا۔" شہرین نے ذہن پر زور ڈالنے کی کوشش کی۔

"اب کیا کر سکتے ہیں۔ آج شادی کا دن ہے۔ مجھے تو لگتا ہے اب کچھ ممکن نہیں۔" ثمین متفکر تھیں۔

"نہیں........ ایسا مت کہیں۔ ہم آج بھی کچھ کر سکتے ہیں۔ شہرین! میں وہاں جانا چاہتی ہوں۔" زیب نے کہا۔

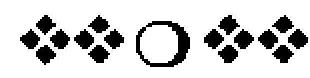
"لیکن آنٹی! آپ کو تو وہاں کوئی بھی پہچان سکتا ہے۔" شہرین حیرت سے زیب

کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"نہیں........ مجھے کوئی نہیں پہچانے گا۔ میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔ میں صرف وارث کو ڈھونڈوں گی۔ تم اس سے ملوگی اور مہرو سے ملنے کا کہو گی۔ اور پھر میں خود مہرو کے سامنے آؤں گی۔"

"لیکن........ کیا مہرو آپ کو نہیں پہچانے گی؟"

"اپنی بچی کی زندگی بچانے کے لئے مجھے چاہے کتنے ہی بڑے راز کو افشاء کرنا پڑے تو میں کر دوں گی لیکن اس کی زندگی تباہ ہونے سے بچا لوں گی۔ ہر صورت میں۔" زیب بہت یقین سے بولی تھیں۔



جسم چندن کے مس سے دمکتا ہوا
آنکھ خوابوں کی افشاں سے بوجھل بہت
ہونٹ پر ان کہی کا مزا
گوری گوری کلائی سے لپٹی ہوئی موتیے کی لڑی
سرخ گوٹے کے جوڑے میں لپٹی ہوئی
ایک ننھی کلی
شامیانے کی پرلی طرف
وقت کے جبر سے
چپ کھڑی مامتا
اپنی نازوں کی پالی کی خاطر
وہ بڑی چاؤ سے
ڈھونڈ لائی ہے
اِک ذرا کم ضرر بھیڑیا!

آئینے میں مہرو نے اپنا چہرہ دیکھا تو اس سے اپنا آپ پہچانا نہ گیا۔ وہ خود تھی یا پھر کوئی اور لڑکی۔ یہ آنکھیں، یہ ہونٹ، یہ چہرہ اس کا تو نہ تھا۔ یہ تو کوئی اور تھی۔ چہرہ اپسراؤں کی طرح سجا تھا۔

اسی ہزار کا خوبصورت اور نازک کام والا جوڑا تھا۔ زیور لاکھوں کی مالیت کے تھے۔ ہاتھوں میں ہیرے اور سونے کی انگوٹھیاں تھیں۔ اور یہ مہر النساء تھی۔ سردار واجد کی بیٹی اور چوہدری سلمان کی ہونے والی بیوی........ یہ وارث کی مہرو تو نہ تھی۔ نہ اس مہرو کے جیسی اس کی ہنسی تھی اور نہ جگمگاتی، لو دیتی آنکھیں تھیں۔ نہ وہ بہتے جھرنے کی روانی کی سی کھنکھناہٹ والے قہقہے تھے اور نہ آنکھوں کی پتلیوں میں کوئی روشنی۔

وہ ایک دیوی محسوس ہو رہی تھی۔ مندروں کی سجی سجائی چار دیواری میں روشنیوں، پھولوں، اگربتیوں کے درمیان زبردستی سجا کے رکھی ہوئی پتھر کی مورتی۔ بظاہر جس کی آنکھیں، ہونٹ اور چہرہ سجا سجایا ہوتا ہے مگر روح مُردہ ہوتی ہے۔ احساس نہیں ہوتا، لوگ اس کے سامنے روتے ہیں، تڑپتے ہیں، اس سے مانگتے ہیں مگر وہ احساسات سے خالی ہوتی ہے۔ نہ سن سکتی ہے نہ دیکھ سکتی ہے اور نہ محسوس کر سکتی ہے۔ وہ فقط ان پرستش میں مگن پجاریوں کے لئے اک ڈھارس ہوتی ہے، اک آسرا ہوتی ہے جو وہ خود کو دیتے ہیں۔

مہر النساء بھی دُلہناپے کے لباس میں لپٹی اپنے اردگرد کے لوگوں کے لئے اک ڈھارس تھی۔ اصل مہرو تو وہاں تھی بھی نہیں۔ وہ تو وارث کے پاس تھی، ان کے ساتھ تھی۔ المنظر کے کنارے ان کے ساتھ بیٹھی اُٹھتی گرتی لہروں کو دیکھ رہی تھی یا کسی درختوں کے جھنڈ کے پیچھے انہیں ڈھونڈ رہی تھی۔ کسی عبادت گاہ میں بیٹھی ان کے ملنے کی دعائیں مانگ رہی تھی یا پھر کسی باغ میں پھول توڑ کر ان کے لئے جمع کر رہی تھی۔

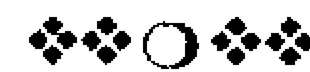
''کتنی پیاری دُلہن بنی ہے۔'' کسی نے اس کے روپ کو سراہا تھا۔

''بالکل اپسراؤں کا سا روپ چڑھا ہے اس پر۔'' یہ کوئی دوسری تھی۔

''لگ ہی نہیں رہی کہ یہ پہلے والی مہر النساء ہے۔'' تیسری بولی۔

''دُولہے میاں کہیں دیکھ کے گر نہ پڑیں۔'' ایک اور آواز آئی۔

''گرنا ہی تو ہے۔ چاہے دیکھ کے گریں چاہے بنا دیکھے۔'' ایک لڑکی کے چٹکلے پہ ہنسی کی ملی جلی آوازیں آنے لگیں۔ اس طرح کے چٹکلے دُلہنوں کے اندر کھٹے میٹھے احساسات جگاتے ہیں۔ مگر اس کے اندر کسی قسم کا کوئی احساس نہیں تھا۔



''سردار واجد بات کر رہے ہیں؟'' فون کی دوسری طرف سے کسی نے پوچھا تھا۔ سردار صاحب کے پیچھے گانے بجانے کا کافی شور تھا۔ وہ بغور سننے کی کوشش میں تھے۔

''جی۔ بات کر رہا ہوں۔'' وہ بولے۔

''کئی دنوں سے آپ سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں مگر آپ کو کوئی فون دیتا نہیں ہے۔ بڑی مشکل سے آپ کا پرسنل نمبر ملا ہے۔'' دوسری طرف کوئی ادھیڑ عمر مرد تھا۔

''معاف کیجئے گا، میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔'' وہ بولے۔

''میں ریاض احمد آفریدی بات کر رہا ہوں۔ میرے کالج میں آپ کا بیٹا زین العابدین پڑھتا ہے۔ میں کالج کا پرنسپل ہوں۔'' وہ بولے۔

''جی، جی ریاض صاحب! میں ہی زین کا فادر ہوں۔'' سردار صاحب بولے۔

''آپ سے بہت ضروری بات کرنی تھی سردار صاحب!''

''جی کہئے ریاض صاحب!''

''سردار صاحب! بات دراصل بہت مشکل ہے۔ لیکن آپ کو بتانی بے حد ضروری ہے۔ آپ منسٹر ہیں، بڑی اہم پولیٹیکل شخصیت ہیں۔ اگر یہ بات آؤٹ ہوگئی تو آپ کے نام پہ بہت بڑا دھبہ آ سکتا ہے۔'' ریاض صاحب نے شروعات کی۔

''کہئے، اب تو مجھے تشویش ہو رہی ہے۔'' سردار صاحب واقعی پریشان ہوگئے۔

''دراصل بات یہ ہے کہ آپ کا بیٹا........ زین........'' وہ اٹک رہے تھے۔

''کہئے ریاض صاحب! کیا، کیا زین نے؟ کوئی شرارت یا پھر بدتمیزی یا کوئی نقصان؟'' سردار صاحب اُلجھ رہے تھے۔

''سردار صاحب! زین العابدین دو دن سے ہمارے ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہے۔ اس کی حالت بہت خراب ہے۔''

''کیا؟........ لیکن اسے کیا ہوا ہے؟ کوئی حادثہ یا پھر بیماری؟'' سردار صاحب کے دل کی دھڑکن اتھل پتھل ہو رہی تھی۔

''اس نے .... اس نے ڈرگز لئے ہیں........ بلکہ وہ نشے کا عادی ہو گیا ہے اور اس کے کمرے سے بھی ہیروئن سے بھری سگریٹ ملی ہیں۔'' ریاض صاحب ٹھہر ٹھہر

کے بتا رہے تھے اور سردار صاحب کے پاؤں کے نیچے سے زمین سرکتی جا رہی تھی۔ وہ جواب میں کچھ کہہ بھی نہیں پا رہے تھے۔

"آپ تو کبھی یہاں آئے بھی نہیں۔ وارث خان صاحب آتے تھے، مگر دو تین ماہ سے وہ بھی نہیں آئے۔ بچے کی حالت بہت نازک ہے۔ آپ آ کے اسے لے جائیں، ہم لوگ کسی قسم کا کوئی رِسک لینا نہیں چاہتے۔"

ریاض صاحب اور بھی بہت کچھ کہہ رہے تھے مگر سردار صاحب خاموش کھڑے تھے۔ انہوں نے زین کو ایک فون بھی نہیں کیا تھا۔ کارڈ بھیجا تھا مگر اسے زیادہ فورس کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ اس کی تعلیم کا نقصان ہونا تھا۔ وہ تو جانتے ہی نہ تھے کہ ان کا اکلوتا لاڈلا کس حال میں ہے۔ کیا کر رہا ہے۔ کس زہر کو پی رہا ہے۔

"میں........ میں آج رات یا پھر کل صبح کی فلائٹ سے اسلام آباد پہنچوں گا اور زین کو اپنے ساتھ لے آؤں گا۔" وہ بمشکل بولے تھے۔ ایسے میں انہیں وارث کی شدت سے یاد آئی تھی۔ اگر وہ ہوتے تو شاید ابھی اور اسی وقت زین کے پاس پہنچ جاتے۔ لمحہ بھر کا بھی انتظار نہیں کرتے۔ لیکن سردار صاحب اکیلے تھے۔ بیٹی کے باپ تھے۔ رخصتی سے قبل جانا نہ مناسب تھا اور نہ موزوں۔ زین کے بارے میں یہ اطلاع ایک صدمے سے کم نہ تھی۔ انہوں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ زین ایسا کر سکتا ہے۔ ان کے ہاتھ کے چھالے کی طرح سے پلا بڑھا بیٹا جس کی رگوں میں سراسر ان کا خون تھا، اس گندی دلدل میں گر گیا اور انہیں خبر بھی نہ ہوئی۔ وہ کیا کرتے؟ کہاں جاتے؟ کس کو سناتے؟ ایک طرف رخصت ہوتی بیٹی تھی اور دوسری طرف موت کی طرف جاتا بیٹا۔ کس کی نظر لگ گئی تھی قصرِ زیب کے پھولوں کو؟

زین کا ننھا منا چہرہ سردار صاحب کی آنکھوں کے آگے جھلملاتا رہا اور ٹپ ٹپ آنسو ان کی آنکھوں سے بہنے لگے۔

"بابا........!"

"بہت دھیرے سے انہیں کسی نے پکارا تھا۔ لمحہ بھر کو یہ آواز انہیں زین کی آواز محسوس ہوئی تھی۔ وہ تڑپ اُٹھے۔

"زین......!" بے اختیار ان کے منہ سے نکلا تھا۔ سامنے مہر النساء کھڑی تھی۔

سرخ جوڑے میں دُلہن بنی ان کی پیاری بیٹی۔

"میں ہوں بابا! مہر النساء۔" وہ آگے آئی۔ روشنی میں اس کا چہرہ ذرا واضح ہوا۔ آنسو بہاتے اپنے بابا کو اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔

"آپ رو رہے ہیں بابا؟" وہ ان کے پاس ان کے گھٹنوں میں دو زانو ہو کے بیٹھ گئی۔ سردار صاحب نے اپنی آنکھیں پونچھیں۔

"بابا! میں زین کا پوچھنے آئی تھی۔ وہ ابھی تک نہیں آیا۔ اس سے آپ کی بات ہوئی ہے؟"

"زین........ ہاں........ وہ آ جائے گا........ کل صبح تک۔ اصل میں وہ اکیلا سفر نہیں کر سکتا۔ وارث ہوتا تو اتنی مشکل نہیں ہوتی۔ کل میں جاؤں گا اور اسے لے آؤں گا۔" سردار صاحب نے پردہ ڈالنے کی کوشش کی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ مہر النساء کوئی صدمہ دل پہ لے کر اپنی نئی زندگی کی شروعات کسی قسم کی ذہنی پریشانی سے کرے۔

"ویسے تو بڑا شیر بنتا ہے اور دو گھنٹے کا جہاز کا سفر نہیں کر سکتا پاگل۔" مہر النساء مسکرائی۔ سردار صاحب کی آنکھیں دوبارہ سے بھر آئیں۔

"کل آ جائے گا وہ۔ مل لینا اس سے اور کر لینا جتنے گلے شکوے کرنے ہوں۔" سردار صاحب خود کو سنبھالتے ہوئے بولے۔

"لیکن اگر آج وہ ہوتا تو مجھے بہت اچھا لگتا۔ اس کی ایک ہی بہن ہے اور اس کی شادی پہ وہ غیر حاضر ہے۔" وہ بسوری۔ سردار صاحب خاموش رہے۔

"بابا!" اس نے اپنی گردن سردار صاحب کے گھٹنے پہ جھکا لی۔ سردار صاحب نے اپنا ہاتھ اس کے سر پہ رکھ دیا۔

"آپ بہت اکیلے ہو جائیں گے نا بابا!" مہرو کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"اکیلا تو میں بہت پہلے ہو گیا تھا مہر النساء! جب تمہاری امی مجھے چھوڑ گئی تھیں۔ اور رہی بات تمہاری شادی کی تو یہ تو دنیا کا بہت پرانا دستور ہے۔ بیٹیاں چاہے کسی بادشاہ کی ہوں یا فقیر کی، گھر تو کوئی نہیں بٹھاتا۔ اور پھر کل میں زین کو لے آؤں گا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔"

"کیا واقعی بابا؟........ آپ زین کو ہمیشہ کے لئے لے آئیں گے؟" وہ اُچھلی۔

"ہاں......اب وہ ہمیشہ یہیں رہے گا۔ ہمارے پاس۔" سردار صاحب بولے۔

"میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ اسے اکیلا نہ بھیجیں۔ تنہا رہنے سے بڑا عذاب اور کوئی نہیں ہوتا۔"

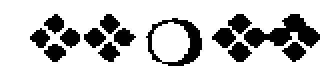
"صحیح کہتی تھیں تم۔ خان نے ہمیں بتایا تھا کہ مہر النساء، زین کے ہاسٹل شفٹ ہونے کے حق میں نہیں لیکن ہم ہی ضد پہ تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ وہ تنہا رہے گا تو اس کے اندر خود اعتمادی پیدا ہوگی۔ وہ دنیا میں چلنا پھرنا سیکھے گا۔ لوگوں سے ڈیل کرنے کا طریقہ سیکھے گا۔ لیکن ہمیں پتہ نہ تھا کہ......" سردار صاحب کی آنکھیں پھر نم ہو گئیں۔

"کیا ہوا ہے بابا؟ زین ٹھیک تو ہے نا؟" وہ والد کی آنکھوں سے چھلکتے آنسوؤں میں پنہاں درد کو محسوس کر رہی تھی۔

"زین ٹھیک ہے بیٹا! بس ہم بہت اُداس اور تنہا محسوس کر رہے ہیں۔ کچھ آپ کی جدائی کا بھی احساس دل کو کاٹ رہا ہے۔" سردار صاحب نے بات بدلی۔

"ارے میرے اچھے بابا! میں کسی دور شہر تھوڑی جا رہی ہوں؟......اسی شہر میں ہوں۔ آپ جب کہیں گے، آپ سے ملنے کے لئے آ جاؤں گی۔ آپ کا ایک فون میرے لئے دعوت نامے کی حیثیت رکھے گا آپ نے ادھر فون گھمایا، ادھر مہر النساء حاضر بالکل بوتل کے جن کی طرح۔" مہر النساء، بابا کا دل بہلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن ان کا دل تو کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا تھا۔ ایک آنکھ میں زین کا آنکھیں موندے لیٹا ہوا چہرہ تھا اور دوسری آنکھ میں بیٹی کا آنسوؤں سے تر بتر چہرہ تھا۔

وہ آج زیب کو شدت سے یاد کر رہے تھے۔ آج انہیں کسی کے سہارے کی ضرورت تھی۔



زیب بہت دیر سے شہرین کے ہمراہ شامیانے کی پرلی طرف کھڑی تھیں۔

"وقت گزرتا جا رہا ہے شہرین! بہت دیر ہو رہی ہے۔" زیب نے اسی پریشانی بھرے چہرے سے شہرین کو دیکھا تھا۔

"دو گھنٹے ہو گئے ہیں یہاں کھڑے ہوئے اور آپ کو وارث صاحب نظر نہیں آئے۔ اب یہی راستہ ہے کہ آپ مہر النساء کے کمرے میں خود چل کر اس سے ملیں

اور جلد از جلد اسے سمجھائیں جو سمجھانا ہے۔ نو بجنے میں صرف آدھا گھنٹہ ہے اور نو بجے نکاح ہے۔" شہرین نے کہا۔

"ٹھیک ہے......تم مجھے اوپر اس کمرے میں لے چلو۔ میں اسے بتا دوں گی کہ میں کون ہوں۔ اس طرح کوئی نہ کوئی حل ضرور نظر آ جائے گا۔" زیب نے کہا اور شہرین اسے ساتھ لئے اندر کی طرف بڑھی۔

شہرین نے شادی کی مناسبت سے اچھا سا لباس پنا تھا اور زیب نے ایک لمبی چادر سر تا پا اوڑھ رکھی تھی۔ ان کا چہرہ بھی کافی حد تک پوشیدہ تھا۔ دونوں نے چلتے چلتے شامیانے کا وہ حصہ عبور کیا اور قصرِ زیب کے اندر پاؤں رکھے۔

اندر قدم رکھتے ہی زیب کے دل کی دھڑکنیں بڑھنے لگیں۔ یہ قصرِ زیب تھا......

وہی قصرِ زیب جسے ان کے لئے بنایا گیا تھا۔ جس کا ایک ایک کونہ ان کی محبت اور دلچسپی کا مظہر تھا، جس کی مٹی میں ان کے خواب گندھے تھے۔ جس کی خوشبو میں ان کی خوشبو بسی تھی۔ جس کے نام میں ان کا نام بسا تھا۔ جس کی اینٹ اینٹ انہوں نے محبت سے چنوائی تھی۔ اور جس سے ایک دن اس طرح اچانک بچھڑی تھیں وہ کہ انہیں خود پتہ بھی نہ چلا۔ اور آج اسی طرح اچانک وہ دوبارہ اندر بھی آ گئی تھیں۔ بنا سوچے، بنا طے کئے۔

وہ آہستہ آہستہ شہرین کے ہمراہ گزرتی رہیں انہی جانی پہچانی راہداریوں سے۔ وہی راہداری، وہی دروازہ، دروازے کے بعد وہی کاریڈور۔ وہی لاؤنج، اوپر کو جاتے وہی زینے، وہی بادامی دیواریں جن کے اوپر خوبصورت پینٹنگز آویزاں تھیں۔ یہاں تو کچھ بھی نہیں بدلا تھا......سبھی کچھ ویسے کا ویسا تھا۔ کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی۔

اٹھارہ برس بھی قصرِ زیب سے ان کے نشان مٹا نہیں پائے تھے۔ زیب مسرت و حیرت سے عجیب عالم میں تھیں کہ انہیں اپنے سامنے ایک چہرہ نظر آ گیا۔ اس چہرے کو دیکھ کر ان کے پاؤں زمین میں گڑ گئے۔

سردار صاحب کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ کر وہ ٹھٹک کے رک گئی تھیں......

سترہ سال جس چہرے کو تخیل کے پردے پہ سجا کے رکھا، کبھی اسے جاگتی آنکھوں سے اپنے سامنے بھی دیکھیں گی، انہوں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔

سردار صاحب کی شخصیت میں وہی جاہت، وہی قامت، چہرے پہ وہی برسوں پرانا تقدس اور اُجلا پن........بس عمر کی سیڑھیوں پہ چڑھتے چڑھتے کچھ چینج ان کے رویے اور سوچ میں آیا تھا۔ زندگی میں آنے والی پریشانیوں نے بہت توڑ دیا تھا۔ آج تو ان کا چہرہ کچھ زیادہ اُداس، پژمردہ اور اُترا ہوا لگ رہا تھا۔ زنین کی چوٹ اور مہرالنساء کا دُکھ، اس کی جدائی کی تکلیف۔ وہ اندر ہی اندر گھل رہے تھے۔

انسان کی سائیکی بہت مشکل سے کسی فرد کے خلاء کو قبول کرتی ہے۔ کوئی کئی برس آنکھوں کے سامنے رہتا ہے۔ ذہن و دل اس کی موجودگی، اس کی باتوں، اس کی توجہ کی عادت ڈال لیتے ہیں۔ مزاج اس کا تابع ہونے لگتا ہے۔ اور پھر اچانک وہ شخص آپ کی زندگی سے رخصت ہوتا ہے۔ ایک کبھی نہ پُر ہونے والا خلاء دے کر۔

زیب نے اپنا چہرہ چادر سے ڈھانپ لیا۔ سردار صاحب اس کے پاس سے گزر کے مہرو کے کمرے میں چلے گئے۔ دلفریب پرفیوم کی وہی سالوں پرانی مہک اس کے حواس سے ٹکرا کے اسے بے قرار کر گئی۔

''کون تھے یہ آنٹی؟'' شہرین نے پوچھا۔

''یہ ...... یہ مہرالنساء کے بابا تھے۔'' وہ بہت روہانسی آواز میں بولی۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھری بھری سی تھیں۔

''سردار صاحب؟........آنٹی! آپ کو ان سے ملنا چاہئے تھا۔ شوہر ہیں وہ آپ کے۔'' شہرین نے کہا۔

''وہ میرے شوہر ضرور ہیں شہرین! لیکن میں ان کی بیوی نہیں۔ ان کی بیوی تو برسوں پہلے تاریخ کے اہراموں میں دفن ہو گئی ہے۔ وہ تو شاید دیکھیں تب بھی مجھے پہچان نہ سکیں۔'' زیب کے لہجے میں محرومی تھی۔

''یہ نتیجہ آپ نے کس طرح اخذ کر لیا زیب آنٹی؟........آپ نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ آپ نے انہیں کوئی دھوکا نہیں دیا۔ کوئی بے وفائی نہیں کی۔ بلکہ آپ کی کہانی تو شاید کسی کو معلوم نہیں۔'' شہرین بولی۔

''معلوم ہو بھی جائے تو میں اپنی تقدیر بدل تھوڑی سکوں گی؟........اپنے گزرے ہوئے اٹھارہ برس واپس تو نہیں لا سکوں گی۔ چلو یہاں سے شہرین!''

''لیکن آنٹی! آپ نے مہرالنساء سے ملنا تھا۔'' شہرین نے یاد دلایا۔

''اب شاید بہت دیر ہو چکی ہے۔ ہم اس شادی کو نہیں روک سکتے۔ چلو یہاں سے۔'' زیب، شہرین کو ہاتھ سے گھسیٹتی باہر دروازے کی طرف لے گئیں۔ شہرین کچھ حیران کچھ پریشان وہاں سے چلی آئی۔



نکاح کا وقت ہو گیا تھا۔

سردار صاحب بیٹی کے پاس بیٹھے تھے۔ کریم اور سرخ رنگ کے کنٹراسٹ لہنگا چولی میں مہر النساء ہمیشہ سے بہت الگ، بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ جیسے کہ سجی سجائی کوئی گڑیا۔ ماہر بیوٹیشن کے ہاتھوں نے اسے بے حد نکھرا نکھرا اور الگ سا بنا دیا تھا۔ سردار صاحب نم آنکھوں سے اسے دیکھ رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ وقت کس طرح پَر لگا کر اُڑ جاتا ہے۔ کل ہی تو ننھی پری بن کے مہر النساء ان کے آنگن، ان کی بانہوں میں اُتری تھی، جس کے رُوئی سے نرم ہاتھ پاؤں دیکھ کے وہ اور زیب دیر تک تشکر آمیز لہجوں میں ہنسا کرتے تھے۔ خوش ہوتے تھے۔ اور ان کی وہی ننھی پری آج سرخ جوڑا پہنے ان کے سامنے کھڑی تھی۔ زیوروں میں لدی پھندی، خوشبوؤں میں بسی ہوئی دُلہن۔ ان کی مہرو۔

وہ مہرو کے پاس آئے۔ مہرو بستر پہ چپ چاپ بیٹھی اپنی انگلیوں میں پہنی انگوٹھیوں سے کھیل رہی تھی۔

انگوٹھیاں، ہار، پازیبیں سب کے سب عورتوں کی قید کی نشانی ہیں۔ بہت صدیاں پہلے جب عورت کو قید کرنے کی شروعات کی گئی ہوں گی تو اسی طرح اس کے پاؤں میں زنجیریں ڈالی گئی ہوں گی اور پھر یہ روایت بڑھتے بڑھتے فیشن کا روپ اختیار کر گئی۔ پاؤں کی بیڑیاں پازیبیں بن گئیں، ہاتھوں اور گلے کی زنجیریں انگوٹھیاں اور ہار بنتے گئے۔

یہ روایت آج بھی اسی طرح سے موجود ہے۔ دُلہنا پا آتے ہی دُلہن کو زیوروں سے سجا دیا جاتا ہے۔ گویا اس کی قید کا آغاز ہوا ہے۔ اور اسے بیڑیاں پہنا دی جاتی ہیں۔ اور مرد ہمیشہ انہی زیوروں کے بل بوتے پر عورت کو قید کرتا ہے، اسے یقین دلا

کر کہ یہ چوڑیاں، چھلے، پازیب تم پہ بہت جچتے ہیں۔ ان کے بنا تم کچھ بھی نہیں، تمہارا وجود بے کار ہے۔ ان کے بنا تم خالی ہو۔ بنا کسی انعام کا خالی ڈبہ۔

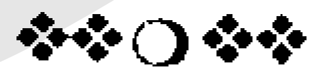
سو آج مہر النساء بھی انہی زیوروں کی قید میں جکڑی بیٹھی تھی جو اسے کسی مرد نے پہنائے تھے۔

''اتنا اُداس نہیں ہوتے بیٹا! یہ تمہاری نئی زندگی کی شروعات ہے۔'' سردار صاحب نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا۔ وہ خاموش رہی۔ آنسو بہنا چاہ رہے تھے مگر وہ انہیں بہانا نہیں چاہتی تھی

''سب کچھ اس طرح اچانک ہو گیا بیٹا! پتہ بھی نہیں چلا۔ تمہاری منگنی اور پھر شادی۔ بیٹا! تم نے زندگی بہت اکیلے گزاری ہے، بہت محرومیوں میں گزاری ہے۔ چھوٹی سی عمر میں بڑے بڑے دُکھ جھیلے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تمہاری آنے والی زندگی میں تمہارے لئے بہت سی خوشیاں ہوں گی، بہت سے خواب اور ان کی تعبیریں ہوں گی۔ گھبرانا نہیں بیٹا! اُس گھر کو بھی اپنا گھر سمجھنا۔ جتنا تم اُن کو اپنا سمجھو گی، اتنا ہی وہ بھی تمہیں اپنا مانیں گے۔ اور جتنا تم انہیں پرایا کرو گی، وہ بھی تمہیں اتنا ہی پرایا کریں گے۔ مجھے معلوم ہے بیٹا! کہ تم ایڈجسٹ کر جانے والی لڑکی ہو۔ اپنا بنانے والی لڑکی ہو۔ اور مجھے تمہاری طرف سے کوئی شکایت نہیں سننی پڑے گی۔'' بابا کا لہجہ روہانسا ہو گیا۔ مہرو نے اپنی گردن بابا کے کندھے سے ٹکا لی۔

''میری طرف سے تمہاری پرورش میں یا کسی فیصلے میں کوئی کوتاہی، کوئی کمی رہ گئی ہو تو مجھے معاف کر دینا بیٹا!'' بابا نے اس کے سر پہ اپنے ہاتھ کی گرفت کو مضبوط کیا اور وہ بابا کے سینے میں چہرہ چھپائے دیر تک روتی رہی۔

قاضی اور وکیل نکاح کے لئے اندر آئے اور بابا کی موجودگی میں اس نے نکاح نامے پہ سائن کئے۔ ڈوبتی آنکھوں اور لرزتے اشکوں میں فقط وارث کا چہرہ تھا۔ روح کو چیر کے اک چیخ باہر آئی تھی جس میں صرف اور صرف وارث کا ہی نام تھا۔



حجلہ عروسی کا دروازہ کھلا اور وارث نے اندر قدم رکھا۔ انہوں نے فان کلر کی شیروانی پہنی تھی جس پہ سنہرے رنگ کے ریشم کا کام تھا۔ دبیز قالین پہ اپنے پاؤں

رکھتے وہ سجی سجائی مسہری تک آئے جو پھولوں سے ڈھکی تھی اور انہی پھولوں کے درمیان مہرو بہار کے پہلے پھول کی تصویر بنی بیٹھی تھی۔ پھولوں کا پردہ اٹھا کے وارث بستر پہ بیٹھ گئے اور مہرو کا مخروطی ہاتھ تھام لیا۔

"بہت ریاضتوں کے بعد آج کی رات آئی ہے مہرو!........ کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میں آپ کو پا سکوں گا۔ آپ........ آپ میری ہر ریاضت کا ثمر ہو۔ میرے ہر امتحان کا پھل ہو۔ آپ میری زندگی کا حاصل ہو۔"

وارث نے مہرو کے ہاتھ پہ مہر محبت ثبت کی۔ مہرو کی سسکیوں کی آواز خوشبو سے بوجھل کمرے میں پھیل رہی تھی۔ وارث نے اس کا گھونگھٹ اٹھایا اور حیران رہ گئے۔ مہرو کا چہرہ مکمل طور پر لہولہان تھا۔ لہو اُبل اُبل کر مہرو کے چہرے سے باہر گر رہا تھا۔ اس کا دودھیاں سفید چہرہ خون سے سرخ ہو رہا تھا........!

وارث نے تڑپ کے آنکھ کھولی اور اپنے اردگرد کا جائزہ لیا۔ شام کے کسی پہر کا عمل تھا۔ وارث نے انتہائی ٹمپریچر کی حالت میں نیند کی ٹیبلٹ کھائی تھی۔ وہ سونا چاہتے تھے۔ کم از کم آج کی رات وہ سونا چاہتے تھے۔ آج انہیں نیند کی آغوش میں پناہ کی ضرورت تھی۔ وہ آج کی رات ہوش و خرد سے بیگانہ ہو جانا چاہتے تھے۔ اپنا پیار، اپنے خواب، اپنی تمنائیں وہ آج کسی اور کو سونپ آئے تھے۔ دل کے کسی کونے میں اِک شدید ٹیس سی اُٹھ رہی تھی۔ جانتے تھے کہ آج مہرو کی کیا حالت ہو گی۔ وہ تڑپ رہی ہو گی۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ تڑپ آج انہیں اپنی روح کے اندر محسوس ہو رہی تھی۔

انہوں نے اپنے کمرے کا لیمپ جلایا۔ کمبل سے باہر آئے اور پانی کا گلاس غٹاغٹ پی گئے۔

آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں۔

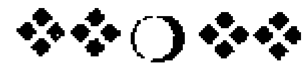
جسم حرارت سے تپ رہا تھا۔

ایک پری پیکر مگر خون آلود چہرہ آنکھ کے پپوٹوں پہ لرز رہا تھا اور ایک بازگشت کانوں میں گونج رہی تھی۔

قبول ہے........

قبول ہے........

قبول ہے........



میں نے تمہاری آشاؤں کا
ہر ہر روپ سراہا تھا
میں نے اپنا آپ بھلا کر
تم کو ٹوٹ کے چاہا تھا
اب کیا شکوہ، کیسی شکایت
چاہت کے سب رشتے کچے
میں بھی اور تم بھی ہرجائی
میں بھی ٹھیک اور تم بھی سچے

گھٹنوں کے اوپر سر کو رکھے، آنکھیں کسی غیر مرئی نقطے پہ ٹکائے، بے پناہ اُداسی اپنے اندر چھپائے وہ چند گھنٹوں کی دُلہن مہر النساء تھی۔ سجی سجائی سیج کے عین درمیان بیٹھی تھی۔

سلمان کمرے میں آ چکا تھا اور کپڑے تبدیل کرنے کی غرض سے واش روم میں چلا گیا تھا۔ مہر النساء کے دل میں کسی طرح کی گھبراہٹ یا کوئی خوش کن احساس نہیں تھا۔ وہ تو بے جان سی گڑیا کی طرح رکھی ہوئی تھی۔ نہ کوئی گدگداتا احساس تھا، نہ تن من میں برقی لہر دوڑانے والا کوئی خیال۔ بس اِک آگ تھی جو تن من سلگائے جاتی تھی۔ اس نے ابھی تک آنکھوں سے بھی اپنے ہمسفر کا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ اسے کوئی دلچسپی بھی نہیں تھی۔ وہ کیسا بھی ہوتا، لمبا، چھوٹا، گورا، دُبلا پتلا یا پھر مکمل خوبصورت شخصیت والا۔ وہ صرف ایک شوہر ہوتا........ مجازی خدا کا درجہ سنبھالنے والا، احکامات اور حقوق کی چھڑی اپنے ساتھ لانے والا، استعمال کرنے کے بعد استعمال شدہ ٹشو پیپر کی طرح پھینک دینے والا مرد۔

وہ ہلکے رنگ کی ٹی شرٹ اور ٹراؤزر میں ملبوس باتھ روم سے نکلا۔ امپورٹڈ پرفیوم کی مہک چار سُو پھیل گئی۔

''اِٹس آل ربش مین!........فضول قسم کے کپڑے، بے ہودہ قسم کی رسمیں۔ بندے کو گدھا سمجھتے ہیں یہ روایتی لوگ۔'' اس کے منہ سے نکلا۔

پہلا ہی جملہ مہرو کو چونکا گیا۔ اس نے گردن اٹھا کے اس مہربان کی طرف دیکھا۔ وہ چہرہ شناسا سا تھا۔ کہاں دیکھا تھا مہرو نے اُسے؟........ وہ ذہن پہ زور ڈالنے لگی۔

''ہیلو مسز!.......کیسی ہیں آپ؟'' وہ جمپ لگا کے بستر پہ اس کے عین سامنے لیٹ گیا۔ مہرو کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ یہ کیا طریقہ تھا۔

''ہم پہلے بھی مل چکے ہیں، اس لئے یہ ہماری پہلی ملاقات نہیں۔ شاید تمہیں یاد ہو، لاہور میں........ ڈیفنس ای بلاک میں، جہاں آراء کے گھر۔''

اس کے جملے پہ مہرو ہکا بکا اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''میں تو تمہیں بتا سکتا ہوں کہ اس رات میں وہاں کیا کرنے گیا تھا۔ لیکن تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم وہاں کیا کرنے گئی تھیں؟'' عجب کاٹ دار اور چبھتا ہوا سوال تھا۔ اور اتنا ہی کاٹ دار اور کمینہ سلمان کا لہجہ۔

''یہ تو مجھے علم ہے کہ تم اسی خاندان سے ہو، لیکن تم بھی یہ کام کرتی ہو، مجھے پتہ نہیں تھا۔''

''بی ہیو یور سیلف۔ میں ایسا کچھ نہیں کرتی۔ میں اُس گھر میں پہلی اور آخری بار گئی تھی۔ میرا ان سے کوئی تعلق نہیں۔'' وہ اعتماد سے بولی۔

''اچھا........ اس کا مطلب فریش پیس ہو ابھی تک........ فرسٹ ہینڈ۔'' وہ سر سے پاؤں تک اسے کمینے پن سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''مائنڈ یور لینگویج۔'' وہ تڑپی۔ ''میں آپ کی بیوی ہوں۔''

''معاف کرنا، بیویوں کا تجربہ نہیں ہے مجھے۔ یوں کئی لڑکیوں کا ذائقہ چکھ چکا ہوں۔ فرنگی، دیسی، ادھیڑ عمر، لیکن ان میں سے کوئی بیوی نہیں تھی۔ اب تم آ گئی ہو، اب تمیز سے پیش آنا بھی آ جائے گا۔'' اس نے آگے بڑھ کے اس کے عروسی دوپٹے کو بڑی بے دردی سے کھینچا۔

''کیا کر رہے ہیں آپ؟'' اس نے دوپٹے کے دوسرے پلو سے خود کو چھپایا۔

''کیا مطلب؟........ کیا کر رہا ہوں؟........ ابھی ابھی تو تم نے کہا کہ تم میری

بیوی ہو۔ میں وہی کچھ کر رہا ہوں جو مجھے کرنا چاہئے۔'' وہ اس کے قریب آیا۔ وہ تڑپ کے دور ہٹی۔

''چوہدری صاحب! میں آپ کی بیوی ہوں، ایک رات کے لئے خریدی ہوئی طوائف نہیں۔ یہ رشتہ بہت مقدس ہوتا ہے۔ اس کے کچھ طور طریقے ہوتے ہیں۔''

آنسو قطار در قطار اس کے گالوں پہ بہہ رہے تھے۔

''کوئی فرق نہیں ہوتا بیوی اور طوائف میں، سوائے اس کے کہ طوائف مہنگی ہوتی ہے اور بیوی سستی۔ طوائف سب کی ہوتی ہے اور بیوی صرف اپنی۔''

اس کے خیالات سن کے مہر النساء کی روح بھی تڑپ اُٹھی تھی۔

''پسند تو تم ہمیں اُسی شام آ گئی تھیں جب تمہیں پہلی بار دیکھا تھا۔ تمہیں پانے کی تڑپ اُسی رات سے بے چین کر رہی ہے۔ پتہ نہیں تھا کہ تقدیر وہی شراب کی بوتل ہمیں تحفے میں دے گی، جس کا نشہ ہم کرنا چاہتے ہیں۔ اور مت تڑپاؤ ہمیں۔ آ جاؤ۔'' وہ ایک بار پھر لپک کے اس پہ حملہ آور ہوا تھا اور مہر النساء اپنے دُولہے کے چنگل سے خود کو ایسے آزاد کرا رہی تھی جیسے کسی غنڈے اور لٹیرے کے بازوؤں سے آزاد کرا رہی ہو۔

''پروردگار! میری مدد کرو۔'' وہ تڑپ رہی تھی۔

انسانیت کا بد سے بدتر روپ وہ اپنے شوہر کے روپ میں دیکھ رہی تھی۔ یہ جنگلی جانور تھا، وحشی تھا یا پھر کوئی انسان؟ وہ حیران آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی........!

اور یہ عین آدھی رات کا کوئی پہر تھا یا پھر صبح کاذب کا، آسمان پہ کچھ کچھ ستارے ٹمٹما رہے تھے مگر وہ بھی شاید آنسو بہا رہے تھے اُس ایک رات کی دُلہن پر جو زندگی کے گھپ اندھیرے میں کوئی روزن تلاش کر رہی تھی۔

اپنا سب کچھ کھو بیٹھی تھی........ عروسی دوپٹے میں اپنا چہرہ چھپائے پھوٹ پھوٹ کے رو رہی تھی۔ آج اس کے پاس کچھ بھی نہیں بچا تھا........ سر اٹھا کر فخر سے کالج اور یونیورسٹی میں چلنے والی مہر النساء آج اپنا سب کچھ گنوا چکی تھی ایک وحشی مرد کے ہاتھوں جو اس کا مجازی خدا تھا۔ جو اس کی کل کائنات تھا........ جو اُس کے جسم کا لباس تھا۔

اگر خدا کے بعد سجدہ جائز ہوتا تو اسی کو ہوتا۔ کیوں ہوتا؟

اس کی درندگی کا انعام ہوتا وہ سجدہ؟ یا اُس کی بے حسی، بے رُخی، خود غرضی اور وحشی پن کا تحفہ ہوتا وہ سجدہ؟

اُس کے حقوق کی قطار میں کھڑا ایک اور حق ہوتا وہ سجدہ؟ یا اس کے فرائض کی لسٹ میں لگا بیوی کی خاطر ایک اور فرض؟

کیوں دیتا ہے یہ مقام خدا شوہر کو کہ جب وہ اپنے فرائض میں کوتاہی برتتا ہے۔ عورت کو بیوی نہیں، استعمال کی چیز سمجھتا ہے۔ کوئی ٹشو پیپر، جسے بے دردی سے نکالا، استعمال کیا اور کچرے میں پھینک دیا۔ یا پھر کوئی کاغذ، جسے جب چاہا پھاڑا، مسلا، روندا، کچلا اور کاغذوں کے ڈھیر میں دبا کر رکھ دیا۔

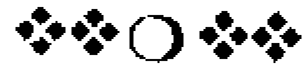
سسکیوں کی آوازیں کبھی دبی ہوئی تو کبھی گھٹی ہوئی مہرو کے حلق سے نکل رہی تھیں اور وہ بے حس شخص بستر پہ آڑا ترچھا بے خبر سو رہا تھا۔ اپنے فرض کی ادائیگی کے بعد۔ اپنے نئے تعلق کی ابتداء کے بعد کسی گِدھ کی طرح کہ جس نے مردار پہ شب خون مارا ہو اور شکم سیری کے بعد چین کی نیند سو رہا ہو۔

تقدیر نے کیسا کھیل کھیلا تھا اس معصوم زندگی کے ساتھ۔ وہ جس نے کبھی کسی کے ساتھ برا نہیں کیا تھا، جس نے کبھی کسی کے لئے غلط نہیں سوچا تھا۔ وہ جو فقط مسکراہٹوں اور نیک تمناؤں سے سبھی کے متعلق سوچا کرتی تھی، سب سے ملا کرتی تھی، اس کے ساتھ انجانے میں کیا کچھ ہو گیا۔

پہلے خواب کرچی کرچی ہوئے، محبوب بیچ راستے میں بنا پوچھے، بنا بتائے ساتھ چھڑا کر حالات کے حوالے کر کے چھوڑ گیا۔ وہ تنہا صحرا میں بھٹکتی سسّی کی طرح حیران و پریشان بھٹکتی رہی۔ دشت در دشت بھاگتی رہی۔ نہ اسے محبوب کے بدل جانے کا گمان تھا اور نہ اس کی بے وفائی کا یقین۔ وہ تو خواب میں سوئی کسی شہزادی کی طرح منتظر تھی کہ کب اس کے جسم کی تمام سُوئیاں اس کا شہزادہ نکالے گا اور کب وہ آزاد ہو جائے گی اور پھر جنگل کی قید سے دور اِک آزاد اور خوبصورت زندگی ہو گی۔

لیکن قسمت کی کہانی کچھ اور ہی تھی۔ نہ دشت میں پنوں ملا اور نہ کوئی شہزادہ آیا۔ بلکہ شہزادے کی بے وفائی اور خود غرضی نے اسے کسی بھیڑیے کو چننے پہ مجبور کر دیا تھا اور وہ تا عمر کے لئے اِک سچ مچ کے بھیڑیے کی تحویل میں آ گئی۔

وہ بھیڑیا جو اسے پہلی رات ہی نوچ کھرچ کے گیا تھا۔ جس کی آغوش میں آ کے اسے لامتناہی قسم کا تحفظ نہیں بلکہ پامال ہونے کا احساس ہوا تھا۔ اور پھر یہ تو اس کی پامالی کی فقط ابتداء ہی تھی۔



زین کی حالت دیکھ کے دُکھی باپ کی رُوح تک لرز گئی تھی۔ یہ وہ لاڈلا تو نہیں تھا جسے چار ماہ قبل سردار صاحب نے دیکھا تھا۔ سولہ سترہ سالہ وہ کمسن بچہ سردار صاحب کو اپنا ہم عمر لگ رہا تھا۔ مرجھائے ہونٹ، سیاہ رنگت، سرخ اور لاغر آنکھیں، ہاتھوں اور پاؤں کی اُبھری ہوئی نسیں، مایوس اور پژمردہ چہرہ...... وہ تو کوئی اور تھا۔ زین العابدین کا فقط سایہ۔

اپنے گھر کے اپنے ہی کمرے میں وہ سردار صاحب کے سامنے بیٹھا تھا مگر کتنا لاتعلق اور اجنبی جیسے وہ اس کے بابا نہ ہوں۔ جیسے وہ ان کا لاڈلا زینی نہ ہو۔ دونوں باپ بیٹا خاموش بیٹھے تھے۔ ایک دوسرے سے روٹھے ہوئے۔

"زین!...... زین! مجھے بتاؤ اس سب کی شروعات کب ہوئی اور کس نے کی؟"

سردار صاحب نے خاموشی کے اس قفل کو توڑا۔ انہوں نے راستہ بھر بیٹے سے ایک بات بھی نہ کی تھی۔ وہ چپ تھا۔ فقط اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا۔

"بتاؤ مجھے زین! کس نے تمہیں نشے کی عادت ڈالی؟...... کون ہے تمہاری اس حالت کا ذمہ دار؟" ایک اور سوال آیا۔

زین کے لبوں پہ وہی تالہ لگا تھا۔

"زین! مجھے جواب دو۔ اس طرح چپ بیٹھے رہنے سے کوئی حل نہیں نکلے گا۔ بتاؤ مجھے، کون ذمہ دار ہے؟...... زین! بتاؤ، کون ہے وہ؟

"آپ...... صرف آپ بابا!...... مجھے نفرت ہے آپ سے اور مہرو آپی سے۔ آپ لوگوں نے مجھے کچھ نہیں دیا۔ کبھی بھی کچھ نہیں دیا۔" زین اپنے حلق کی مکمل طاقت سے چیخا تھا۔ سردار صاحب حیرانی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ ان کا ننھا سا جگر گوشہ، جسے انہوں نے ہاتھ کے چھالے کی طرح پالا تھا، اس طرح بدتمیزی سے بول رہا تھا۔

"زین! تم اپنے بابا سے بات کر رہے ہو یا کسی ڈرائیور یا نوکر سے؟" وہ خود کو سنبھالتے ہوئے بولے۔

"مجھے یہاں نہیں رہنا۔ مجھے واپس ہاسٹل جانا ہے۔ میں وہ سگریٹ نہیں چھوڑ سکتا۔ مجھے لا دیں...... خدا کے لئے لا دیں۔ ورنہ میں مر جاؤں گا۔" زین بستر پہ بیٹھے بیٹھے لرزنے لگا۔ ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔

"سنبھالو خود کو بیٹا! سنبھالو۔ تم رہ سکتے ہو اس زہر کے بغیر۔ ہم تمہارا علاج کروائیں گے۔ تمہیں میری مدد کرنی پڑے گی۔" ایک بے بس باپ بیٹے کے سامنے ملتجی تھا۔

"مجھے نفرت ہے آپ سے۔ آئی ہیٹ یو...... آئی ہیٹ یو...... آئی ہیٹ یو۔"

وہ اسی طرح تڑپتا، لرزتا ہاتھ پاؤں مارتا رہا۔

سردار صاحب خاموشی سے اس کے کمرے سے نکل آئے اور کمرہ باہر سے بند کر دیا۔ ان کی آنکھوں میں شدید غم، تکلیف اور جلن سی تھی۔

آج وہ کتنے تنہا تھے۔ ان کی اپنی اولاد بھی اپنی نہ تھی۔ وہ بھی نفرت کے نعرے بلند کر رہی تھی۔ قسمت کی کیسی ستم ظریفی تھی۔ وہ آج زیب، وارث اور مہرو کو شدت سے یاد کر رہے تھے۔ تنہا اور تہی داماں تھے۔



شفق کی راکھ میں جل بجھ گیا ستارۂ شام
شب فراق کے گیسو فضا میں لہرائے
کوئی پکارو کہ اِک عمر ہونے کو آئی
فلک کو قافلہ روز و شام ٹھہرائے
صبا نے پھر درِ زنداں پہ آ کے دستک دی
سحر قریب ہے، دل سے کہو نہ گھبرائے

"مجھے آپ سے یہ توقع نہیں تھی زیب آنٹی! کہ آپ اس قدر ڈر جائیں گی سردار واجد کی فقط ایک جھلک سے۔ آخر کو وہ کیا کر لیتے۔ اس وقت آپ کے لئے سب سے اہم ہونا چاہئے تھی آپ کی اپنی بیٹی مہر النساء، جس کی زندگی داؤ پر لگنے جا رہی تھی

اور جس کو بچا سکتی تھیں صرف آپ۔ لیکن آپ نے نجانے کیوں ہار مان لی۔ آپ تو عین نکاح کے وقت سب کے سامنے آ کر اعتراف کر سکتی تھیں کہ آپ زیب ہیں۔ سردار واجد کی بیوی اور مہر النساء کی ماں۔ لیکن نجانے آپ کیسی ماں ہیں۔"

شہرین اپنا غصہ مسلسل زیب پر نکالے جا رہی تھی۔ زیب غصے اور غم کی شدت سے پہلے ہی بھری بیٹھی تھیں، اس پر شہرین کی باتیں کسی بھڑکتے شعلے پر تیل کی طرح چھینٹے مار رہی تھیں۔

"کیسی ماں ہیں آپ؟...... کیسی ماں ہیں؟" ایک ہی جملے کی گردان سے زیب کی روح بھی لرز رہی تھی۔

"نہیں ہوں میں اچھی ماں...... نہیں بن سکتی میں اچھی ماں۔ میں لائق ہی نہیں ماں بننے کے۔ مجھے نفرت ہے ماں بننے سے۔" زیب کی آواز میں کرب کی سی کیفیت تھی۔ شہرین اور ثمین حیرانی سے اس کی جانب دیکھ رہی تھیں۔

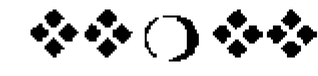
"وہ بھی میری ماں ہی تھی، جس نے میرا گھر اُجاڑ دیا۔ لوگوں سے سنا تھا کہ طوائفیں گھر اُجاڑ دیا کرتی ہیں۔ لیکن میری اپنی ماں نے ایک طوائف بن کے اپنی ہی بیٹی کا گھر اُجاڑ دیا۔ میں بھی تو اسی کا خون ہوں۔ میں اپنی بیٹی کے ساتھ کیسے انصاف کر سکتی تھی؟ مکافاتِ عمل بھی تو کوئی شے ہوتی ہے۔" زیب تڑپ کے بولیں۔

شہرین اور ثمین دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ماں نے شہرین کو جانے کا اشارہ کیا اور وہ خاموشی سے اٹھ کے کمرے سے چلی گئی اور ثمین، زیب کے پاس آئیں۔

"زیب باجی! میں وہ سب سننا چاہتی ہوں جو آپ کے دل میں ہے۔ تجسس اور حیرانی مجھے کسی پل چین نہیں لینے دیتے۔ خدارا مجھے اپنی بہن، اپنی رازدار سمجھ کے ہر وہ بات بتائیں جس سے ساری دنیا بے خبر ہے۔ پھولوں کا بسیرا تھا قصرِ زیب، کس طرح اس کی اینٹ سے اینٹ بکھری؟ میں جاننا چاہتی ہوں۔" ثمین نے اپنا ہاتھ زیب کے ہاتھ پہ رکھ دیا۔

قصرِ زیب کا پورا نقشہ زیب کی آنکھوں میں کھنچ گیا۔ وہ صحن، وہ دریچے، وہ تمام کمرے زیب کی آنکھوں کے سامنے آ گئے...... زیب موجودہ دنیا سے بہت دور

جانے لگیں۔



قصرِ زیب کی خوبصورت اور شاندار عمارت نومبر کی چمکیلی اور روشن دھوپ میں کسی سفید برف پوش وادی کی طرح چمک اور مسکرا رہی تھی۔ ہلکی ہلکی خنکی اور دھوئیں سے بھری دُھند سے باغ مکمل طور پر ڈھکا ہوا تھا۔ باغ سے ذرا سا دور اِک کینوپی شیڈ تھا جس کے نیچے سفید لوہے کی لان چیئرز اور میز رکھی تھی۔ انہی کرسیوں پہ واجد بیٹھے اخبار کا مطالعہ کر رہے تھے۔ تیئس چوبیس سالہ خوبصورت، گورا چٹا وارث، سردار صاحب کے سامنے بیٹھا کوئی فیکٹری میٹر ڈسکس کر رہا تھا۔

''یار خان! اتنے چھوٹے سے ہو کر تم اتنے موٹے موٹے حساب کیسے سلجھا لیتے ہو؟ ہمیں پتہ نہیں چلتا۔ ایسا کرو آج ہم فیکٹری آ جائیں تو حساب کتاب کا رجسٹر ہمارے آفس میں پہنچا دینا اور یونین لیڈر سے بھی کہنا کہ ہمیں آ کے ملے۔ ہمارے دستخط کے بنا کسی کی کوئی ڈیمانڈ پوری نہیں ہو سکتی۔'' سردار صاحب اخبار کو دیکھتے ہوئے بولے۔

''جی بہتر۔ میں آج ہی یہ کر دوں گا۔'' وارث مسکرایا۔

''ناشتہ کیا ہے خان؟''

''نہیں سردار صاحب! بس ابھی کر لوں گا۔''

اندر گھر سے زیب، مہرو اور زین کے ساتھ باہر آئی۔ مہرو اسکول یونیفارم پہنے تیار کھڑی تھی اور ننھا سا گپلو گپلو زین سفید سویٹر اور لال ٹوپی میں اشتہاروں والا بچہ محسوس ہو رہا تھا۔

''ہمارے ساتھ ہی ناشتہ کرنا وارث! طیبہ ناشتہ لگا رہی ہے۔'' زیب نے ہمیشہ کی طرح بہت پیار سے کہا۔

''جی بہتر۔'' وارث فرمانبرداری سے بولا۔

''اچھا بابا جان! میں اسکول جا رہی ہوں۔'' مہرو نے کہا۔

''بیٹا! ڈرائیور آ گیا ہے؟'' سردار صاحب نے بیٹی کی طرف پیار سے دیکھا۔

''آ تو گیا ہے۔ لیکن وارث! اگر تم اسے ڈراپ کر آتے تو مجھے فکر نہ ہوتی۔ اصل

میں ڈرائیور نیا ہے اور اس کا سکول ہے بھی کافی دور۔'' زیب نے تشویش ظاہر کی۔

''میں چھوڑ آتا ہوں مہرو بی بی کو۔ آپ فکر نہ کریں۔'' وارث کسی روبوٹ ہی کی طرح کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا، گھڑی دیکھی اور آگے آگے چلنے لگا۔

''او کے امی! بابا! خدا حافظ۔'' مہرو بھی وارث کے پیچھے پیچھے چلی گئی۔

''کمال کا شخص ہے........کوئی مسئلہ، کوئی پریشانی ہو، وارث کا نام باعثِ اطمینان ہوتا ہے۔'' زیب اسی کرسی پہ بیٹھ گئیں جہاں پہلے وارث بیٹھا تھا۔

''ہاں.......خان واقعی بہت قابل بھروسہ آدمی ہے۔ اپنے والد سے زیادہ کمٹڈ اور وفادار ہے۔'' سردار صاحب مسکرائے۔

''مجھے تو اپنے گھر کی ماسٹر کی لگتا ہے۔'' زیب، زین کی ٹوپی ٹھیک کرتے ہوئے بولیں۔ سردار صاحب نے اخبار تہہ کر کے رکھا اور ہاتھ بڑھا کے زین کو لے لیا۔

''میرا پیارا بیٹا۔ بابا کی جان۔'' وہ زین کو پکارنے اور پیار کرنے لگے۔ زیب مسکرا کے انہیں دیکھنے لگیں۔ انہیں یہی موقع موزوں لگا اپنے دل کی بات کہنے کو۔

لاہور سے بانو بی کی چٹھی آئی تھی۔ جہاں آراء کی آپریشن سے بیٹی پیدا ہوئی تھی اور پیدا ہوتے ہی فوت ہو گئی تھی۔ جان سے زیادہ عزیز زیب کی بہن بہت اُداس اور غمزدہ تھی۔ بیماری نے اسے اور بھی مجبور کر دیا تھا۔ آخری بار وہ چھ سال پہلے جہاں آراء سے ملی تھی۔ بہن اور ماں کی محبت اس کے اندر غل مچا رہی تھی۔ لیکن وہ جانتی تھی، سردار صاحب اسے جانے نہیں دیں گے۔ وہ اپنے اصولوں کے بہت پکے تھے۔ چھ سال قبل بھی وہ چھپ کے ان سے ملنے گئی تھی۔ سردار صاحب نہیں چاہتے تھے کہ زیب اپنے ماضی سے کوئی تعلق رکھے۔ ٹی وی پہ کام کرنے کی اسے اجازت تھی مگر بچوں کے بعد زیب نے اپنی دنیا فقط قصرِ زیب ہی بنا لی تھی۔

لیکن اکثر وہ جہاں آراء کے لئے اُداس ہو جاتی تھی۔ ایک ہی بہن تھی۔ دوستوں سے بھی زیادہ قریب۔ لاکھ کٹنے کے باوجود بھی ہمیشہ اس کا تعلق بہن سے رہا تھا۔ گو کہ وہ ہمیشہ نفرت کرتی آئی تھی اس پیشے سے، جس سے اس کی ماں اور بہن وابستہ تھیں لیکن خون کے رشتے چاہ کے بھی نہ کٹ سکتے ہیں اور نہ فراموش ہو سکتے ہیں۔

''سردار صاحب! میں........ میں لاہور جانا چاہتی ہوں۔'' بڑی مشکل سے زیب

نے دل کی بات کہی تھی۔ سردار صاحب کے چہرے پہ اک عکس سالہرایا۔

''خیریت؟........کوئی خاص وجہ؟'' وہ بولے۔

''وہ........دراصل........ایک فنکشن ہے وہاں........اور ایک شو کی ریکارڈنگ بھی ہے۔ مجھے........مجھے انوائٹ کیا ہے انہوں نے۔'' وہ چاہ کے بھی سچ نہ بول پائی۔ محبوب شوہر کی ناراضگی سے خوف کھاتی تھی۔

''اگر آپ حامی بھر چکی ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن بچوں کا کیا ہوگا؟'' وہ بولے۔

''مہرو تو یہیں رہے گی۔ اس کا اسکول ہے۔ زینی کو میں اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔ بلکہ وارث بھی میرے ساتھ جائے گا۔ میں زینی کو اس کے پاس چھوڑ کے ریکارڈنگ وغیرہ پر چلی جاؤں گی۔'' زیب نے فٹافٹ پلاننگ کر لی۔

''ٹھیک ہے، جائیے۔ لیکن جلدی آ جائیے گا۔'' سردار صاحب نے محبت بھری نظروں سے بیوی کو دیکھا۔ زیب کے دل میں جانے کی خوشی تو تھی لیکن ساتھ ایک دکھ بھی تھا کہ سردار صاحب کو جانے کی اصل وجہ بتا نہیں پائی۔ لیکن ہر گرہستن کی طرح زیب بھی پُراعتماد تھی کہ اس کی یہ چھوٹی سی چوری چھپ جائے گی۔

حالانکہ چھوٹے چھوٹے چھید ہی بڑے سوراخ تشکیل دیتے ہیں۔ اعتماد کی فضا میں ننھا سا چھید اس دیوار کو کرچی کرچی کر سکتا ہے۔

سو اگلے دن زیب، وارث اور ننھے زین کے ہمراہ لاہور کے لئے نکل پڑی۔ اسے پتہ نہیں تھا کہ اس کا یہ قدم قصرِ زیب سے اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دور لے جائے گا اور یہ چند ساعتیں اس کی اپنے گھر میں آخری ساعتیں ہوں گی۔

اور اگلے ہی دن وہ وارث کے ہمراہ جہاز کے ذریعے لاہور پہنچ گئی۔ لاہور آتے ہی اس نے جہاں آراء سے رابطہ کیا اور اسے اپنے گھر آنے کا کہا۔ جہاں آراء نے معذرت کر لی کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور وہ چلنے پھرنے سے قاصر تھی۔ لہٰذا فوراً ہی زیب نے اس کے پاس جانے کی تیاری کر لی۔ زین کے فیڈر وغیرہ تیار کئے۔ وہ زین کو وہاں لے کر جانا نہیں چاہتی تھی اس لئے اسے اٹھا کر وارث کے پاس آ گئی۔

''وارث اگر تم مصروف نہ ہو تو کچھ دیر زینی کو سنبھال لو گے؟''

''جی، کیوں نہیں۔ یوں بھی مجھے یہاں کوئی خاص کام تو نہیں۔ یوں بھی چھوٹے سردار صاحب کو سنبھالنے میں ہمیں بہت مزہ آتا ہے۔'' سبز رنگ کی رومپر اور ٹوپی میں لپٹے زین کو وارث نے اپنی بانہوں میں بھر لیا اور اسے پیار کرنے لگا۔

''میں کہیں جا رہی ہوں، دو گھنٹے تک واپس آ جاؤں گی۔ اس کو میں نے پیک بھی کر دیا ہے اور اس کا فیڈر بھی بنا دیا ہے۔ ٹھیک ہے؟''

''جی بہتر۔ اگر آپ کہیں تو میں آپ کو چھوڑ آؤں؟''

''نہیں، میں ڈرائیور کے ساتھ چلی جاؤں گی۔ تم بس زین کا خیال رکھنا۔ اسے سردی سے بچانا۔ ٹھنڈ بھی ہے اور بارش کا موسم بھی بنا ہوا ہے۔ لاہور میں بارش ہوتی ہے تو بہت زور کی ہوتی ہے۔'' زیب اپنی ساڑھی کا پچھلا پلو آگے سرکاتے ہوئے بولی۔

''بارش میں خیال آپ بھی کیجئے گا۔ راستے بند ہو جاتے ہیں۔'' وارث نے فکرمندی سے کہا۔

''میرے راستے کبھی بند نہیں ہو سکتے۔'' پُراعتماد مسکراہٹ کے ساتھ کہتی ہوئی زیب صدر دروازے کی طرف بڑھی۔ وہ ہمیشہ کی طرح پُراعتماد اور خوبصورت لگ رہی تھی۔ کسی کی محبت اور اعتبار نے اسے انوکھا رنگ بخشا تھا۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ وجیہہ، بااعتماد اور بھرپور عورت نظر آتی تھی۔

گاڑی اس نے ایریے سے کافی دور رُکوائی اور باقی سفر پیدل طے کرتی انہی گلیوں میں آئی، جہاں سے کبھی فرار ہو کے اس نے اپنی ایک دنیا، ایک الگ شناخت بنائی تھی۔ جتنا راستہ اس نے پیدل طے کیا، خیالات کے جالے اس کے ذہن میں بنتے رہے، بگڑتے رہے۔ بچپن کے قصے، جوانی کی تلخ یادیں، ماں کی زیادتیاں، اس کا ناروا سلوک، اس کی بے جا باتیں دل کو چیرتی رہیں۔ اسی طرح کا سلوک بانو نے جہاں آراء کے ساتھ بھی رکھا تھا لیکن وہ زیب کی طرح نڈر، بے باک اور باغی نہ ہو سکی۔ وہ ڈری ڈری، سہمی سہمی حکم کے آگے سر جھکانے والی مخلوق بن گئی۔

''ہاں........وہ........جی بہتر........حکم۔'' جیسے الفاظ ہمہ وقت اس کے منہ سے بانو بی کے لئے نکلتے تھے۔ فقط سولہ سال ہی کی عمر سے بانو بی نے اس سے دھندا

شروع کروا دیا۔ وہ نہ تو احتجاج کر سکی اور نہ بغاوت۔ لیکن زیب احتجاجی طور پر وہاں سے فرار ہو گئی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی اگر وہ وہاں رہتی تو اسے بھی مجبور کیا جاتا اسی کام کے لئے۔ لہٰذا وہاں سے فرار ہونے میں ہی اس نے عافیت جانی۔ بانو بی کا دل انتقام سے بھرا ہوا تھا۔ شروع میں تو انہوں نے بہت ڈھونڈا اسے۔ لیکن جب انہیں پتہ چلا کہ اس نے فلموں میں کام شروع کیا ہے تو وہ مطمئن ہو گئیں۔ جانتی تھیں کہ راستہ وہی ہے، فقط نام الگ ہیں۔ فلمیں کبھی نہ کبھی زیب کو اس دلدل میں گرا دیں گی جہاں سے وہ بھاگی ہے۔ مگر زیب کو یہ ہرگز منظور نہیں تھا۔ اس نے نہایت آسانی سے اپنا با عزت مقام بنایا اور ایک اچھے اور نیک انسان سے شادی کر کے اس کی ہو رہی۔ ایک بار وہ مہرو کو لے کر ان سب سے ملنے گئی تھی۔ لیکن اس ملاقات میں بانو فقط یہی رونا روتی رہیں کہ اس نے غلط آدمی سے شادی کی۔ فلمیں چھوڑ کے اس نے ایک اور غلط فیصلہ کیا۔ سردار صاحب کو بھی زیب کا وہاں جانا پسند نہیں تھا لہٰذا وہ وہاں جانے سے گریز کرتی رہی۔ لیکن جہاں آراء کے ساتھ پیش آیا یہ حادثہ اسے دوبارہ وہاں لے آیا تھا۔ وہ اپنی معصوم اور مظلوم بہن کے لئے دُکھی بھی تھی۔ اسے اس سے ہمدردی بھی تھی۔ لہٰذا وہ اسی سے ملنے کی غرض سے ایک بار پھر ان گلی کوچوں میں لوٹی تھی۔



''اولاد کا دکھ کتنا گہرا اور جان لیوا ہوتا ہے، اس کا اندازہ ایک ماں ہی لگا سکتی ہے جہاں آراء! میں ایک ماں ہوں۔ میں تمہارا دکھ سمجھ سکتی ہوں۔ مہرو اور زینی کی میری زندگی میں کیا جگہ ہے، یہ مجھے پتہ ہے۔'' جہاں آراء کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھامے زیب نے کہا۔

''مجھے اس کی موت پہ کوئی دکھ نہیں ہوا زیبو!....... میں کیسی ماں ہوں نا۔ مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ بلکہ مجھے خوشی ہوئی کہ وہ مر گئی۔ اگر وہ مرتی نہیں تو اسے بھی وہی زندگی گزارنی پڑتی جیسی اس کی ماں گزار رہی ہے۔ ساری عمر اپنی قیمت لگواتی رہتی بے چاری۔ اور پھر کون سا وہ کسی عزت دار باپ کی بیٹی تھی جو اسے پناہ دیتا۔ اچھا ہی ہوا وہ مر گئی۔ بس مجھے تنہا چھوڑ گئی، یہ غلط ہوا۔ کاش میں بھی اس کے ساتھ ہی مر جاتی۔'' جہاں آراء کا لہجہ نہایت ڈوبا ڈوبا اور پژمردہ تھا۔

''نکل کیوں نہیں آتی ہو اس دلدل سے؟ چھوڑ کیوں نہیں دیتی ہو یہ بدنام زندگی؟ ہر روز اپنے جسم کے ساتھ اپنی روح کا سودا کرنا منظور ہے تمہیں۔ کیا ہے اس زندگی میں جو تم نہیں چھوڑ سکتیں اسے؟'' زیب سے اپنی بہن کی تڑپ دیکھی نہ جاتی تھی۔

''لکڑہارے کا بیٹا بھی تو لکڑیاں ہی کاٹتا ہے۔ کافر اپنی اولاد کو کہاں مومن ہونے دیتا ہے؟ تمہارا کیا خیال ہے، بانو بی مجھے زندہ چھوڑیں گی اگر میں یہاں سے چلی گئی تو؟ اُن کا پیٹ پال رہی ہوں۔ سب سے زیادہ قیمت لگتی ہے میری۔ بانو بی اب تک تمہیں نہیں معاف کر پائیں تو مجھے کیا کریں گی؟'' جہاں آراء اُداسی سے بولی۔

''مجھے ان کی معافی کی کوئی پرواہ نہیں۔ میں اپنی زندگی سے بہت خوش ہوں۔ میرا شوہر مجھے بہت پیار کرتا ہے۔ میرے دو بہت ہی پیارے بچے ہیں۔ معاشرے میں، میں عزت سے چلتی پھرتی ہوں۔ مجھے بانو بی جیسی خودغرض ماں کی معافی کی کوئی

ضرورت نہیں۔ میں نے گناہ سے خود کو بچا کے کوئی گناہ نہیں کیا۔ بس اپنا آپ کیچڑ میں لتھیڑنا مجھے منظور نہ تھا۔'' زیب نہایت اطمینان سے بولی۔

''ہر کسی کا نصیب تمہاری طرح تو نہیں ہوتا نا زیبو! عزت اور ذلت اپنے ہاتھ میں کہاں ہوتی ہے؟ میں یہاں سے نہیں نکل سکتی۔'' جہاں آراء نے چہرہ دوسری جانب کرلیا۔

''مایوسی کفر ہوتی ہے جہاں آراء!...... میں تمہیں نکالوں گی اس جہنم سے۔ مجھے اسی دن تمہیں اپنے ساتھ لے کے نکل جانا چاہئے تھا۔ لیکن دیر اب بھی نہیں ہوئی۔ میں خود کسی باعزت، شریف گھرانے میں تمہاری شادی کرواؤں گی۔ تمہاری زندگی بناؤں گی۔'' زیب نے مسکرا کے اسے یقین دلایا۔

''کیا یہ ممکن ہے زیبو؟'' جہاں آراء کی آنکھوں میں ہلکی سی اُمید کی چمک تھی۔

''ممکن نہیں تو بھی ہم اسے ممکن بنائیں گے۔ تم چلو میرے ساتھ، ابھی اور اسی وقت۔'' زیب نے اس کا ہاتھ تھام کے اسے اٹھایا۔

''کیا کہہ رہی ہو زیبو؟...... بانو بی بازار تک گئی ہیں۔ آجائیں گی۔ اور اگر انہیں پتہ چل گیا تو مار ڈالیں گی وہ ہم دونوں کو۔ ان کے رابطوں کا پتہ نہیں ہے تمہیں۔'' جہاں آراء خوفزدہ ہوگئی۔

''میرے شوہر کے روابط کا بھی تمہیں پتہ نہیں۔ کھڑے کھڑے جیل کروا دیں گے بانو بی کو۔ اڈا بند کروا دیں گے۔'' زیب نے اسے چادر اوڑھائی اور اسے ساتھ لے کر کمرے کا دروازہ عبور کر گئی۔

وہ پُر اعتماد تھی کہ بانو بی کی آمد سے پہلے پہلے ہی وہ جہاں آراء کو لے کر اس علاقے سے باہر نکل جائے گی اور کوئی ٹیکسی لے کر وہ اپنے گھر چلی جائے گی اور صبح جہاں آراء کے ہمراہ کراچی پرواز کر جائے گی۔ لیکن وہ بدقسمت اپنی اور اس کی قسمت سے بے خبر تھی۔ صدر دروازے تک پہنچی ہی تھی کہ بانو بی نے کمرے کی بتیاں روشن کر دیں۔ روشنی ہوتے ہی ہر چیز گویا سورج کی روشنی میں واضح ہوگئی تھی۔ وہ دونوں پکڑی گئی تھیں۔ بانو بی اپنا ایک ہاتھ دیوار پہ اور دوسرا اپنی کمر پہ رکھے ان کو کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ شعلوں سی تپش دیتی ان کی نگاہیں زیب پہ تھیں۔

''واہ ری بنو! واہ...... برسوں بیت گئے مگر مجھ سے دشمنی کرنے کا تمہارا شوق پورا نہیں ہوا۔ خود تو بھاگ گئی تھیں، اب اسے بھی لے جا رہی ہو۔'' بانو بی کے لہجے میں انتہا کی نفرت تھی۔

''آپ اسے زبردستی اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتیں بانو بی! یہ اس گندگی میں رہنا نہیں چاہتی۔ ایک باعزت زندگی بسر کرنا چاہتی ہے۔'' زیب نے نرمی سے کہا۔

''اچھا...... باعزت زندگی...... جیسی تُو بسر کر رہی ہے۔ جھاڑو ٹاکی لگانا، برتن دھونا، بچے پیدا کرنا، روٹیاں بیلنا، شوہر کی چخ چخ سننا، یہ تمہارے نزدیک عزت ہے؟ سارا سارا دن شوہر کے جوتے کھا کے اس کو رات کو اپنا آپ پیش کر دینا یہ عزت ہے؟ اری بدبختو! جس کو تم لوگ گندگی کہہ رہی ہو اسی گندگی کی پیدائش ہو تم لوگ۔ اسی گٹر نے جنم دیا ہے تم لوگوں کو۔'' بانو بی کا غصہ ان کے لفظوں سے اُبل رہا تھا۔

''میں آپ کو یہ ظلم کرنے کی اجازت نہیں دوں گی۔ آپ ایک بالغ لڑکی سے زبردستی اس کی مرضی کے خلاف پیشہ نہیں کروا سکتیں۔'' زیب کے لہجے میں بھی غصہ آگیا۔

''اری او شریفوں کے محلوں میں رہنے والی! آواز نیچے کر کے بات کرو ہم سے۔ جس بلوغت پہ تم اکڑ رہی ہو، یہ بھی تمہیں ہم نے دی ہے۔ جو تمہاری شریانوں میں اُبل رہا ہے، اس لہو کو اپنی کوکھ میں سینچنے والے ہم ہیں۔'' بانو بی اپنے سینے پہ ہاتھ مارتے ہوئے بولیں۔

''اس احسان کا بدلہ اور کس کس طرح سے لیں گی ہم سے بانو بی؟...... اپنی ہی اولاد کو کب تک مردار بنا کے بھوکے گِدھوں کے آگے پھینکیں گی؟...... آخر کب تک؟'' زیب چیخی۔

''لگام دے اپنی زبان کو۔ مت بھول کہ بالی کے آگے بول رہی ہے تُو۔'' بانو بی کی آنکھیں شعلے اُبل رہی تھیں۔

''تم چلی جاؤ زیب! تمہارا بچہ گھر پہ اکیلا ہے۔ میں کہیں نہیں جاؤں گی۔'' جہاں آراء نے اپنا ہاتھ چھڑایا۔

''چاہے آج دنیا یہاں سے وہاں ہو جائے، میں تمہیں ساتھ لئے بغیر نہیں جاؤں گی۔'' زیب نے ضد کی۔

"بانو بیگم! میرے راستے میں دیوار کھڑی کرنے کی کوشش مت کرو۔ میرے شوہر کا منسٹری میں ایک فون کافی ہوگا برسوں سے پھیلے تمہارے دھندے کو ختم کرنے کے لئے۔" زیب نے اسے دھمکی دی۔ آوازوں کے شور سے اندر سوئی مخلوق باہر آ گئی تھی۔ طرح طرح کی لڑکیاں، عورتیں تماشائی بنی ہوئی تھیں۔

"دھمکی دیتی ہے مجھے؟........ دھونس جماتی ہے اپنے شوہر کی؟........ ارے ایسے ہزاروں لاکھوں شوہر اور منسٹر میرے کوٹھے پہ بے سدھ پڑے ہوتے ہیں رات گئے۔ اب تو مسئلہ میری انا کا بن گیا ہے۔ دیکھتی ہوں آج اس دروازے سے کون نکلتا ہے۔ بانکے!........ ارے او بانکے!"

جہاں آراء سہم کے ستون سے لگ گئی تھی۔ بانو بی کے بلانے پر ایک وحشی سا شخص باہر آیا۔ چوڑا چکلا جسم، سانولی رنگت۔ وہ حکم کے غلام کی طرح سامنے آ گیا۔

"پکڑ کے لے جا اس شوہر والی کو اور بند کر دے تہہ خانے میں۔ برسوں کے حساب چکتا کرنے ہیں اس حرام زادی سے۔"

بانو بی کے کہنے کی دیر تھی کہ بانکا مع اپنے دو افراد کے زیب کو ہاتھوں سے گھسیٹتا لے جانے لگا۔

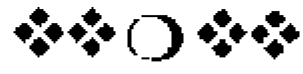
"چھوڑ دو مجھے........ جانے دو مجھے یہاں سے........ بانو بی! میں تمہاری بیٹی ہوں........ تمہارا ننھا نواسا گھر پہ اکیلا ہے........ بانو بی! مجھے جانے دو۔" وہ تڑپ رہی تھی۔ آنسو اُبل اُبل کے اس کے گالوں پہ بکھر رہے تھے۔ لیکن بانو بی کو اس پہ ترس نہیں آیا۔ بانکا اسے تہہ خانے کے اندر لے گیا اور اسے وہیں چھوڑ دیا گیا۔

"بانو بی! اسے جانے دیں۔ وہ مجھ سے ملنے آئی تھی۔ اسے مجھ پہ ترس آ گیا تھا۔ بانو بی! اسے معاف کر دیں۔ اس کا بیٹا زین بہت رو رہا ہوگا بانو بی! اور مہرو بھی تو کتنی چھوٹی سی ہے۔ بانو بی! اسے جانے دیں۔" جہاں آراء دونوں ہاتھ جوڑے آنسو بہا کے التجا کر رہی تھی۔

بانو بی نے اس کی لمبی چوڑی چوٹی کو اپنی مٹھی میں جکڑا اور نہایت سفاکی سے بولی۔

"فرار ہونا چاہتی ہے یہاں سے؟........ تیری بھی چمڑی ادھیڑ کے اس میں بھوسہ بھروا دوں گی۔ اور رہی بات اس کمینی کی تو اس کے حال پہ رحم نہ کر۔ دغا بازوں اور

مکاروں کا یہی حشر ہوتا ہے۔ تجھے یہیں مرنا ہے۔ یہی بدنامی کھا کے اور یہی بدنامی پی کے جینا ہے۔ بغاوت کا سوچا بھی تو جسم میں میخیں ٹھکوا دوں گی۔" بالی نے اس کی چوٹی کو اور زور سے کھینچا اور پھر چھوڑ دیا۔ وہ لڑکھڑا کے اسی ستون سے ٹکرائی جس سے وہ پہلے لگی کھڑی تھی۔ اس کے سر میں سنگِ مرمر کے ستون کی شدید چوٹ لگی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے بھی تواتر سے بہہ رہے تھے۔



وارث ننھے زین کو سنبھالتے سنبھالتے تھک گیا تھا۔ کچھ تو اسے بھی بچے سنبھالنے کا تجربہ نہ تھا اور کچھ زین کو بھی ماں کے بغیر رہنے کی عادت نہ تھی اس لئے وہ مسلسل روئے اور چیخے جا رہا تھا۔ دودھ بھی نہیں لے رہا تھا۔ بہت زیادہ رونے کے باعث اسے ہلکا بخار بھی شروع ہو گیا تھا۔

شہر میں موسلا دھار بارش بھی شروع ہو گئی تھی۔ اُس نے ڈرائیور سے دریافت کیا، لیکن ڈرائیور کی معلومات زیادہ نہیں تھی۔ کیونکہ زیب سڑک پہ اُتری تھی۔ آگے وہ کہاں گئی، کسی کو پتہ نہ تھا۔

گھبراہٹ میں وارث نے سردار صاحب کو فون ملایا۔ زین کے بلکنے کی آواز نیند سے جاگے واجد کو پریشان کر گئی تھی۔

"سردار صاحب! زیب بی بی ابھی تک واپس نہیں آئیں۔ صبح دس بجے گئی تھیں۔ یہ وقت ہو گیا ہے۔ بارش بھی بہت ہے۔ اور زین بابا ہم سے سنبھل بھی نہیں رہے۔" وارث ننھے زین کو سنبھالنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

"لیکن کہاں ہو سکتی ہیں زیب؟........ کیا کوئی ریکارڈنگ تھی ان کی؟ یا پھر کوئی رات دیر تک کا فنکشن؟" سردار صاحب کی نیند مکمل طور پر اُڑ گئی تھی۔

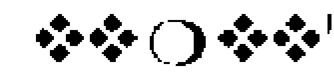
"ریکارڈنگ اور فنکشن نہیں تھا۔ وہ عام سے کپڑوں میں گئی تھیں۔ کسی کے گھر یا پھر شاید بازار۔ ڈرائیور نے انہیں سڑک پہ ڈراپ کیا تھا۔" وارث نے تمام معلومات فراہم کیں۔ "انہوں نے کہا کہ وہ دو گھنٹے میں آ جائیں گی لیکن یہ وقت ہونے کو آیا، ان کا کوئی پتہ نہیں۔ زین بابا کو بخار بھی ہو گیا ہے۔" وارث کا سچ میں رونے کو دل چاہ رہا تھا۔

"تم اسے کوئی دوائی دو خان! میں پہلی فلائٹ پکڑ کے لاہور پہنچتا ہوں۔" سردار صاحب نے چند اور ہدایات دے کر فون بند کر دیا۔

وارث زینی کو اندر کمرے میں لے آیا۔ سائیڈ ٹیبل پہ سیرپ اور چھاتی پہ ملنے والا بام پڑا تھا۔ اس نے زین کو دوائی پلائی اور اس کی چھاتی پہ بام مل کے اسے اس کے جھولے میں سلایا۔ فیڈر اس کے ہونٹوں سے لگایا اور جھولا جھولانے لگا۔ کمسن بچہ پالنے کی نرم وگداز بستر کو ماں کی گود سمجھ کے ہولے ہولے آنکھیں بند کرنے لگا۔

کمرے کی کھڑکی سے آسمانی بجلی چمکتی دکھائی دی۔ بارش کی آواز کڑک دار تھی۔ وارث کے ذہن میں زیب کے جملے گونجے۔

"بارش میرا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتی۔"



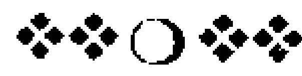
تہہ خانے کی اکلوتی کھڑکی سے بادلوں کے گرجنے کی آواز سنائی دی۔ رو دھو کے نڈھال ہوئی زیب کے کانوں میں زین کے رونے کی آواز آئی۔ سینے میں اک زور کی ٹیس اُٹھی اور اُٹھ کے لوہے کے سفاک دروازے تک آئی اور ہاتھوں کی پوری طاقت سے اسے کھٹکھٹانے لگی۔

"کھولو........ خدا کے لئے کھول دو........ مجھے جانے دو........ میرا بیٹا بہت چھوٹا ہے........ وہ میرے دودھ کے لئے بلک رہا ہو گا........ اسے میری گود کے بغیر سونے کی عادت نہیں........ کھولو!" وہ حلق کی پوری طاقت سے چیخ رہی تھی۔

"بانو بی!........ جہاں آراء!........ بانکے!........ کوئی دروازہ کھولو۔ بانکے! میں تمہیں بہت پیسے دوں گی۔ جو مانگو گے، دوں گی۔ مجھے میرے گھر جانے دو........ میرے بچوں کے پاس جانے دو۔ میرا زین، میری مہر النساء........ واجد! مجھے اس جہنم سے نکالو۔ میرا کوئی گناہ نہیں۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔" وہ دونوں ہاتھوں کے مکے بنا بنا کے لوہے کے بوسیدہ دروازے کو کھٹکھٹا رہی تھی۔ مگر اس کی آواز ظالم دیوار سے ٹکرا کے پاش پاش ہوتی اس تک واپس پلٹ رہی تھی۔

باہر بیٹھا بانکا اس کی آوازوں پہ ہنس رہا تھا۔ وہ مسلسل چرس سے بھری سگریٹ پی رہا تھا اور مسکرا رہا تھا۔

وہ اس طرح کی کئی اور آوازوں کا عادی تھا۔ یہ تہہ خانہ ہمیشہ ان لڑکیوں کے لئے عارضی زنداں بنتا تھا جو نئی نئی اس بازار میں لائی جاتی تھیں اور دھندا کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتی تھیں۔ یہ خوفناک کال کوٹھڑی اور چند دن کی بھوک پیاس انہیں مجبور کر دیتی اور وہ معصوم لڑکیاں با آسانی اس دلدل میں گر جاتی تھیں۔ یا پھر اسی قید خانے میں بانو بی ان لڑکیوں پہ اپنے کارندے چھوڑ دیتی تھیں جو لمحوں کے اندر ان کے اندر سے انا ختم کرتے اور ان کی روح کو کچل دیتے تھے۔ پھر ان میں سے جینے کی ہر آرزو ختم ہو جاتی اور وہ ہر طرح کا کام کرنے کو راضی ہو جاتی تھیں۔ یہ تہہ خانہ صرف ایک بند کال کوٹھڑی ہی نہ تھی بلکہ ہزاروں لاکھوں خواہشوں کی اجتماعی قبر تھی اور آج اس قبر میں اس عورت کو زندہ دفنایا گیا تھا جو اپنے آپ پہ ناز کرتی تھی۔ بہت پُر اعتماد، بہت خوش ہوتی تھی اپنی اس دولت سے جو اسے خدا نے گھر اور بچوں کی صورت عنایت کی تھی۔ وہ تو جانتی ہی نہ تھی یہ دولت پل بھر میں اس سے چھین لی جائے گی اور چھیننے والی وہی ہو گی جس نے کئی سال پہلے اسے زندگی دی تھی۔



سردار صاحب نے لاہور پہنچ کر اسے ڈھونڈنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ پولیس میں بھی رپورٹ کروائی اور ہر طرح کے ذرائع سے اسے ڈھونڈا جا رہا تھا۔ اچانک یونہی بیٹھے بیٹھے سردار صاحب کے دل میں اقبال بانو کا خیال آیا۔ وہ سڑک جہاں پہ ڈرائیور نے زیب کو اُتارا تھا، وہ اسی علاقے سے قریب تر تھی۔ لہٰذا سردار صاحب اگلے ہی پل خود گاڑی لے کر اس بازار کی طرف نکل گئے اور کچھ ہی دیر میں وہ اقبال بانو کے سامنے کھڑے تھے۔

"آئیے!........ آئیے!........ زہے نصیب۔ ہمارے زینوں کی یہ خوش قسمتی کہ ان پہ آپ چڑھ کر آئے ہیں۔" اقبال بانو بڑے اطمینان سے اسی طرح پان کترتے ہوئے بولی تھیں۔

"میں زیب کا پتہ کرنے آیا ہوں۔ دو دن سے وہ غائب ہے۔ شاید آپ سے ملنے آئی تھی وہ یہاں۔" سردار صاحب نرمی سے بولے۔

"زیب........ ہاں، وہ یہیں ہے۔ لیکن وہ ہم سے فقط ملنے نہیں آئی تھی بلکہ تمہیں

ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ آئی ہے۔ نہ صرف تمہیں بلکہ اپنے بچوں کو بھی۔'' بانو بی کے اطمینان میں ذرا کمی نہ آئی۔

''کیا؟........ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟........ زیب بھلا ایسا کیوں کریں گی؟'' وہ حیران ہوئے۔

''اسے تمہاری گھٹن زدہ زندگی سے نفرت ہوگئی تھی۔ چھوڑ آئی۔ اور یہ جگہ تو یوں بھی اس کا اصل ہے۔ کوئی پودا اپنی زمین سے نکل کر کس طرح پنپ سکتا ہے؟''

''کیا مطلب ہے اس سے آپ کا؟ وہ بیوی ہے میری۔ میرے بچوں کی ماں ہے۔'' سردار صاحب حیرت کی تصویر بنے کھڑے تھے۔

''اس نے یہاں پہ دوبارہ سے دھندہ شروع کر دیا ہے۔'' اقبال بانو کا جملہ ہتھوڑا بن کے واجد کے سر پہ لگا۔

''زبان سنبھال کے بات کریں آپ۔ زیب کے بارے میں، میں ایسی کوئی بات نہیں سن سکتا۔ وہ میری عزت ہے۔'' سردار صاحب سیخ پا ہوگئے۔

''طوائف کی بیٹی دھندا نہیں کرے گی تو کیا مونگ پھلیاں بیچے گی؟'' بالی نہایت طنز سے بولی۔

''میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ ابھی اور اسی وقت۔'' وہ خود کو سنبھالتے ہوئے بولے۔

''سو رہی ہے۔ رات بھر کی محنت نے تھکا دیا ہے اسے۔ ملنا ہو تو رات کو آ جانا۔ محفل سجے گی اس کے نام پہ۔'' بالی نے مکاری سے کہا۔

واجد کے تن بدن میں آگ لگ رہی تھی۔ ان کا دل چاہ رہا تھا کہ کھڑے کھڑے اس عورت کو شوٹ کر دیں۔

''مجھے آپ کی کسی بات پہ یقین نہیں ہے۔ میں جب تک زیب سے خود بات نہ کر لوں، میں یقین نہیں کروں گا۔'' سردار صاحب گویا ضد پہ اڑے تھے۔

''کس بات کا ثبوت چاہئے تمہیں؟........ دھندہ کرتے ہوئے دیکھنا چاہتے ہو یا مجرا کرتے ہوئے؟'' بالی کی بات سردار کو تپا گئی۔ وہ آگ میں گویا جھلسنے لگے۔

''ابھی تو جا رہا ہوں میں۔ لیکن بہت جلد واپس آؤں گا، پولیس کو لے کے۔ میں

جانتا ہوں زیب نے اس طرح کا کوئی کام نہ پہلے کبھی کیا ہے اور نہ اب کرے گی۔ یہ آپ کی کوئی چال ہے، اور کچھ نہیں۔'' غصے سے کہتے ہوئے سردار صاحب اس منحوس جگہ سے نکل آئے تھے۔

بالی کے پان چباتے ہوئے سرخ ہونٹوں پہ تفاخر کی مسکراہٹ تھی۔ دائیں طرف بنے ہوئے کمرے سے کسی لڑکی کے چیخنے کی آواز آ رہی تھی۔ بانکا، بالی کی طرف آیا۔

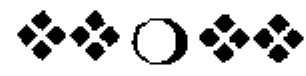
''کون تھا بانو بی؟''

''وہی شریف زادہ........ سردار واجد........ اپنی بیوی کے پیچھے آیا تھا دُم ہلاتا ہوا۔ دھمکی دے کر گیا ہے۔ اسے چھوڑ، تُو یہ بتا، یہ نئی بلبل کدھر سے پکڑ لایا ہے؟ ہفتہ گزر گیا ہے مگر اس کی چیخیں بند نہیں ہو رہیں۔'' بالی نے بانکے کی توجہ بدلی۔

''یہ بھی کوئی شریف زادی ہے۔ کہتی ہے جان دے دوں گی مگر یہ کام نہیں کروں گی۔'' بانکے نے نفرت سے گردن جھٹک کے کہا۔

''تُو اسے ڈرا، دھمکا، مار پیٹ، بھوکا چھوڑ دے، اپنے بندے چھوڑ دے اس پہ۔ سارے طریقے تو تجھے آتے ہیں۔ کتنوں کو مجبور کر چکا ہے، اسے بھی کر لے۔'' بالی نے اس کے ہاتھ سے جلتی سگریٹ چھین لی اور خود پینے لگی۔

''تم فکر نہ کرو۔ پھڑپھڑاتی چڑیا کو قید کرنا بانکے کو آتا ہے۔ آج کا دن چیخنے دے اسے۔'' بانکے نے کمینگی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ بالی بھی مسکرا دی۔



اور اگلے ہی دن اُس لڑکی نے خود کو آگ لگا کے خودکشی کر لی۔ اس کے ہمراہ پورا کمرہ جل گیا تھا۔ صبح کو اس کمرے کی آگ کو بجھایا گیا اور اس لڑکی کی ناقابل شناخت لاش برآمد ہوئی۔ بالی کا ذہن اس وقت کسی مشین کی طرح کام کر رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں چالوں پہ چالیں بنا رہی تھی۔

سردار صاحب پولیس کے ہمراہ پہنچے تو وہاں منظر نامہ ہی اور تھا۔ بالی سر پہ سفید دوپٹہ اوڑھے سینہ کوبی میں مشغول تھی۔ اردگرد کئی لڑکیاں افسوس سے کھڑی تھیں۔ درمیان میں سفید چادر میں لپٹی ہوئی لاش رکھی گئی تھی۔

''ہائے میری کمسن........ جوانی میں خود کو آگ لگا دی........ میں کس سے تیری

موت کا بدلہ لوں؟........ کس نے تمہارے اندر سے جینے کی آرزو ختم کی؟........ کس نے تمہاری زندگی برباد کی؟'' وہ مسلسل رو رہی تھی۔

''یہ سب کیا ہے؟........کون ہے یہ؟'' سردار صاحب نے لاش کے متعلق پوچھا۔

''اس کے بارے میں پوچھ رہا ہے تُو؟........ ارے یہ بدبخت میری بیٹی ہے، جو تیری بیوی تھی۔ زیب........ میری زیبو۔ جلا کے مار ڈالا اس نے خود کو۔ جانتی تھی کہ تُو اسے چین سے رہنے نہیں دے گا۔ اسے یہاں سے زبردستی لے جائے گا۔ مار ڈالا اس نے خود کو۔ جلا ڈالا اپنے آپ کو۔'' بالی نہایت بہترین اداکاری سے انہیں قائل کر رہی تھی۔ واجد کی تو گویا شریانوں میں لہو منجمد ہو کے رہ گیا۔

عجیب طرح سے جھلسا ہوا مُردہ وجود ان کے سامنے تھا۔ کیا یہ واقعی زیب تھی؟ یقینی اور بے یقینی میں گھرے وہ کرب کے عالم میں کھڑے تھے۔ وہ اپنا وجود گھسیٹتے ہوئے لاش کے نزدیک آئے اور کفن کے اس حصے کو چھوا جہاں سیدھا ہاتھ تھا۔ اپنا ہاتھ ڈال کے لاش کا سیدھا ہاتھ باہر نکالا۔ جھلسے ہوئے ہاتھ کی ناقابل شناخت انگلیوں میں وہی انگوٹھی چمک رہی تھی جو سردار صاحب نے منہ دکھائی کے تحفے کے طور پر زیب کو دی تھی اور جسے زیب کبھی اپنے وجود سے الگ نہ کرتی تھی۔ ہاتھ کے ہمراہ ہی سبز رنگ کی ساڑھی کا سوختہ پلّو بھی باہر آ ڈھلکا تھا۔ وہ لرز گئے۔ آنکھ سے بے اختیار دو آنسو گرے۔

ان میں ذرا بھی ہمت نہ بچی تھی کہ وہ چادر ہٹا کے زیب کا چہرہ دیکھتے۔ شاید دیکھتے تو بھی شناخت نہ کر پاتے۔ وہ کرب سے اپنے ہونٹ بھینچے کھڑے تھے۔ یہ کیا ہو گیا تھا ان کے ساتھ؟........ زندگی نے کس طرح کا دھوکا کیا تھا ان کے ساتھ؟

انہوں نے زیب کی لاش اُٹھوائی اور قریبی قبرستان میں تدفین کے تمام فرائض اپنی آنکھوں کے سامنے انجام دیئے۔

دکھ بہت تھا لیکن نجانے کیوں انہیں یقین سا تھا کہ خودکشی کے اس اقدام کے لئے اسے مجبور کیا گیا ہوگا۔ وہ انا کی بہت پکی تھی۔ بہت ضدی تھی۔ اسے مرنا منظور تھا مگر جھکنا نہیں۔ وہ جھکتے درختوں کی طرح Flexible نہ تھی۔ اسے یقیناً بالی نے غلط کام کے لئے مجبور کیا ہوگا۔ ٹارچر کیا ہوگا۔ دھمکایا گیا ہوگا۔ تبھی زیب جیسی زندگی سے پیار کرنے والی عورت نے حرام موت کو اپنایا ہوگا۔ ورنہ تو اور کوئی جواز نہیں بنتا تھا۔

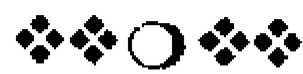
بالی کو پولیس نے گرفتار کر لیا۔ مگر اس پہ کچھ بھی الزام ثابت نہیں ہو سکا۔ وہ صاف بچ گئی۔ سردار صاحب بھی ٹوٹ گئے تھے۔ ان لوگوں سے اپنے بچوں کا کوئی رشتہ رکھنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ زیب کی دونوں نشانیوں کو اس شہر اور ان لوگوں کی پرچھائیں سے بھی دور رکھنا چاہتے تھے۔

زیب اس تہہ خانے کی قید میں نیم پاگل ہونے لگی۔ اسے بتایا گیا تھا کہ زیب پوری دنیا کے لئے مر چکی ہے۔ ٹی وی، اخباروں، ریڈیو پہ اس کی حادثاتی موت کی خبر آ چکی ہے اور اس کے محبوب شوہر کو بتایا گیا کہ وہ بے وفا تھی۔ اس نے وہ گھر اور بچے اپنی مرضی سے چھوڑے تھے اور خود دار زیب اس الزام، اس تہمت کے بعد ہمت ہی نہ رکھتی تھی کہ وہ کبھی سردار صاحب کا سامنا کرتی۔ کم از کم اس دنیا میں تو نہیں۔

دو سال تک وہ بالی کی اس خود ساختہ جیل میں اپنے ناکردہ گناہوں کی سزا بھگتتے بھگتتے مکمل طور پہ پاگل ہو گئی۔ کھانے پینے کا اسے ہوش نہ ہوتا تھا۔ اگر کوئی اس کے پاس آئے تو وہ اسے مارتی تھی، لہولہان کر دیتی تھی۔ نقصان پہنچاتی تھی۔ اور پھر دو سال بعد بالی سے چھپ کے جہاں آراء خود اسے وہاں سے نکالنے میں کامیاب ہو گئی اور حیدر آباد کے پاگل خانے میں پہنچا دیا۔

بالی یہی سمجھتی رہی کہ وہ فرار ہو گئی ہے، لیکن چونکہ وہ ذہنی طور پر ٹھیک نہیں تھی اس لئے وہ نجانے کہاں چلی گئی اور اس طرح سال گزرتے رہے۔

پریوں کی کہانی کی شہزادی بھیانک اور گمنام زندگی بسر کر رہی تھی۔



''زیب تو سب کے لئے مر گئی۔ مگر اپنے لئے نہیں مر سکی۔ علاج معالجے نے اس پاگل کو ایک بار پھر ہوش والوں کی دنیا میں لا پھینکا اور ہوش میں آنے کے بعد وہ اور ٹوٹتی رہی۔''

زیب کی آنکھوں سے بے شمار آنسو نکل کے اپنی کہانی آپ بیان کر رہے تھے۔ ثمین بھی پتھر کا بت بنی اس پری پیکر کی حیرت انگیز آپ بیتی سنتی رہی تھیں۔ شام سے رات ہو گئی تھی۔ وقت پَر لگا کے اُڑ گیا تھا۔

زیب نے بھی اتنے برسوں میں پہلی بار زبان کھولی تھی۔ پردے ہٹائے تھے۔

بہت ہلکا محسوس کر رہی تھیں۔

''میرا زین..... میرا چاند، میرا دودھ بھی مکمل نہ کر سکا۔ نجانے اب وہ کیسا ہو گا۔ کس کے جیسا لگتا ہو گا؟ اور میری مہرو..... دُلہن بن کے وہ بھی بہت پیاری لگی ہو گی۔ لیکن نجانے واجد نے کیوں اس کی شادی ادھر کر دی۔ اس نے بھی بڑی چوٹیں دی ہیں۔ دوست کے بہروپ میں دشمن ہے وہ سردار صاحب کا۔'' زیب آنسو رو کے کہہ رہی تھیں۔

''آپ کی کہانی بہت دردناک ہے زیب باجی!........ یقیناً جیسی ناانصافی آپ کے ساتھ ہوئی ہے، کسی کے ساتھ نہیں ہوتی۔ لیکن ہر ناانصافی کا کوئی نہ کوئی ازالہ ہوتا ہے۔ صبر کا پھل ضرور ملتا ہے۔ میری آپ سے التجا ہے زیب باجی! کہ اس گمنامی کو مزید طویل مت کریں۔ بتا دیں دنیا کو اپنی کہانی۔ اپنے دل کے تمام بھید آشکار کر لیں لوگوں کے اوپر۔ اور سردار صاحب کو بھی یہ سب کچھ بتا دیں۔ انہیں بتا دیں کہ ان کے ساتھ کتنا بڑا دھوکا ہوا ہے۔ ان کی بے خبری کا کیسے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ ان سے کس طرح چھینی گئی ہے ان کی حسین دنیا اور آپ کو کس کس اذیت سے گزرنا پڑا ہے۔'' ثمین نے اس کے ٹھنڈے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھا۔

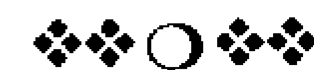
''ان کو بتا دینے سے وہ بیتے برس واپس تو نہیں آ جائیں گے نا۔ وہ داغ ڈھل تو نہیں جائیں گے نا؟'' زیب مایوسی سے بولیں۔

عزت اور ذلت دینے والی فقط اللہ پاک کی ذات ہے۔ ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ ابتداء تو کریں، گمنامی اور بے بسی کا یہ دُھواں خود بخود چھٹ جائے گا۔'' ثمین نے تسلی دی۔

''میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتی ہوں۔ بہت تھک گئی ہوں۔'' وہ سیاہ چادر میں خود کو سمیٹتے ہوئے بولیں۔

''آپ لیٹ جائیں۔ آرام کریں۔ میں جاتی ہوں۔'' ثمین نے اسے بستر پہ لٹا دیا اور کمرے کی بتی بجھا دی۔

شہرین باہر ماں کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کے کمرے میں پہنچ کر ثمین اسے بھی وہ تمام راز بتانے لگیں جو انہیں ابھی پتہ چلے تھے۔



یہ تم محبت نبھاتے ہو
تو اس محبت کا نام دکھ ہے
یہ وصل موسم جو اِک مسلسل مغالطہ ہے
تو اس رفاقت کا نام دُکھ ہے
مسافرانِ ابد کا ایسے فراق آثار راستوں پر
سفر تو خیر ایک المیہ ہے
قیام دکھ ہے
اور ایسی وحشت نما فضا میں
خموش رہنا بھی اک سزا ہے
مگر کسی سے کلام دکھ ہے
ہمیں خبر ہے
تمام دکھ ہے

فیروزی رنگ کے ریشم اور گوٹے کے کام والے لہنگے میں، غیر ملکی بیوٹیشن کے ہاتھ سے تیار ہو کے مہر النساء بہت خوبصورت، بہت مختلف لگ رہی تھی۔ مگر چہرے کے سجے سجائے رخ پہ روح کی اُداسی بھی واضح تھی۔ وہ کسی رسالے کے سرورق پہ سجی خوبصورت دوشیزہ کی طرح لگ رہی تھی جس کی آنکھ میں آنسو اٹکا ہو۔ جو اپنے حُسن سے آگاہ بھی ہو اور اس کی پامالی، اس کی بے وقعتی پر افسردہ بھی۔

وہ شیشے کے سامنے کرسی پہ بیٹھی ہاتھ میں پہنی کانچ کی چوڑیوں سے کھیل رہی تھی۔

سلمان واش روم میں تھا جہاں سے مسلسل شاور چلنے کی آواز آ رہی تھی۔

کمرے کا دروازہ کھول کے مہرو کی ساس اندر آ گئی تھی۔ سیاہ رنگ کی ساڑھی کے سلیولیس بلاؤز سے فرزانہ کے سفید اور قدرے فربہی مائل بازو جھلک رہے تھے۔ مہنگے نگوں والے زیورات اور امپورٹڈ جوتوں میں بھی وہ کوئی اشتہاری عمر رسیدہ عورت محسوس ہو رہی تھی۔

''گڈ....... ویری گڈ!........ بہت اچھا میک اپ کیا ہے سوشی نے۔ مجھے پتہ تھا پورے شہر میں اس سے زیادہ کوئی بیوٹیشن نہیں۔ یہ لوکل تھرڈ کلاس پارلر والیاں دُلہنوں کو

پیسٹری بنا دیتی ہیں، سو طرح کے رنگ لگا کے۔ دُلہن پہچانی ہی نہیں جاتی۔'' فرزانہ اس کا چہرہ اٹھا کے دیکھنے لگیں۔

''اور ڈریس بھی بہت اچھا ڈیزائن کیا ہے ڈیزائنر نے۔ ہے چھوٹا سا لڑکا لیکن بہت شارپ ہے۔ کیسے اچھے کٹس اور کلرز دیئے ہیں۔ اچھا مہرو! مانی تیار ہو جائے تو نیچے آ جانا۔ فوٹو گرافر ریڈی ہے۔ فوٹو سیشن کے بعد باہر آنا ہے تم لوگوں نے۔ او کے، میں جاتی ہوں۔ باہر بہت گیسٹ ہیں۔''

بہت فارمل، بہت بناوٹی لہجے میں کہتی ہوئی فرزانہ کسی روبوٹ کی طرح باہر چلی گئیں اور مہرو سوچتی رہ گئی۔ ان کی تعریف میں کہیں بھی مہرو نہیں تھی۔ بیوٹیشن اور ڈیزائنر کی محنت کے علاوہ خود مہرو بھی تھی اس روپ رنگ اور خوبصورتی کے اندر۔ حقیقت تو یہ تھی کہ مہرو کے چہرے کو کسی بیوٹیشن کے میک اپ کی اور اس کے جسم کو کسی ڈیزائنر کے جوڑے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ تو کھدر کے عام سے جوڑے میں بھی چاند کا ہی کوئی روپ لگتی تھی۔

اس کی نئی ماں نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کے اس کے لئے کوئی ستائشی جملہ نہیں کہا۔ نہ کوئی درازی عمر کی دعا دی اور نہ دودھوں نہانے، پوتوں پھلنے کا روایتی جملہ کہا۔ نہ آنکھ سے کاجل نکال کے اس کے ہونٹ پہ ٹیکا لگایا اور نہ بلائیں لیں۔ نہ اس کی پیشانی چومی اور نہ ہاتھوں میں ہاتھ تھام کر اسے اپنے نئے گھر میں ممتا اور محبت ملنے کی یقین دہانی کرائی۔

شاید ممتا اس کے نصیب میں تھی ہی نہیں۔ اس نے تاسف سے سوچا۔ کاجل، مسکارا اور لائنر لگی آنکھوں میں آنسوؤں کی ہلکی سی نمی چمکی جو اس نے فوراً اندر واپس کر لی۔

واش روم سے سلمان نکلا۔ اس نے بلیک کلر کی پینٹ پہن رکھی تھی۔ اوپر بنیان تھی اور نیلے رنگ کا ہاتھ سائز تولیہ جس سے وہ گیلے بال صاف کرتا باہر آیا۔ اس کے ہونٹوں سے بجتی سیٹی پہ کسی گانے کی دھن تھی۔ وہ اس کے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آیا اور ٹیبل پہ رکھے ڈھیروں پرفیومز میں سے ایک کولون اٹھایا اور اسے اپنے اوپر چھڑکنے لگا۔ اس کے ہونٹوں پہ مسلسل وہی دھن تھی اور نظریں مہرو پہ تھیں۔ مہرو نے بھی ایک

خاموش نظر اپنے مجازی خدا پہ ڈالی۔

''اُٹھو اور بیڈ پہ چلو۔'' وہ بہت بدتمیزی سے بولا۔

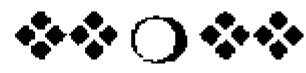
''کیا......؟'' وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔

''بہت اچھی لگ رہی ہو۔ اور میں یہ موقع گنوانا نہیں چاہتا۔ سلمان اپنی من مرضی کرنے کا عادی ہے اور ہمیشہ وہی کرتا ہے جس کی اسے اس وقت ضرورت ہو۔'' وہ بولا اور اسے بازو سے کھینچ کے اٹھا کے بستر پہ لے آیا اور اسے بستر پہ پھینک دیا۔

''سلمان! باہر مہمان ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ آج ولیمہ ہے ہمارا۔ ہر کام وقت پر ہی مناسب لگتا ہے۔ پلیز آپ اور میری انسلٹ مت کریں۔'' وہ ہاتھ جوڑ کے التجا کر رہی تھی۔

''انسلٹ .... مائی فٹ۔ بیوی ہو تم میری۔ ولیمہ ہے تو ولیمہ ہی تو سیلیبریٹ کرنا چاہتا ہوں۔ اور تمہیں مجھے روکنے کا کوئی حق نہیں......کوئی بھی حق نہیں۔'' وہ دروازے کی طرف بڑھا اور وقت اک اور پامالی مہرو سے مانگ رہا تھا۔

زندگی کے بے رحم اوراق پہ نجانے اس کی پامالی کی اور کتنی تحریریں رقم ہونی تھیں۔



فرزانہ کے دروازہ کھٹکھٹانے پر سلمان نے دروازہ کھولا۔

''بہت دیر ہو رہی ہے مانی!........ باہر سبھی لوگ دُلہن کا انتظار کر رہے ہیں۔ اور تمہارے ڈیڈی تمہیں کب سے ڈھونڈ رہے ہیں۔'' فرزانہ کہتی کہتی اندر آ گئیں۔

اندر کا منظر ہی اور تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ جہاں چند لمحے قبل کوئی آندھی، کوئی طوفان آیا ہو۔ مہرو بستر پہ بے سدھ پڑی تھی۔ اس کی کانچ کی چوڑیاں کچھ فرش پہ، کچھ بستر پہ بکھری پڑی تھیں۔ نفاست سے کیا چہرے کا میک اپ بکھر چکا تھا۔ بال بھی بکھرے بکھرے تھے۔ بالوں میں لگے گجرے روندے ہوئے تھے۔ کلائیوں میں جگہ جگہ مہندی کے ساتھ ہی خون کے دھبے نظر آ رہے تھے۔ کسی جنگلی بھیڑیے کے نوچنے کے آثار تھے۔

''یہ کیا ہو گیا ہے اسے مانی؟'' فرزانہ نے سلمان کی طرف دیکھا۔ اس سے آنکھیں ملتے ہی وہ ساری کہانی سمجھ گئیں اور مہرو کی جانب بڑھیں۔

''یو شُڈ کنٹرول یور سیلف مانی! نیچے اس کا باپ بھی موجود ہے اور ہزاروں مہمان بھی۔ پاگل پن مت کیا کرو۔'' وہ بولیں۔

''میں جا رہا ہوں نیچے مام! اسے تیار کر کے لے آیئے گا........ بائے سویٹ ہارٹ!'' اس کی آنکھوں میں کوئی شرمندگی، کوئی پشیمانی نہ تھی۔ وہ کمینگی سے مسکراتا ہوا دروازہ عبور کر گیا اور فرزانہ، مہرو کو سہارا دے کر اٹھانے لگیں۔

''اٹھو بیٹا! پاگل ہے سلمان۔ لاڈلا بنا کے پالا ہے، زیادہ ہی من مانی کرتا ہے۔ میں میں سوشی کو اوپر بھیجتی ہوں، وہ میک اپ دوبارہ سے کر دے گی اور تمہارے زخموں پہ بینڈیج بھی کر دے گی۔'' وہ اسے اٹھا کے بٹھاتے ہوئے بولیں۔

''کسی کو اوپر بھیجنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نہیں جاؤں گی نیچے۔ فوٹو گرافر کو اندر بھیجیں اور اسی حال میں میری تصویریں بنوائیں۔ اور صبح تمام اخبارات میں اپنے بیٹے کے کالے کارناموں کو چھپوا دیں۔'' مہرو انتہائی نفرت سے بولی۔

''کم آن بیٹا! وہ تمہارا ہزبینڈ ہے۔'' فرزانہ مصنوعیت سے مسکرائیں۔

''کتنے روپوں میں خرید لایا ہے وہ مجھے؟ یہ کوئی طریقہ ہوتا ہے اپنی نو بیاہتا سے پیش آنے کا؟........ محبت کرنے کے، اس کے اظہار کے یہ طریقے ہوتے ہیں؟ اگر ایسا ہوتا تو دنیا میں کبھی کوئی لڑکی شادی کرنے کو تیار نہیں ہوتی۔ کبھی کوئی لڑکی خواب نہ بُنتی۔'' وہ روہانسے پن سے بولی۔

''اتنے مہمانوں کے سامنے ہماری بے عزتی ہو جائے گی بیٹا! تم ہی ہماری عزت رکھ سکتی ہو۔'' فرزانہ پیار سے بولیں۔

''جس کے پاس خود عزت نہ بچی ہو، جس کا سب کچھ رائیگاں گیا ہو، اس سے آپ اپنی عزت مانگ رہی ہیں؟'' آنسو پھسل پھسل کے اس کے گالوں پہ بکھر رہے تھے۔

''میں سوشی کو اوپر بھیجتی ہوں۔ تم تیار ہو جاؤ۔'' تحکمانہ انداز میں کہتی ہوئی فرزانہ کمرے سے چلی گئیں اور وہ اپنی قسمت پہ آنسو بہاتی رہی۔ قسمت کی تاریکی میں اسے کہیں کوئی روزن نہیں مل رہا تھا۔



چھوٹے سے فون کال کے ذریعے اجازت مانگنے کے بعد عتیقہ عثمانی کچھ ہی دیر میں اس کے گھر آ گئی تھی۔ عتیقہ کا چہرہ دیکھ کے ماہا کو عجیب سی تشویش ہوئی۔ اس کی رنگت اُڑی اُڑی اور چہرہ پژمردہ سا تھا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے اور چہرے کی ہڈیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ اوپر سے اس کا سیاہ اور سفید لباس اس کی حالت میں غیر معمولی پن دکھا رہا تھا۔

''آؤ عتیقہ! بیٹھو۔'' لاؤنج میں پہنچ کے ماہا نے اسے بیٹھنے کو کہا۔

''نہیں میم! میں یہاں بیٹھنے نہیں آئی۔ بس آپ سے ایک ضروری گزارش یا التجا کرنے آئی ہوں۔'' اس نے اُداس لہجے میں کہا۔

''کہو، کیا کہنا ہے؟ میں سن رہی ہوں۔'' ماہا نے اس کے چہرے اور آنکھوں میں چھپا جنون پڑھ لیا تھا۔

''میم! میں بے حد پریشان ہوں۔ نہ راتوں کو سو سکتی ہوں اور نہ دن میں سکون پاتی ہوں۔ نیند، آرام، کھانا پینا سب ختم ہو کے رہ گیا ہے۔ بلڈ پریشر مسلسل لو رہنے لگا ہے۔ عجیب طرح کے ویژن دکھائی دیتے ہیں۔ ہر طرف اس کا چہرہ نظر آتا ہے۔ اور مجھے آپ بچا سکتی ہیں میم! آپ مجھے میری محبت دے سکتی ہیں۔'' ٹپ ٹپ بہتے آنسوؤں کے ساتھ عتیقہ نے پوری کہانی سنا دی۔

''کیا مطلب؟.....کون ہے تمہاری محبت؟ اور کیسے دے سکتی ہوں میں وہ تمہیں؟'' عجیب تذبذب کے عالم میں ماہا نے پوچھا۔

''میں شمائل علی سے بہت محبت کرتی ہوں۔ بہت زیادہ۔ اسے مجھے دے دیں میم! میں اس کے بغیر مر جاؤں گی۔ میں نے ہر ممکن کوشش کی ہے اسے اپنی طرف مائل کرنے کی مگر وہ نہیں مانتا۔ وہ صرف آپ سے محبت کرتا ہے۔ اسے میرا ساتھ منظور ہی

نہیں۔'' وہ مسلسل رو رہی تھی۔

ماہا لمحہ بھر میں سارا قصہ سمجھ گئی۔ اس نے اسے دونوں کندھوں سے تھام کے صوفے پر بٹھایا اور خود بھی اس کے سامنے بیٹھ گئی اور نہایت پیار سے اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔

''تم شائل سے محبت کرتی ہو؟ اسے پانا چاہتی ہو؟ اس کی ہونا چاہتی ہو؟''

اس کے ملائم لہجے کے باعث عتیقہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور گردن اثبات میں ہلائی۔

''تمہیں پتہ ہے تتلیاں جب پھولوں کی محبت میں گرفتار ہوتی ہیں تو وہ ان پہ اپنا سب کچھ وارنے پر تیار ہو جاتی ہیں، بالکل تمہاری ہی طرح۔ اور وہ بامراد ہو جاتی ہیں۔ تم بھی بامراد ہو جاؤ گی عتیقہ! اگر تمہاری محبت سچی ہے تو تم نے تو میرے اندر کی بہت بڑی گھٹن کو دور کر دیا ہے۔ تم نے تو میری بہت بڑی مشکل کو آسان کر دیا ہے۔''

ماہا نے مسکرا کے کہا۔

''مجھے شائل کی بہت زیادہ فکر تھی۔ میں نے اس سے دوستی کی تھی۔ کئی مہینے اس کی قربت میں گزارے تھے۔ میں اسے اپنے سے چھوٹوں کی طرح چاہتی تھی۔ گو کہ اس کی وارفتگی اور دیوانگی نے اس رشتے کو کچھ اور ہی نام دے دیا۔ لیکن میری نیت میں کوئی کھوٹ نہیں تھی۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ میں اپنے بچوں کے ہمراہ کسی اور شہر شفٹ کر جاؤں گی۔ اور ایسے میں مجھے شائل کی فکر تھی۔ میں اُسے اس حالت میں تن تنہا نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ لیکن اب تمہارے اس انکشاف کے بعد مجھے راستہ نظر آ رہا ہے عتیقہ! تم شائل کی زندگی میں ایسی محبت کے رنگ بھر دو گی کہ ماہا عامر کو وہ چند دنوں میں فراموش کر دے گا۔ کبھی پلیٹ کے وہ مجھے نہیں پکارے گا۔'' ماہا نے تفصیل سے کہا۔

''لیکن میم! یہ کس طرح سے ممکن ہو سکے گا؟........ وہ تو ذہنی طور پہ مجھے قبول کرنے کو تیار ہی نہیں ہے۔'' عتیقہ کا لہجہ روہانسے پن سے بوجھل تھا۔

''جب کسی کی نظر اندازی اور بے وفائی کا دکھ بہت شدید ہوتا ہے تو انسان اپنے لئے کسی اور کی محبت کو ٹھکرا نہیں سکتا۔ ماہا کی بے رخی، اس کی جدائی، اس کی دی ہوئی تنہائی یقیناً شائل علی کے دل میں عتیقہ کے لئے کوئی کرن ضرور پیدا کرے گی اور تم

اُس کے اس دور سے فائدہ اٹھاؤ۔ اسے اتنی ہمدردی، اتنی محبت اور اپنائیت دو کہ وہ خود تمہارے بن نہ رہ سکے۔'' ماہا بہت پیار سے اسے سمجھا رہی تھی۔

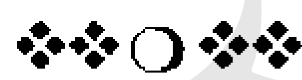
''اصل میں عتیقہ! انسان بعض اوقات سفر کرتے کرتے کسی ایسی رہگذر، کسی ایسی پگڈنڈی کا انتخاب کر لیتا ہے جو اس کی منزل سے دور ہوتی ہے، جو اس کی نہیں ہوتی۔ لیکن پھر بھی وہ اپنی منزل بھلا کے فقط اسی راستے پہ چلنا چاہتا ہے۔ وہ رہگذر اُسے اپنی منزل لگتی ہے۔ شائل بھی ایسا ہی محسوس کر رہا ہے، اور کچھ نہیں۔ عتیقہ! میں نے اپنی زندگی میں سب کچھ دیکھا ہے۔ رشتے، محبت، کامیابی اور عزت۔ اب میری زندگی کا محور و مرکز میرے بچے ہیں۔ ان کو میری ضرورت ہے اور تم لوگوں کے لئے تو ابھی زندگی کی ابتداء ہی ہے۔ تم لوگوں کے نئے خواب ہیں، نئی خواہشیں اور امنگیں ہیں۔ میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا کہ کبھی اپنے خواب وہاں پہ ضائع مت کرنا جو تمہاری منزل نہ ہو، فقط رہگذر ہو۔ اپنے لئے بہترین راستے کا انتخاب کرو اپنی منزل تک پہنچنے کے لئے کہ زندگی کسی کو چاہنے کا نام ہے، چاہے جانے کا نہیں۔''

آج پہلی بار عتیقہ کو ماہا بہت اپنی لگ رہی تھی۔ بہت ہمدرد اور بہت نرم دل۔ اس سے متعلق پہلے جتنی بھی تلخی عتیقہ کے دل میں تھی وہ یکدم دھل گئی تھی۔

''صرف دس دن تم میرے کہنے پر عمل کرو۔ تم دیکھو گی تمہارا شائل تمہارا ہوگا۔ وہ مجھے بھول جائے گا اور تمہیں اپنا لے گا۔ بولو........ دو گی میرا ساتھ؟''

اس کے یقین بھرے لہجے نے عتیقہ کی آنکھیں نم کر دیں اور وہ نم آنکھوں سے اثبات میں گردن ہلانے لگی۔

اب اس کی منزل اس کے سامنے تھی
اور راستہ بھی دسترس میں تھا



تمہارے نام کے حرفوں سے بہتر حرف ابجد میں نہیں
نجانے کب سے یہ موسم
ستاروں کی طرح دھرتی کے سینے پر فروزاں ہیں
مگر ان کی نگاہوں نے

تمہارے وصل کے لمحوں سے بہتر وقت
دیکھا ہے نہ سوچا ہے
ہوا نے منظروں کے نام پر جو کچھ بھی لکھا ہے
تمہارے نام لکھا ہے
خلاء میں ٹوٹتے تارے تمہاری بام سے گزریں
تو رُکنے کو مچلتے ہیں
فلک کو چومتے جذبے تمہاری آنکھ سے گزریں
تو پاتالوں میں گرتے ہیں
تمہارے خواب سے روشن منارے
وقت کے دریائے بے حد میں نہیں ہیں
تمہارے نام کے حرفوں سے بہتر حرف ابجد میں نہیں ہیں

چھت کی کڑیوں کو دیکھتے دیکھتے شائل کے ذہن میں نظم کے الفاظ گونج رہے تھے اور ان الفاظ میں ماہا کا عکس، اس کے ساتھ بتائے کتنے دنوں کی یادیں لرز رہی تھیں۔

وہ دو دن سے بخار میں مبتلا اسی طرح بستر پہ لیٹے لیٹے چھت کو دیکھے جا رہا تھا۔ ٹھکرائے جانے کا کرب اپنے دل پہ تن تنہا محسوس کر رہا تھا۔ آگے اسے کوئی راستہ، کوئی منزل دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ دل پہ اک کرب سا چھایا تھا۔ آنکھوں کے پپوٹے کھلتے تو بند کرنا بھول جاتا، کھلی آنکھیں مسلسل کھلنے کے باعث چبھتی تھیں۔

رات کے پچھلے پہر اسے اپنے اردگرد ہیولے دکھائی دینے لگے تھے۔ عجیب پاگل پن سوار ہو گیا تھا اس کے اوپر۔ کبھی اس کا دل کرتا کہ کسی ٹرین کی پٹڑی پہ اسی طرح چپ چاپ نیند کی گولیاں کھا کے لیٹ جائے۔ کبھی وہ سوچتا کہ کسی پہاڑی علاقے میں جہاد کی غرض سے نکل جائے اور کسی دن کوئی گولی کھا کے یا بم دھماکے میں مر کے شہادت پا جائے۔ کبھی وہ سوچتا کہ شادی کر لے اور اپنی باقی ماندہ زندگی بھی کسی عام انسان کی طرح بسر کر دے۔ عجیب حالت میں اس کے شب و روز گزر رہے تھے۔

''اُٹھ جا یار میرے!.......اُٹھ جا۔ کب تک اس طرح پڑا رہے گا؟'' عادل نے اسے آنکھیں کھولے چھت کو دیکھتے ہوئے پایا تو کہا۔

''کتنے دن ہو گئے ہیں، نہ کہیں آتے ہو نہ جاتے ہو۔ بخار ہے لیکن علاج نہیں کرواتے ہو۔ اس طرح کیسے چلے گا یار؟.......حافظ بھائی! آپ ہی اسے سمجھائیں۔ بے وقوف نہ بنے۔ کہیں اسے کہ اُٹھے اور ڈاکٹر کے پاس چلے میرے ساتھ۔'' عادل نے حافظ بھائی کو نماز سے فارغ ہوتے دیکھا تو کہا۔

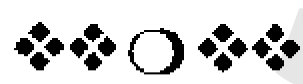
''شائل بھائی! اٹھ جاؤ۔ علاج کروانے سے ہی صحت نصیب ہوتی ہے۔ جان ہے تو جہان ہے۔ اُٹھو اور جاؤ ڈاکٹر کو دکھا آؤ۔ میں نے پانی پہ آیاتِ شفا بھی دم کر کے رکھی ہیں، وہ بھی نہیں پیتے ہو۔'' حافظ بھائی بھی اس کی چارپائی کے نزدیک آ گئے تھے۔

''حافظ بھائی! مجھے نہیں جینا۔ مجھے ٹھیک نہیں ہونا۔'' وہ مایوسی سے بولا۔

''استغفر اللہ بھائی! اس طرح کے کفریہ کلمات ادا نہیں کرتے زبان سے۔ مایوسی کفر اور گناہ ہوتی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ آپ سے کوئی چیز لے لیتا ہے تو وہ آپ کے خالی ہاتھوں پہ کوئی اور اچھی چیز رکھتا بھی ہے۔'' حافظ بھائی نے اسے سمجھایا۔ اس نے گردن جھٹکی۔

''دیکھو یار! اب تو حافظ بھائی اور میری بھی صلح ہو گئی ہے۔ اب تو ہم بھی نہیں لڑتے۔ اب تو تم ٹھیک ہو جاؤ۔ عادل نے مسکرا کے کہا۔

''معجزے تو ہوتے ہیں دنیا میں۔ عادل بھائی اب پانچ وقت نمازیں پڑھنے لگا ہے۔ قرآن پاک کی تلاوت کرتا ہے میرے ساتھ۔ آپ بھی ٹھیک ہو جاؤ اور آپ بھی ہمارے ساتھ نماز و قرآن پڑھنا۔ عبادت میں بہت سکون ہے شائل بھائی!'' حافظ بھائی نے پیار سے کہا اور پھر وہ دونوں اسے زبردستی ڈاکٹر کے پاس لے جانے کے لئے آمادہ کرنے لگے۔ پہلے تو وہ مسلسل انکار کرتا رہا لیکن پھر آمادہ ہو گیا۔



''میں اندر جانا چاہتی ہوں۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' ولیمے کے فنکشن میں اسٹیج پہ بیٹھی ہوئی مہر النساء نے اپنی ساس کو کہا تھا۔ فرزانہ خاموش ہو گئی تھیں۔

''جسٹ ون مور آور سویٹی! صرف ایک گھنٹہ اور بیٹھ جائیں۔ فوٹو گرافر کو پوز دیں۔ مہمانوں سے ملیں۔ پھر میں چھوڑ آؤں گی اندر۔'' فرزانہ نے مسکرا کے کہا۔

''لیکن آپ جانتی ہیں کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اور میں اپنے بابا سے بھی

ملنا چاہتی ہوں۔ انہیں اسٹیج پہ بلایئے۔'' مہرالنساء نے آہستہ سے کہا۔

''نہیں آئے آپ کے بابا۔ چوہدری صاحب کب سے انہیں فون ٹرائی کر رہے ہیں لیکن کوئی رسپانس نہیں۔'' فرزانہ کے لہجے میں اک ڈھکا چھپا طنز تھا جس نے مہرو کے اندر کی تنہائی کے احساس کو اور تقویت بخشی۔ اس نے اردگرد نظر دوڑائی۔ رنگ برنگے ملبوسات اور زیورات میں سجی سجائی عورتیں، مہنگے ٹو پیس سوٹ پہنے مصنوعی خوش گپیوں میں مصروف بیورو کریٹس اور ان کی دوغلی بیویاں، چمکیلے بھڑکیلے کپڑے، طرح طرح کی گاسپ اور باتیں، ایک دوسرے کے لئے آنکھوں میں نفرت اور ہونٹوں پہ مٹھاس۔ مہرالنساء نے لحہ بھر کو سوچا۔

'لوگوں کی اتنی بھیڑ میں کیا کوئی بھی میرا اپنا نہیں؟ ......کوئی خون کا رشتہ، کوئی دوستی کا تعلق، کوئی اپنائیت بھرا چہرہ......اس بھیڑ میں کوئی ایسا نہیں جو مجھ سے آ کے میرا حال پوچھ سکے؟...... بابا بھی نہیں آئے۔ کیا ان کے لئے آنا اتنا غیر ضروری تھا؟ انہوں نے اپنی بیٹی کسی اور کو سونپ دی اور خود بری الزمہ ہو گئے؟ بوجھ اتر گیا ان کے شانوں سے؟......خود غرض باپ، ایک ذمہ دار سیاست دان مگر ایک بے خبر باپ۔ ایک کامیاب منسٹر مگر ایک ناکام والد' مہرو نے تنفر سے سوچا۔

'میں کتنی اکیلی ہوں اس اتنی بڑی دنیا میں کہ کسی کو مدد کی خاطر پکار بھی نہیں سکتی۔ وارث کو بھی نہیں۔ ایک ایسی تقدیر لکھی گئی ہے کہ جس میں آزادی کا کوئی پیامبر نہیں، خوشی کی کوئی نوید نہیں......شہزادی جنگل کی اسیر ہو چکی ہے۔ اور اس کی آزادی کے لئے کوئی شہزادہ اپنی تلوار سے جنگل کے کیل کانٹے ہٹاتا اس تک نہیں آئے گا۔ اس کے جسم میں گڑی سُوئیاں کوئی نہیں نکالے گا۔'

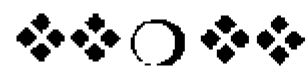
وہ مسلسل اپنی سوچوں میں گم تھی۔ مووی میکر اور فوٹو گرافر اکثر اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی خاطر اسے ''ایکسکیوزمی میڈم!'' کہتے مگر اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ کسی مہمان عورت نے پھولوں کا گلدستہ اس کی گود میں رکھ دیا۔

''مبارک ہو بیٹا! بہت پیاری دلہن لائے ہو۔'' اس عورت نے سلمان کو کمنٹس دیئے اور پھر فرزانہ کے ساتھ باتوں میں مشغول ہو گئی۔ مہرو نے گلدستہ نفرت سے سامنے رکھی میز پہ رکھا۔

''ایزی ڈارلنگ! ایزی۔ مجھے دے دو اگر بھاری لگ رہا ہے تو۔'' سلمان نے اس کا ہاتھ تھام کر پیار سے دیکھا اور اس کی پیار بھری آنکھوں پہ مہرو کو شدید غصہ آیا۔

''مجھے اوپر جانا ہے۔ وڈیو اور کیمرہ کی روشنی سے مجھے اُلجھن ہو رہی ہے۔'' اس نے لئے دیئے انداز میں کہا۔

''بس پندرہ منٹ اور جانو! فوٹو گرافی ہو جائے گی، پھر چلتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں آپ ہم سے تنہائی میں ملاقات کرنے کے لئے بہت بے قرار ہیں۔'' بہت قریب آ کر سلمان نے سرگوشی کی اور مہرو نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ آنکھوں کے کونے بھیگ گئے تھے۔ دل سے کرب آمیز آہ سی نکلی تھی اور پھر مسلسل فوٹو گرافی اور مہمانوں سے ملنے کا سلسلہ جاری رہا۔



''کہاں جا سکتا ہے وہ؟ ......رستم علی! جا کے باہر دیکھو۔ علیم سے کہو کہ گاڑی نکال کے سارا علاقہ ڈھونڈ آئے۔ ایک چھوٹا سا بچہ تم لوگوں کی نظر میں نہیں آیا اور نکل گیا۔ کس طرح کے گارڈز ہو تم لوگ؟''

سردار صاحب باوردی گارڈ پہ غصہ نکال رہے تھے۔ شام کے وقت زین کہیں فرار ہو گیا تھا جس کے باعث سردار صاحب مہرو کے ولیمے میں بھی جا نہ سکے تھے۔ چوہدری صاحب کے فون پہ فون آ رہے تھے اور ان کے پاس انکار کا بظاہر کوئی جواز نہیں تھا۔ جیب میں رکھا موبائل فون مسلسل بجے جا رہا تھا۔ انہوں نے نکال کے دیکھا، چوہدری کے گھر کا نمبر تھا۔ ان کے چہرے پہ کوفت کے تاثرات اُبھرے۔ انہوں نے یس کا بٹن پش کر کے عجلت میں کہا۔

''یار چوہدری! میں ولیمے میں نہیں آ سکتا۔ ایک مسئلہ یہاں کھڑا ہو گیا ہے۔ میری موجودگی بے حد ضروری ہے۔ میری طرف سے معذرت کر لو سب مہمانوں سے۔''

دوسری طرف مہرالنساء تھی جس کے دل کا کنول پہلی بات سن کر ہی مرجھا گیا۔

''بابا! میں ہوں۔ مہرالنساء۔'' اس نے اُداسی سے کہا، دل میں آخری امید لئے۔

''اوہ، مہرو بیٹے! ہم نہیں آ سکتے۔ یہاں ضروری کام ہے۔'' سردار صاحب نے

پریشانی سے کہا۔

''بابا! یہاں میں اکیلا محسوس کر رہی ہوں۔ کوئی بھی تو نہیں ہے۔'' وہ بولی۔

''سبھی تو ہیں وہاں۔ تمہارا شوہر، ساس سسر، پورا خاندان۔ اب تمہیں انہی کو اپنا سمجھنا چاہئے۔ اگر ایک غیر اہم سی تقریب میں، میں نہیں آیا تو کوئی قیامت تو نہیں آ گئی۔ مجھے یہاں بہت کام ہے اور ٹینشن بھی۔ بار بار مجھے فون کر کے پریشان مت کرو۔'' سردار صاحب نے انتہائی غصے میں کہہ کے موبائل فون بند کر دیا اور پرے پھینک دیا۔

جدید موبائل فون سیٹ کی بیٹری نکل کے دور جا گری۔ ریسیور تھامے ہوئے مہر النساء گویا پتھر بن گئی۔ سب کچھ وہیں کا وہیں منجمد ہو گیا۔ فقط اِک آنسو ڈھلک کے گرا اور نتھ کے تار پر اٹک گیا۔ جیسے نتھ کی آنکھ سے آنسو بہہ رہا ہو۔

'کیا اتنی غیر اہم ہوں میں بابا کے لئے؟...... کیا فقط ایک رات میں، میں اتنی پرائی ہو گئی کہ وہ خود کو میرا اپنا ماننے کو بھی تیار نہیں؟...... کیا خون کے رشتے اس قدر ناپائیدار ہو سکتے ہیں؟...... کیا وہ جانتے ہیں کہ انہوں نے مجھے کن ہاتھوں میں سونپا تھا؟...... کیا میری پامالی کا ذرا بھی احساس ہے ان کے دل میں؟'

ہزاروں سوال تھے جو اُمڈ اُمڈ کے اس کے دل میں آ رہے تھے۔

اس نے آنکھ اٹھا کے اس اجنبی چاردیواری کو دیکھا، جو اس کے لئے زندان کے مترادف تھی۔ جہاں لحہ لحہ اس کے ارمانوں کا خون ہوتا تھا۔ فقط ایک رات اور ایک دن ہی اس کے اتنی اذیت میں گزرے تھے۔ آگے کی زندگی کس طرح گزرے گی۔

اس نے ایک گہری سانس لی اور اپنا سر صوفے کی پشت سے ٹکا دیا۔ آنکھیں موندتے ہی کسی کا چہرہ آنکھوں کی چلمن پہ اُبھر آیا۔

''آپ ہر وقت نتیجہ نکالنے کی اتنی جلدی میں کیوں ہوتی ہیں مہرو بی بی! زندگی کے فیصلے اتنی عجلت میں نہیں کئے جاتے۔''

وارث کی آواز برسوں کی مسافت چیرتی کانوں میں گونجی۔ مہرو کا کلیجہ حلق تک آ گیا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ دو موٹے موٹے آنسو ڈھلک کے گالوں پہ گر گئے اور عروسی ملبوس تک کا سفر طے کرنے لگے۔

'میں نے آپ سے انتقام لینے کی خاطر یہ عجلت کا فیصلہ کیا تھا وارث!...... مجھے کیا پتہ تھا میں اپنی ناؤ خود ہی ڈبو دوں گی۔ میں تو جانتی ہی نہ تھی کہ میں آپ میں اتنی بس چکی ہوں کہ آپ سے لیا جانے والا انتقام دراصل میں خود سے ہی لوں گی...... خود سے ہی لوں گی۔' وہ پھوٹ پھوٹ کے رو رہی تھی۔



''کیا کر رہی ہو ابھی تک آفس میں؟'' ہمایوں کے لہجے میں ایک عجیب بیگانگی تھی۔ وہ موبائل پہ بات کر رہا تھا۔

''کیا مطلب، کیا کر رہی ہوں؟ جانتے ہو، نیا کیس ملا ہے عائشہ وقار والا۔ اسی کو اسٹڈی کر رہی تھی۔ صبح بتایا تو تھا کہ رات دیر سے گھر جاؤں گی۔'' شہرین نے کہا۔

''تم نے اپنی ٹیبل کی دراز کھولی؟'' عجیب سا سوال تھا۔

''نہیں...... لیکن کیوں؟''

''ٹائم بم سیٹ کر کے رکھا ہے اس میں تمہارے لئے۔ بلاسٹ ہونے سے پہلے چیک کر لو۔'' ہمایوں نے مسکرا کے کہا۔

''کیا مطلب ہے ہمایوں؟'' وہ حیران ہوئی۔

''ارے یار! کھول کے تو دیکھو، پھر لڑائی کرنا۔'' ہمایوں کے لہجے میں دلار اور نرمی تھی۔

''اچھا، ابھی کھولوں یا فون رکھنے کے بعد؟'' اس نے فائل بند کر دی۔

''میں فون رکھتا ہوں، تم کھول لو۔'' ہمایوں نے خاموشی سے فون رکھ دیا۔

شہرین نے اپنی ٹیبل کا دراز کھولا۔ چھوٹی سی ڈبیا تھی، جس پہ سنہرا کاغذ لپٹا تھا اور گلابی لفافے میں بند اِک کارڈ تھا۔ شہرین نے پہلے ڈبیا کا کاغذ اُتارا، کاغذ اُتار کے نیلے رنگ کی اِک ڈبی نکلی اور اسے کھولنے پہ اِک ننھے سے ہیرے سے جگمگاتی نازک سی انگوٹھی۔ شہرین نے حیرت سے اس کے جگمگاتے ہیرے کو دیکھا۔ کارڈ کھولتے ہوئے اس کے ہاتھوں کی رفتار ذرا مدھم پڑ گئی تھی۔ دل کی دھڑکن نے رفتار پکڑ لی تھی۔ چاروں طرف تنہائی تھی۔ دفتر کی کھڑکی سے ڈوبتے سورج کی کرنیں چھن کے

اندر آ رہی تھیں۔ خاموشی میں دھڑکن کی آواز صاف سنائی دیتی تھی۔

شہرین نے کارڈ نکالا، جس کے اوپر سنہرے لفظوں میں کسی کے دل کی کہانی رقم تھی۔ اِک موہوم سی خواہش تحریر تھی۔

Will you marry me?

Coz I love you so much.

ہمایوں کے ہاتھوں سے لکھا یہ اعتراف پڑھ کر شہرین کے ہونٹوں پہ شرمیلی مسکان بکھر گئی۔

''اتنی سی بات کہنے میں تم نے اتنا عرصہ لگا دیا ہمایوں! اور جب بتایا تو کہہ کر نہیں، لکھ کر بتایا۔ تم جو لکھنے کے ہمیشہ سے چور تھے، بولنا اور بولتے چلے جانے میں ماہر تھے، تمہاری زبان نے اس بار تمہارا ساتھ کیوں نہیں دیا؟'' وہ مسکرا کے سامنے رکھے کارڈ سے ہم کلام تھی۔

کارڈ کے ساتھ رکھے سیل فون پہ بیل ہوئی۔ ہمایوں کا نام بلنک کر رہا تھا۔

''نہیں اٹھاؤں گی میں فون۔ کیونکہ میں اس وقت تم سے بات کر ہی نہیں پاؤں گی۔ اس لئے فون بند کر دو۔ کیونکہ مجھے بہت شرم آ رہی ہے۔'' شہرین نے مسکرا کے موبائل فون کو مخاطب کیا اور بار بار اس کارڈ کو پڑھنے لگی جس میں لکھے سنہری رنگ کے الفاظ اس کی زندگی کے سب سے خوبصورت الفاظ تھے۔

پریم کتھا کا انت نہ کوئی
کتنی بار اسے دہرائیں
پریت کی ریت انوکھی ساجن
کچھ نہ مانگیں سب کچھ پائیں

وہ دھیمے دھیمے قدموں سے فٹ پاتھ پر چل رہی تھی۔ چونکہ مین روڈ نہیں تھا اس لئے ٹریفک بھی نہیں تھا۔ آج وہ بہت خوش تھی۔ زندگی ایک نئی ڈگر پہ چل رہی تھی۔

ہمایوں کو وہ بہت پہلے سے چاہتی تھی۔ انڈر اسٹینڈنگ اور دوستی بھی اچھی تھی دونوں میں۔ پروفیشن بھی یکساں تھا۔ اور سچ تو یہی تھا کہ ہمایوں تھا بھی ایسا جو شہرین نے آج تک سوچا تھا۔ بالکل آئیڈیل شخص، لائق فائق، پڑھا لکھا اور اچھی فیملی کا بیٹا۔

وہ اس کے ساتھ کی خواہش پہ نازاں چل رہی تھی۔

سامنے سے ایک رکشہ گزرا۔ اس نے رکشہ کو اشارہ کیا مگر وہ رفتار سے کراس کر گیا۔ اس نے دوبارہ اپنی سابقہ رفتار پکڑ لی اور چلنے لگی۔ تبھی اسے اپنے پیچھے سے ہارن کی آواز آئی۔ گاڑی کی لائٹس مدھم تھیں۔ شہرین نے مڑ کے دیکھا، وہ ہمایوں کی سفید آلٹو تھی۔

کچھ دیر وہ خاموشی سے کھڑی اسے دیکھتی رہی اور پھر اسی طرح چپ چاپ چلتی ہوئی گاڑی کے فرنٹ ڈور تک آئی اور اندر بیٹھ گئی۔ خاموشی سے ہمایوں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

خاموشی دونوں کے درمیان محوِ رقص تھی۔ کہنے کو بہت کچھ تھا، الفاظ ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ راستہ خاموشی سے کٹتا ہی جا رہا تھا۔

''کچھ تو کہو یار!........ اس طرح خاموش کیوں ہو؟'' ہمایوں نے شروعات کر ہی دی بالآخر۔

''کیا کہوں؟'' وہ ہاتھ میں پہنے بریسلٹ سے کھیلنے لگی۔

''اتنی محنت سے میں نے کارڈ سلیکٹ کیا۔ کم از کم چھ دکانیں چھانیں۔ اور انگوٹھی، اس کا تو پوچھو ہی مت۔ دس بارہ دن لگے ڈھونڈنے میں۔ اور یہ پیکٹ رکھنے کے لئے ہمت جمع کرتے کرتے چار دن لگ گئے۔ اور تم اس طرح خاموش بیٹھی ہو۔ کچھ تو کہو یار! ڈانٹ ہی دو، غصہ ہی کر لو، ڈونٹ کیپ کوائٹ۔'' ہمایوں گاڑی ہی کی رفتار سے بول رہا تھا۔

''اتنا کچھ کیا، لیکن دو لفظ زبان سے نہیں کہہ پائے۔ ویسے تو پٹر پٹر بولتے ہو بنا کسی کی سنے ہوئے۔ دل کی بات کہنی نہیں آتی۔'' شہرین نے لمحہ بھر نظر اس پہ ڈالی اور دوبارہ بریسلٹ کی طرف متوجہ ہوئی۔

''ہمیشہ ہمارے درمیان کام کی باتیں ہوئیں۔ کیسز، فائلز، ڈیلنز، چیپٹرز، کلاز وغیرہ وغیرہ۔ کبھی اپنے دل کی باتیں ہم نے شیئر نہیں کیں۔ بہت ڈرتا تھا تم سے۔ ہو بھی تو پورا کا پورا Bombshell۔ کیا گلا پھاڑ پھاڑ کے دلیلیں پیش کرتی ہو۔'' ہمایوں نے پیار سے اس کی جانب دیکھا اور اس کا ہاتھ تھام کے گیئر کے اوپر رکھا اور گیئر بدلنے لگا۔

دونوں ایک دوسرے کے پہلے لمس کی لذت سے سرشار خاموش رہے۔

''سنو شہزادی! میرا ساتھ قبول کریں گی آپ؟........ بہت نیک اور شریف بندہ ہوں۔ کھانا پکانا تو نہیں آتا لیکن باہر سے لانا آتا ہے۔ سلائی کڑھائی تو نہیں آتی البتہ اچھے درزیوں کو جانتا ہوں۔ سیلری زیادہ تو نہیں لیکن پندرہ تاریخ تک آرام سے زندگی گزر سکتی ہے۔ زیادہ چیخنا دھاڑنا بھی نہیں۔ کول بندہ ہوں، سیدھا سادھا سا۔'' ہمایوں نان اسٹاپ بول رہا تھا۔

''ہمایوں!'' شہرین نے اسے ٹوک دیا۔ وہ خاموش ہو گیا۔

''اپنی امی کو بھیج دیجئے۔ میں اپنی امی سے بات کرلوں گی۔'' بہت مدھم لہجے میں اس نے حامی بھری تھی۔ ہمایوں مسکرا دیا۔ اس کے ہاتھ پہ اپنی گرفت اور مضبوط کرلی۔

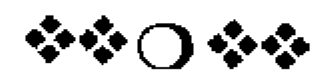
''تم میری زندگی کا ایک انمول خزانہ ہو۔ میں اپنے رب کا بے حد شکر گزار ہوں جس نے مجھے تم جیسا ساتھی دیا۔'' شہرین کے گھر کے آگے گاڑی روک کے اس نے بہت سنجیدہ لہجے میں کہا۔ شہرین نے بیگ میں ہاتھ ڈال کے انگوٹھی نکالی اور گاڑی کے ڈیش بورڈ کے اوپر رکھی۔

''انگوٹھی بہت خوبصورت ہے۔ مگر اسے دینے کا طریقہ ہوتا ہے۔ سب کے ساتھ آ کے پہناؤ گے تو قبول کروں گی۔ ورنہ رکھو اپنے پاس۔'' وہ گاڑی کا دروازہ کھول کے اتر گئی۔

''گھر نہیں آؤ گے؟'' کھڑکی میں چہرہ ڈالے وہ پوچھنے لگی۔

''بارات لے کر آؤں گا۔'' وہ شوخ ہوا۔

''دفع ہو جاؤ۔'' شرم سے مسکراتی وہ گھر کی طرف جانے لگی۔ گیٹ کے پاس رک کر اس نے مڑ کر اس شخص کو دیکھا جو محبت کی پہلی جلترنگ بن کے روح میں گونجا تھا۔ اسے الوداعی ہاتھ ہلا کر وہ گیٹ کے اندر آ گئی۔



''سنو دلہن! اپنے تمام زیورات اور کیش مجھے دے دو۔ تمہارے پاس محفوظ نہیں رہیں گی تمام قیمتی چیزیں۔'' صبح ہی صبح فرزانہ اس کے کمرے میں آئی تھیں۔

''لیکن کیوں آنٹی؟ میری جیولری اور تمام چیزیں میرے پاس محفوظ ہیں، میری الماری میں۔'' مہرو نے کہا۔

''اوہ، کم آن۔ تمہیں پتہ ہے اس گھر میں بیسیوں نوکر ہیں۔ کسی نے کوئی چیز اٹھالی تو پھر کوئی منہ سے اُگلے گا بھی نہیں۔ اس لئے خبردار رہنا لازمی ہے۔ میرے پاس تجوری ہے، میں اس میں رکھ دوں گی۔'' فرزانہ نے شانِ بے نیازی سے کہا۔

''لیکن آنٹی! وہ میری چیزیں ہیں۔'' مہرو کا لہجہ روہانسا ہو گیا۔

''ارے تو میں نے کب کہا کہ وہ میری ہیں۔ میں تو ان کی سیفٹی کی غرض سے کہہ رہی ہوں۔ لاؤ، جلدی سے مجھے دو۔ مجھے کلب جانا ہے۔ دیر ہو رہی ہے۔'' فرزانہ اپنے ناخن پہ لگا پالش دیکھتے ہوئے بولیں۔

''میں سلمان سے پوچھوں گی، پھر آپ کو دوں گی۔'' اس سے بہتر جواب اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔

''اس سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس گھر کی میں مالکن ہوں۔ میں جو کہتی ہوں، وہ ہو جاتا ہے۔ دکھاؤ اپنی جیولری۔'' فرزانہ سختی سے کہتی ہوئی اس کی الماری کی طرف بڑھیں اور اسے کھول کے تمام جیولری سیٹ نکال لئے اور انہیں اٹھاتی وہاں سے جانے لگیں۔ مہرو بے بسی سے دیکھتی رہ گئی۔ کچھ کہہ ہی نہیں پائی۔ فرزانہ کے کمرے سے جانے کے بعد وہ گویا بستر پہ ڈھے ہی گئی تھی۔ آنکھوں میں پانی چمکنے لگا تھا۔ تبھی کمرے کا دروازہ کھلا اور سلمان اندر آیا۔

''ہیلو ڈارلنگ! کیسی ہو؟''

''سلمان! سلمان! تمہاری ممی ابھی میرے کمرے میں آئی تھیں اور میری ساری کی ساری جیولری اپنے ساتھ لے گئیں۔'' مہر النساء نے اسے بتایا۔

''ہاں۔ مجھے بھی انہوں نے بتایا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ تم نے ان کے ساتھ بدتمیزی کی ہے۔'' سلمان ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے بولا۔

''بدتمیزی؟........ میں نے تو صرف اتنا کہا کہ وہ میری چیزیں ہیں اور ان کی حفاظت کرنا مجھے آتا ہے۔''

''غلط کہا۔ اس گھر میں کوئی چیز تمہاری نہیں۔ جو ہے وہ ہمارا ہے، ہم چوہدریز کا۔''

انگشت شہادت سے سلمان نے اپنی جانب اشارہ کیا۔ اس کا دل کٹ کے رہ گیا۔

''لیکن وہ جیولری میں اپنے ساتھ لائی تھی۔'' وہ جل کے بولی۔

''ساتھ لائی تھیں مگر اسے سنبھالنے کے لئے نہیں۔ جب پہننا ہو تو ممی سے لے لینا'' بہت رُکھائی سے سلمان نے کہا۔ مہرو نڈھال سی ہو کے صوفے پہ بیٹھ گئی۔

''کہاں تھے آپ رات بھر؟'' وہ موضوع بدلتے ہوئے بولی۔

''شیرٹین ہوٹل میں تھا۔ اک فرنگی سویٹ ڈش تھی، اُس کے ساتھ۔'' سلمان نے نہایت بے شرمی سے کہا۔

''آپ کو شرم نہیں آتی بیوی کے آنے کے بعد بھی ایسی گھٹیا حرکتیں کرتے ہوئے؟''

وہ بے حد نفرت سے بولی۔

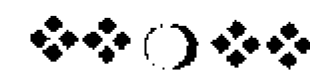
''بیوی سویٹ ڈش کہاں، وہ تو تیکھی مرچ ہے۔ اور یوں بھی کتنے دن مرچ کھا کے گزارا ہو گا، ذرا ذائقہ ہی تبدیل ہو گیا۔'' وہ انتہائی کمینگی سے بولا۔ افسوس اور حیرت کے تاثرات سے مہرو اسے دیکھے گئی جو اس کا مجازی خدا تھا، اس کے لئے قابل احترام تھا۔

''اگر تم میں اتنی کوالٹی ہے کہ مجھے کسی اور کا دروازہ کھٹکھٹانے سے روک سکو تو آزما لو اپنی کوالٹیز۔ مجھے کوئی اعتراض نہ ہو گا۔'' وہ اس کے قریب آیا اور اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ اس نے نفرت سے اپنا منہ پھیر لیا۔

''اور ہاں سویٹی! آج شام میرے دوست کے گھر ڈنر ہے۔ کوئی اچھی سی ساڑھی پہن لینا۔'' تحکمانہ فرمائش کرتا ہوا وہ واش روم کی طرف گیا اور جاتے جاتے مڑا۔

''اور اگر کوئی شارٹ سلیولیس بلاؤز ہو تو کیا قیامت لگو گی۔'' وہ آنکھ دبا کے بے شرمی سے بولا اور واش روم میں گھس گیا۔

شدتِ افسوس اور بے چارگی سے مہرو نے اپنی آنکھیں بھینچ لیں اور پھر زار و قطار آنسو بہاتی رہی اپنی قسمت پہ۔ نجانے کس گرداب میں پھنس گئی تھی جہاں سے کوئی راستہ اس کی نجات کی طرف جاتا نہ تھا۔



''یہ لیجئے .... چائے پی لیجئے۔ اور پھر دوائی کھا کے آرام کر لیجئے۔'' ثمین نے زیب کی طرف چائے کا کپ بڑھایا۔

زیب نے چائے لے لی اور چھوٹی چھوٹی چسکیاں لینے لگیں۔ اب وہ بہت حد تک نارمل زندگی بسر کرنے لگی تھیں۔ صاف ستھرے کپڑے، کھانا پینا، اخباروں کا مطالعہ اور ٹی وی دیکھنا۔ عبادت سے بھی بہت لگاؤ بڑھ گیا تھا۔ قرآن پاک ترجمے سے پڑھنے لگی تھیں اور درس پہ بھی ثمین کے ہمراہ باقاعدگی سے جاتی تھیں۔ فقط دو تین ماہ کے ہی عرصے میں وہ بہت حد تک سنبھل گئی تھیں۔ عبادت انسان کو بہت پُرسکون کر دیتی ہے۔ طبیعت میں بہت ٹھہراؤ لے آتی ہے اور ذہن کو تکالیف اور دکھوں سے خالی کر دیتی ہے۔ ثمین کی صورت انہیں ایک اچھی سہیلی بھی مل گئی تھی۔

''شہرین کے لئے رشتہ آیا ہے ہمایوں کا۔ کل شاید ہمایوں کی امی اور بہن آ جائیں۔ بہت اچھا لڑکا ہے۔ میں بہت خوش ہوں شہرین کے لئے۔'' ثمین نے خوشی سے کہا۔

''بیٹیاں چڑیاں ہی تو ہوتی ہیں۔ جتنا پیار کرو، جتنا سنبھال کے رکھو، ان کی پرواز کا ایک دن مقرر ہوتا ہے۔ وہ ہوتی ہی کسی اور کا آشیانہ بننے کے لئے ہیں۔'' زیب کی آنکھوں میں موہوم سی اُداسی تھی۔

''بہت خوش نصیب ہو تم۔ اپنی بیٹی کو اپنے ہاتھوں سے رخصت کرو گی۔ میں کتنی بدنصیب ہوں۔ اپنی بیٹی کے پاس ہو کر بھی اس سے بہت فاصلے پر ہوں۔ نہ اس سے مل سکتی ہوں اور نہ دیکھ سکتی ہوں۔ جانتی ہوں کہ وہ وہاں خوش نہیں ہو گی، تڑپ رہی ہو گی۔ مگر اس سے ملنے وہاں جا نہیں سکتی۔''

''کبھی کبھی انسان اپنے اور اپنوں کے بیچ فاصلے خود ہی حائل کر دیتا ہے۔ اس میں کسی اور کا کوئی قصور نہیں ہوتا۔ قدرت انسان کو بار بار مواقع فراہم کرتی ہے مگر انسان ہمیشہ انہیں گنواتا ہے۔ میرا خیال ہے زیب باجی! کہ آپ کو اپنی بیٹی کے ساتھ یہ فاصلہ نہیں رکھنا چاہئے۔ آپ کسی کی قصوروار تو نہیں۔ مشکل میں تھیں، حالات آپ کو غلط سمت لے گئے۔ پے در پے رونما ہونے والے حادثات نے آپ کو سب سے دور کر دیا۔ لیکن اب جبکہ قدرت نے ایک موقع اور دیا ہے تو اسے گنوائیں مت۔ مہر النساء ضرور سمجھ جائے گی۔ وہ آپ کا خون ہے، آپ نے اسے اپنی کوکھ میں پالا ہے،

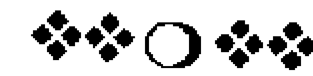
آٹھ سال اس کی پرورش کی ہے، اسے جنم دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ آج بھی اپنی ماں کو نہیں بھولی ہوگی۔ وہ آج بھی اپنی ماں کے لئے روتی ہوگی۔ اسے آج بھی اپنی ماں کی ضرورت ہوگی۔''

ثمین کی باتوں اور دلیلوں میں زیب کو سچائی محسوس ہو رہی تھی۔ غیر مرئی نقطے پہ آنکھیں ٹکائے وہ کچھ سوچ رہی تھیں۔

''شریکِ حیات بعض اوقات کسی بے بنیاد بات پر بدگمان ہو سکتا ہے، اولاد نہیں ہو سکتی۔ ماں اولاد کے لئے ہمیشہ عظیم رہتی ہے۔ چاہے وہ زندہ رہے، چاہے وہ مر جائے۔ مہرو نے اپنی ماں اچانک کھوئی تھی۔ اس نے اس کا مرا ہوا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اسے ضرور پہچان لے گی اور نہ صرف خود پہچانے گی بلکہ پوری دنیا سے آپ کی پہچان کرائے گی۔'' ثمین نے اپنا ہاتھ زیب کے ہاتھ پہ رکھا اور اس کی آنکھوں میں دیکھ کر اسے یقین دلانے لگی۔

''آپ مہر النساء سے ملیں، اپنی آنکھوں میں ممتا بھر کے، اسے سینے سے لگا کے۔ فقط ایک بار اسے کہہ دیں کہ آپ اس کی ماں ہے۔ یقین کریں وہ آپ کے بازوؤں میں ٹوٹ کے روئے گی۔ لحوں میں یقین کر لے گی۔'' ثمین کے لہجے میں اور باتوں میں کچھ تو ایسا تھا جس میں اُمید کی چمکتی لو تھی، آس کا جگمگاتا دیا تھا، کرن تھی۔

زیب کی آنکھوں میں نمی آئی۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ مہرو سے ملے گی۔ قدرت نے اسے موقع دیا ہے جسے وہ ہرگز نہیں گنوائے گی۔



''یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو؟'' کاریڈور کے ستون سے ٹیک لگائے کھڑے شائل سے عتیقہ نے پوچھا۔

''کچھ بھی نہیں۔ یونہی کھڑا ہوں۔'' شائل نے بے دلی سے کہا۔

''میں کینٹین جا رہی ہوں........ میرے ساتھ چائے پیو گے؟'' اُس نے بہت نرمی سے کہا۔

''نہیں، تم جاؤ۔ مجھے کچھ کام ہے۔'' شائل نے بہانہ بنایا۔ وہ کچھ دیر کھڑی سوچتی رہی، پھر نارمل انداز میں بولی۔

''او کے، ٹھیک ہے۔ ویسے آج میرا برتھ ڈے ہے۔ کچھ دوستوں کو ٹریٹ دی ہے۔ تم آؤ گے تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔'' پیار سے کہتی ہوئی عتیقہ عثمان کینٹین کی طرف جانے لگی اور شائل اسے دیکھتا رہا۔ وہ ماہا کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے اسی طرح کھڑے کھڑے دو گھنٹے ہو گئے تھے۔

اسٹاف روم میں پروفیسرز کی کوئی میٹنگ چل رہی تھی، پچھلے دو گھنٹے سے۔ شائل اس میٹنگ کے ختم ہونے کا منتظر تھا۔ بڑی دیر بعد یہ میٹنگ ختم ہوئی اور ماہا سامنے سے آتی نظر آئی۔ شائل اس سے ملنے کے لئے آگے بڑھا لیکن اگلے ہی لمحے اس کے قدم زمین میں گڑ گئے۔ کیمسٹری کے پروفیسر انعام علی، میم ماہا کے ہمراہ آ رہے تھے اور دونوں کے چہرے پہ مسکراہٹ تھی۔ ماہا ان کے ساتھ چلتے ہوئے بہت خوش لگ رہی تھی اور پروفیسر انعام کے قہقہوں کی آواز تو شائل کو دور تک آ رہی تھی۔ یہ منظر شائل کے لئے بے حد کرب ناک تھا۔

وہ وہیں کھڑا کا کھڑا رہ گیا اور اس نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں کے سامنے پروفیسر انعام ماہا کی گاڑی کی فرنٹ سیٹ پہ بیٹھے ہیں اور ماہا گاڑی یونیورسٹی سے باہر لے گئی ہے۔

''سمجھتی کیا ہے خود کو، کسی ریاست کی شہزادی ہے؟........ پوری دنیا کو اپنی توجہ رہتی ہے لیکن جسے اس کی توجہ کی ضرورت ہے، اسی کو اگنور کر رہی ہے........ پھول لایا تھا میں اس کے لئے اور اس نے مجھے دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔''

غصے میں بڑبڑاتا وہ بے دھیانی میں گیٹ کی جانب مڑنے لگا اور چلتے چلتے اس کے ذہن میں عتیقہ کا خیال آیا اور اس خیال کے آتے ہی اس کے پاؤں کینٹین کی طرف مڑ گئے اور اگلے ہی پل وہ کینٹین میں تھا۔ عتیقہ کچھ سہیلیوں کے جھرمٹ میں بیٹھی کیک اور پیزا سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی مسکرائی۔

''ارے، آؤ نا شائل!''

وہ ان کی طرف بڑھ گیا۔ اور پھر کچھ ہی دیر میں ایک ایک کر کے سبھی لڑکیاں اٹھ گئیں۔ بس وہ اور شائل رہ گئے۔

''مجھے یقین تھا شائل! کہ تم واقعی آ جاؤ گے۔ تھینکس اے لوٹ۔ کھاؤ نا یہ پیزا۔

پیپسی منگواؤں؟''

''نہیں........ پیزا بہت ہے۔'' شائل نے مسکرا کے کہا۔''تم نے اتنے پیار سے بلایا تھا، کیسے نہ آتا۔تمہارے لئے کچھ لایا بھی ہوں۔'' شائل نے اپنے بیگ میں ہاتھ ڈالا اور کچھ ہی دیر میں اس کے ہاتھ میں وہ گلاب آ گیا جو پلاسٹک میں لپٹا تھا۔اس نے وہ نکالا اور عتیقہ کی طرف بڑھایا۔

''بہت مبارک ہو سالگرہ۔''اس نے مسکرا کے کہا۔

اس کے ہاتھ سے پھول لے کر عتیقہ کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ یقیناً میم ماہا کا دیا یہ آئیڈیا کمال کا تھا۔شائل اور وہ پھر دیر تک کینٹین میں بیٹھے باتیں کرتے اور مسکراتے رہے۔ واپسی پر بھی وہ اس کے ہم قدم ہو کے چل رہا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا مگر سردیوں کی سفید چادر ماحول پہ چھائی ہوئی تھی۔آسمان پہ بادل بھی تھے۔

''بہت اچھا لگا تمہاری کمپنی میں وقت گزارنا۔''عتیقہ نے کہا۔

''زندگی بہت مختصر ہے۔ اس میں خوشیوں کے دن بہت تھوڑے ہوتے ہیں۔ نجانے لوگ کیوں اپنی عمریں یونہی گنوا دیتے ہیں۔ بے وجہ سی باتوں میں آ کر، بے معنی سے خدشوں میں گھر کر محبتوں کو ٹھکرا دیتے ہیں۔'' شائل نے اُداسی سے کہا۔

''محبت کسی سے کچھ چھینتی نہیں ہے شائل! محبت تو ہمیشہ دیتی ہے، دان کرتی ہے۔ نیا نظریہ اور نئی نظر بخشتی ہے۔محبت اگر سچی ہو تو اسے ٹھکرانے کی ہمت کسی میں نہیں ہوتی۔''عتیقہ نے سنجیدگی سے کہا۔

''محبت ہر کسی کو نیا تجربہ دیتی ہے۔ میرا تجربہ کچھ زیادہ اچھا نہیں۔'' شائل کے ہونٹوں پر تمسخرانہ ہنسی در آئی۔

''تم شاید صحیح طرح سے دیکھ نہیں پائے شائل! محبت تو انسان کو مثبت بناتی ہے۔ منافقت محبت میں ہوتی ہی نہیں۔ تجربہ تو میرا بھی زیادہ اچھا نہیں لیکن مجھے میری محبت نے جھکنا یا گرنا نہیں بلکہ ہمت سے اُٹھنا اور شکست تسلیم نہ کرنا سکھایا ہے۔''عتیقہ کے لہجے میں یقین تھا۔

''حیرت ہے، ناکامی نے بھی تمہیں بامرادی دی ہے۔'' وہ پھر اُداسی سے بولا۔

''میں نے اپنی ناکامی کو بامرادی بنایا ہے۔ نارسائی سے رسائی بہتر ہوتی ہے۔

چاند ہر گھر میں روشنی کرنے خود تو نہیں آتا نا۔ اس کی سمت کھلنے والی کھڑکیاں کھولنی پڑتی ہیں، تب جا کے اس کی چاندنی کا کوئی ٹکڑا مل پاتا ہے۔''

شائل حیرانی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ دبو سی لڑکی کتنی بڑی بڑی باتیں کر رہی تھی۔ مفکروں والی۔

چاند........کھڑکی........چاندنی کا ٹکڑا۔

وہ اُس کے الفاظ کے چناؤ پہ حیران تھا۔

محبت کیا کچھ سکھا دیا کرتی ہے۔



''خان!........ہمیں ہر قدم پہ تمہاری ضرورت ہے خان! ہم اس وقت تم سے کہہ نہیں پائے کہ مت جاؤ۔ لیکن خان! تمہارے بناء ہم کچھ نہیں۔ تم ہمارا دایاں بازو ہو۔'' ٹیلی فون ہاتھ میں تھامے کاریڈور میں کرسی پہ بیٹھے وہ لانگ ڈسٹنس کال پہ وارث سے مخاطب تھے۔

''ایسا کیا ہو گیا ہے سردار صاحب؟........مہرو بی بی تو ٹھیک ہیں نا؟'' وارث کے ذہن کا پرکار مہرو کے نقطے پہ ہی کھڑا ہو جاتا تھا، اس سے آگے وہ کچھ سوچ ہی نہیں پاتے تھے۔

''مہرو تو ٹھیک ہے وارث! بخیر و خوبی اس کی شادی بھی ہو گئی۔ چھ سات ماہ گزرنے کے باوجود بھی اس کی طرف سے کوئی شکایت نہیں آئی۔ لیکن وارث! زین گھر سے کہیں چلا گیا ہے۔ ہم نے اسے ڈھونڈنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن وہ نہیں ملا۔''

''کیا؟........زین تو مری میں تھا نا سردار صاحب! وہ کہاں چلا گا؟'' وارث نے حیرت سے پوچھا۔

''ہم اسے مری سے واپس لے آئے تھے۔ دراصل اس نے کسی کے بہکاوے میں آ کے ڈرگز استعمال کرنا شروع کر دی تھیں۔ پرنسپل کی اطلاع پہ ہم خود جا کے اسے لے آئے اور فقط ایک ہفتے بعد ہی وہ یہاں سے فرار ہو گیا۔ اب نجانے وہ کہاں ہے؟ کس حال میں ہے؟'' سردار صاحب کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔

''او مائی گاڈ!........سردار صاحب! اتنا کچھ ہو گیا اور آپ نے مجھے اطلاع ہی نہ دی۔ اتنا پرایا تو میں نہ تھا۔''

''ہمت نہیں تھی تم سے آنکھ ملانے کی۔ ہمارے بچوں کو تم ہی نے سنبھالا اور تمہارے جانے کے بعد ہم چند ماہ بھی سنبھال نہ سکے۔ کیسے باپ ہیں ہم وارث!''

سردار صاحب رو رہے تھے۔

''آپ نے پولیس میں رپورٹ کروائی ہے سردار صاحب؟ ٹی وی، اخبارات میں زین کی تصویر دی؟'' وارث تڑپ ہی تو اٹھے تھے۔ مہرو کے بعد زین ان کے لئے بہت اہمیت رکھتا تھا۔

''اپنی بدنامی سے ڈرتا ہوں وارث! جس سیاسی پوزیشن پہ ہوں، میں زین کی یہ خبر میڈیا کو نہیں دینا چاہتا۔ تمہی بتاؤ، میں کیا کروں؟ ....آ جاؤ تم خان! تمہارے بغیر ہم کچھ بھی نہیں۔'' سردار صاحب کی آنکھوں سے زار و قطار آنسو بہنے لگے تھے۔ تبھی ان کے دروازے پہ زوردار دستک ہوئی۔

''ہولڈ رکھنا خان! دروازے پہ کوئی ہے۔'' سردار صاحب نے ریسیور کریڈل کے اوپر ہولڈ پہ رکھا اور دروازہ کھولا۔ سامنے باوردی پولیس آفیسر کھڑا تھا اور اس کے ساتھ سردار صاحب کے پرسنل گارڈز اور سیکرٹری۔ دو پولیس کے سپاہی بھی تھے۔

''سردار واجد صاحب! ہمارے پاس آپ کی گرفتاری کا وارنٹ ہے۔ آپ پہ کرپشن، مرڈرز اور غیر ملکی ایجنسیوں سے خفیہ پلاننگ کا الزام ہے۔ یو آر انڈر اریسٹ۔'' پولیس آفیسر کی یونیفارم کی جیب پہ ملٹری پولیس کا مونو تھا۔

''ہمارے ساتھ آئی ایس آئی کے لوگ بھی ہیں۔ آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہو گا۔'' پُراعتماد پولیس آفیسر کی بات نے سردار صاحب کے گویا رونگٹے کھڑے کر دیئے۔ وہ حیرت اور افسوس بھری آنکھوں سے انہیں دیکھتے رہے۔ جانتے تھے کہ ان سے اُلجھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہ ان کے دشمنوں کی چلی کوئی چال ہے۔

''میں ابھی آیا۔'' سردار صاحب یہ کہہ کے دروازے پہ کھڑے آفیسرز کو چھوڑ کے فون کے پاس آئے۔

''خان! تمہاری واپسی اب اور بھی ضروری ہو گئی ہے۔ آئی ایس آئی اور ملٹری پولیس کے افسران مجھے گرفتار کرنے آ گئے ہیں۔ میں تم سے رابطے میں رہوں گا۔ زین اور مہرو کو سنبھالنے کے لئے آ جاؤ وارث! میری التجا ہے تم سے۔'' سردار صاحب خاصی عجلت میں بولے۔ وارث کے لئے ایک کے بعد دوسرا دھچکا تھا گویا۔ ان کا دھیان فوراً چوہدری ساجد کی طرف گیا۔

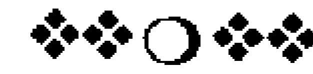
"آپ فکر نہ کریں سردار صاحب! میں جلد ہی آنے کی کوشش کروں گا۔ زین اور آپ کو یا مہرو بی بی کو کچھ نہیں ہوگا۔" وارث نے بھرپور اعتماد سے کہا۔

"اچھا وارث! چلتا ہوں۔ نجانے آگے قسمت میں کیا ہو۔ فی امان اللہ۔" سردار صاحب نے تاسف سے کہا۔

"انشاء اللہ سب بہتر ہوگا۔ آپ فکر نہ کریں۔" وارث نے کہا۔ سردار صاحب وارث کا فون سن کر پولیس آفیسر کے پاس گئے اور اپنی گرفتاری دے دی۔

اگلے ہی دن تمام اخبارات اور ٹی وی چینلز پہ چیف منسٹر کی گرفتاری کی خبر زبان زد عام تھی۔

مہرو کے لئے زندگی کے مسائل کم تکلیف دہ نہ تھے کہ اب بابا کی گرفتاری۔ اور زیب، وہ بھی دکھ سے ٹوٹ رہی تھیں۔ مشکلات نے اچانک ہی دروازوں پہ دستک دی تھی۔ کوئی راستہ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

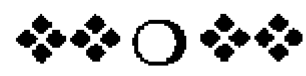


بابا کی گرفتاری نے مہر النساء کو مزید توڑ دیا۔ فرزانہ، سلمان اور دیگر گھر والوں کے مظالم اور زیادہ بڑھ گئے۔ سلمان تو اوّل دن سے ہی کھلے عام عیاشی کرتا تھا، اب مہرو پہ اس کا ہاتھ بھی اُٹھنے لگا تھا اور یہ تقریباً ہر دوسرے دن کا معمول بن گیا تھا۔ وہ اسے جانوروں کی طرح مارتا تھا۔ مہرو خاموش رہتی تھی۔ جانتی تھی اس کی مدد کے لئے آسمان سے کوئی فرشتہ نہیں اترے گا۔

فرزانہ نے اس کے تمام زیورات، کیش اور بانڈز پہ قبضہ کر لیا تھا اور چوہدری ساجد، سردار صاحب کی تمام فیکٹریوں کا مالک بن بیٹھا تھا۔ گویا ان کا تمام پلان کامیاب ہوا تھا۔ زین منظر عام سے غائب تھا۔ وارث بھی نجانے کہاں تھے اور مہرو کو اپنے والد سے جیل میں ملاقات کرنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ قصرِ زیب کے تمام پرانے ملازمین کو نکال کے چوہدری سلمان نے اپنے بندے رکھ لئے تھے اور مقدس سا قصرِ زیب اس کی عیاشیوں کے لئے استعمال ہو رہا تھا۔ مہرو اور فیکٹری کے شیئرز پر بھی وہ قابض ہو گیا تھا۔ ذہنی اور جسمانی طور پہ مہرو بھی مقابلہ کرنے کے قابل نہیں

تھی۔ اسے تقریباً روز ہی فرزانہ خواب آور انجکشن لگا دیا کرتی تھی اور مہرو کی دنیا فقط ایک کمرے تک محدود ہو گئی تھی۔ وہ نہ سوچنے سمجھنے کی سکت رکھتی تھی اور نہ مقابلہ کرنے کی ہمت۔

اخبارات اور میڈیا سردار صاحب کے خلاف بیانات دے رہا تھا اور یہ تمام کی تمام صورتحال زیب کو پریشان کر رہی تھی۔ وہ اپنے شوہر اور بچوں کے لئے تڑپ رہی تھیں۔ جھوٹے الزامات تلے جیل کی کوٹھڑی میں بند ان کا سہاگ اور تنکا تنکا بکھرتا ان کا آشیانہ۔ ایک کھویا ہوا بچہ اور دوسری دشمن کے گھر میں لمحہ لمحہ خطروں کا سامنا کرتی بیٹی۔ زیب کے اندر کی ماں رو رہی تھی۔ تڑپ رہی تھی۔



شہرین کے ہی گھر میں منگنی کی مختصر سی تقریب رکھی گئی تھی۔ ہمایوں کی بہن، بھائی اور والدہ اور شہرین کی کچھ سہیلیاں اور زیب۔ یہ منگنی کی تقریب کم اور فیملی ڈنر زیادہ لگ رہا تھا۔ کاسنی رنگ کے لباس میں ملبوس شہرین بہت الگ اور خوبصورت لگ رہی تھی۔ اور سیاہ سوٹ میں ہمایوں بھی کسی ریاست کا شہزادہ محسوس ہو رہا تھا۔ کھانے سے تھوڑا پہلے ہمایوں نے اپنی ریاست کی مخروطی انگلی میں وہی ہیرے کی انگوٹھی پہنا دی اور اس کے کان کے قریب اک سرگوشی کی۔

"اب تو قبول ہے نا یہ انگوٹھی؟........اب تو ٹھیک ہے نا اسے پہنانے کا طریقہ؟"

اور شہرین اس کے جواب میں شرما کے مسکرا دی۔

کھانے کے بعد ایک ایک کر کے تمام لوگ چلے گئے۔ ہمایوں نے اپنی فیملی کو بھی پہلے ہی روانہ کر دیا تھا۔ چائے کا کپ تھامے وہ شہرین کے ہمراہ ٹیرس میں بیٹھا تھا۔

"اتنے خوبصورت اور اتنے اہم دن پہ بھی تم کچھ پریشان لگ رہی ہو شہرین؟" ہمایوں نے اسے خلاء میں دیکھتے ہوئے پایا۔

"نہیں........میں تو بہت خوش ہوں۔" وہ مسکرائی۔

"محبت کرتا ہوں تم سے۔ مجھ سے کچھ بھی نہیں چھپا سکتی ہو تم۔ بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟"

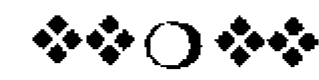
"سردار صاحب کی فیملی کے متعلق سوچ رہی ہوں۔ زیب آنٹی کی کیا فیلنگز ہو سکتی

ہیں۔ ان کا شوہر قید میں ہے، ایک بچہ لاپتہ ہے، دوسرا مظالم جھیل رہا ہے۔ فیکٹری، گھر، جائیداد، سب پہ قبضہ ہو گیا ہے اور وہ اتنی بے بس ہیں کہ کچھ کر بھی نہیں سکتیں۔'' شہرین نے افسردگی سے کہا۔

''کس نے کہا کہ وہ کچھ نہیں کر سکتیں؟ میرا خیال ہے وہی سب کچھ کر سکتی ہیں۔ یہ وقت گمنام رہنے کا اور مظالم برداشت کرنے کا نہیں۔ چپ چاپ اپنے گھر کو تنکا تنکا بکھرتے دیکھنے کا نہیں، کچھ کرنے کا ہے۔ میرا تو خیال ہے اگر وہ منظر عام پہ آ جاتی ہیں، اپنے گھر اور فیکٹریوں کی باگ ڈور سنبھال لیتی ہیں تو سردار صاحب کے دشمن کا کچا چٹھا سب کے سامنے آ جائے گا اور وہ پھر کچھ نہیں کر پائے گا۔'' ہمایوں نے یقین سے کہا۔ شہرین خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔

''اس صورتحال کا مقابلہ انہیں بہادری اور ہمت سے کرنا پڑے گا۔ اگر ان کا دشمن چالاک ہے تو ان کو بھی اپنا ذہن لڑانا ہو گا۔ منظر عام پہ آ کے ساری دنیا کو چونکانا ہو عدالت، جیل اور حکومت والوں کی اینٹ سے اینٹ بجانی ہو گی۔ اور اس کے لئے ہم ان کا ساتھ دیں گے۔ دیکھتے ہی دیکھتے چار ماہ گزر گئے۔ اب اور دیر کرنے سے سردار صاحب کو عمر قید یا پھانسی کی سزا بھی ہو سکتی ہے۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو ہمایوں! میں زیب آنٹی سے بات کروں گی۔ میرا خیال ہے یہی وقت ہے ان کے منظر عام پہ آنے کا اور اپنے گھر کو بچانے کا۔'' شہرین نے پُراعتماد آنکھوں سے کہا۔ اس کے لہجے میں یقین کی اِک کرن تھی۔



اور پھر شہرین نے اپنے ہی گھر پہ پریس کانفرنس منعقد کروائی۔

''زیب آنٹی! آپ نے بالکل ڈرنا یا گھبرانا نہیں۔ تھوڑی دیر کے لئے یہ بھول جائیں کہ سردار صاحب میں، آپ میں اور بچوں میں سترہ سالوں سے کوئی روابط نہیں تھے۔ اپنے دشمن کی چالوں پہ نظر رکھنی ہے، ان کا توڑ کرنا ہے۔ اپنوں کی فکر نہ کریں، اپنے سمجھ جاتے ہیں۔'' شہرین نے پریس کانفرنس سے قبل زیب کو سمجھایا۔ زیب نے گردن اثبات میں ہلا کے اسے یقین دلایا کہ میں پُر اعتماد ہوں، با یقین ہوں اور

صداقت پہ ہوں۔

ہلکے بادامی رنگ کے کپڑوں، شال میں لپٹی زیب سردار آج سترہ برس بعد دنیا کے روبرو تھیں۔ لوکل پریس اور میڈیا کے بہت سے لوگ وہاں موجود تھے۔ ان سب کے چہروں پر بھی بے انتہا حیرت تھی۔ سوال پہ سوال اٹھ رہے تھے۔

''آپ ایک لائم لائٹ پرسنالٹی تھیں۔ آپ کے مرڈر کی افواہیں تھیں، یہاں تک کہ آپ کے مرڈر کی اطلاعات کے بعد آپ کی میت کی تدفین بھی خود سردار صاحب کے ہاتھوں ہوئی تھی۔'' ایک صحافی نے سوال کیا۔

زیب مائیک پہ اعتماد سے بولیں۔

''وہ مرڈر، وہ افواہیں اور وہ تدفین فقط ایک سازش تھی۔ میرے دشمنوں کی طرف سے، سردار صاحب کے سیاسی حریفوں کی طرف سے۔ کسی بھی انسان کی ناقابل شناخت، جھلسی ہوئی لاش کو دفنا دینا کہاں ثابت کرتا ہے کہ وہ لاش زیب سردار کی ہی تھی۔ یہ تمام کی تمام پلاننگ تھی۔ مجھے میرے گھر سے بلانا، الزام تراشی، مجھے قید کر دینا اور پھر خودکشی کا ڈرامہ رچانا۔ مجھے ذہنی طور پر اس قدر ٹارچر کیا گیا تھا کہ میں دوبارہ منظر عام پہ نہیں آ سکتی تھی۔'' زیب نے جواب دیا۔

دوسرے صحافی نے بہت اعتماد سے پوچھا۔

''آپ کے شوہر کو کئی الزامات کے تحت گرفتار کیا گیا ہے۔ کرپشن، غیر ملکی ایجنسیوں سے مخبری اور ایک اہم پولیٹیکل شخصیت کا قتل کیس۔ اس کے علاوہ نیب کے چند کیسز، فیکٹری اور جائیداد بنانے کے متعلق۔ آپ اس بارے میں کیا کہیں گی؟''

''میں یہ کہوں گی کہ میرے شوہر بے گناہ ہیں۔ وہ مکمل طور پہ سیاسی شعور اور سمجھ بوجھ رکھنے والے سیاستدان، ایماندار اور اعتدال پسند انسان ہیں۔ ان کے حریف نے انہیں ذاتی، کاروباری اور سیاسی زندگی میں بہت دھوکے دیئے ہیں، دوستیوں کا ڈھونگ رچایا ہے ان کی محنت سے بنائی فیکٹریوں، جدوجہد سے حاصل کی کرسی پہ قبضہ کرنے کے لئے۔ اور اس گھناؤنی حرکت کے لئے وہ شخص سردار صاحب سے ان کی بیٹی تک حاصل کر گیا ہے۔ میں یہ کہتی ہوں کہ میرے شوہر کی سادگی سے فائدہ اٹھایا گیا ہے ان پہ جھوٹے اور بے بنیاد الزام لگا کے۔'' زیب نے یقین سے کہا۔

"آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ یہ سب ان کے سیاسی حریف چوہدری ساجد نے ہی کیا ہے؟ سیاست میں تو اور بڑے دشمن ہوتے ہیں۔" ایک خاتون صحافی نے سوال کیا۔

"اس میں کیا شک ہے کہ جو آپ کی تھالی میں کھاتا ہے، وہی چھید کرتا ہے۔ اور جو آستین میں پلتا ہے وہی سانپ بن کے ڈستا ہے۔ چوہدری ساجد بہت سالوں سے دوستی کی آڑ میں میرے شوہر سے دشمنی کرتا آیا۔ ثبوت یہی ہے کہ میرے شوہر کو گرفتار کروا کے ان کی فیکٹریز پہ قبضہ کر لیا۔ ان کے ذاتی گھر کے مالک بن بیٹھے۔ میری بیٹی کے ساتھ ہونے والے مظالم ثبوت ہیں۔ میرے اکلوتے بیٹے کی گمشدگی، تمام شیئرز پہ قبضہ۔ اور کیا ثبوت چاہئے آپ کو یا کسی بھی عدالت کو؟" زیب کے سوال پہ سبھی خاموش ہو گئے۔

"کیا آپ سیاست میں آنا چاہیں گی؟........ اپنے شوہر کی طرف سے لڑنا چاہیں گی؟" ایک اور سوال آیا۔

"میرا سیاست سے کوئی لینا دینا نہیں۔ نہ ہی میں سیاست میں آنا چاہتی ہوں۔ میں فقط اپنے شوہر کو بچانا چاہتی ہوں، ان کی بے گناہی ثابت کرنا چاہتی ہوں، اپنے بچوں کو انصاف دلانا چاہتی ہوں، اپنے بکھرے گھر کو سمیٹنا چاہتی ہوں، سردار صاحب کی محنت سے بنی جائیداد اور فیکٹریز کو غلط ہاتھوں سے واپس لینا چاہتی ہوں، میں اور کچھ نہیں چاہتی۔" زیب کا لہجہ جذبات میں ڈوبا تھا۔ آنکھیں نمی سے چمک رہی تھیں لیکن سر اٹھا ہوا تھا۔

اس پریس کانفرنس کی انہیں بہت پذیرائی ملی۔ ہر چینل نے اس کانفرنس کو دکھایا، ہر اخبار نے چھاپا۔

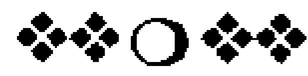
سردار صاحب کی پارٹی کے تمام ممبرز زیب کے گرد جمع ہو گئے اور آئندہ کا لائحہ عمل ترتیب دینے لگے۔ صحافیوں کے فون پہ فون آتے رہے۔ سیکورٹی ان کے گرد جمع ہو گئی۔

چوہدری ساجد، سلمان اور فرزانہ نے ٹی وی اسکرین پہ زیب کا چہرہ دیکھا تو حیرت سے ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ سردار صاحب کی گرفتاری پہ جو خوشی ان پہ

چھائی تھی، وہ ماند پڑ گئی۔

اور مہرو کی حیرت اور خوشی کی بھی کوئی انتہا نہیں تھی۔ وہ ہر بات جاننا چاہتی تھی۔ اپنی ماں کے گلے سے لگ کے اپنا ہر زخم دھونا چاہتی تھی۔ تڑپ رہی تھی ان بازوؤں میں آنے کے لئے۔ اور سردار صاحب........ ان تک جب یہ خبر پہنچی تو وہ کتنی دیر کے لئے ساکت و جامد ہو گئے۔ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہے؟ معجزہ یا پھر کرشمہ۔ کیا زیب واقعی زندہ تھیں؟........ کیا وہ تدفین زیب کی تدفین نہیں تھی؟........ یا یہ کوئی فرشتہ تھا جو زیب کے روپ میں ان کی مدد کو آ گیا تھا؟........ وہ نم آنکھیں لئے سجدے میں گر گئے تھے۔

جیل کی تنگ سی کال کوٹھڑی میں ایک روزن سا کھل گیا تھا۔ جس سے زندگی کی روشنی پھوٹ کے اندر آ رہی تھی۔



آج شائل، عتیقہ کے ہمراہ ساحل سمندر پہ آ گیا تھا۔ عتیقہ پچھلے کچھ دنوں میں اسے بہت اپنی اپنی لگ رہی تھی۔ ماہا کی طرف سے ٹھکرائے جانے کی اذیت اس قدر تھی کہ عتیقہ کی توجہ، اس کی اپنائیت، اس کا ساتھ مرہم کا کام کر رہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے ان پانچ چھ دنوں میں اسے عتیقہ کی اتنی زیادہ عادت ہو گئی ہے کہ اسے لگ رہا تھا وہ رہ ہی نہیں پائے گا اس کے بغیر۔ وہ ماہا کا دکھ بھی اس سے بانٹ رہا تھا۔ وہ فراخدلی سے سن رہی تھی۔

"پہلے بھی ہم ساحل پہ آ چکے ہیں۔ ہاکس بے کے ساحل پہ۔ یاد ہو گا تمہیں۔" عتیقہ نے پوچھا۔ وہ جو خلاء میں گھورے جا رہا تھا، متوجہ ہوا۔

"ہاں یاد ہے۔ وہی دن تھے جب میں نے ماہا کو چاہنا شروع کیا تھا۔" وہ اُداسی سے بولا۔

"ہاں۔ اور وہی دن تھے جب میں بھی محبت سے آشنا ہوئی تھی۔ محبت کے سازشی عمرو عیار کے چنگل میں پھنس گئی تھی۔" عتیقہ نے کھوئے کھوئے پن سے کہا۔

"محبت اور اس کا سازشی سفید پوش عمرو عیار۔ واہ عتیقہ عثمان! واہ، کیسی کیسی لفاظی

سیکھ گئی ہو محبت میں۔'' شائل مسکرایا۔

''تم بھی تو ادب و آداب، طور طریقے سیکھ گئے ہو۔ نرمی سے بولتے ہو، اپنائیت برتتے ہو۔ تمہیں بھی تو محبت نے بہت کچھ سکھایا ہے۔''

''ہاں...... محبت سب کچھ سکھا دیتی ہے۔ کبھی دل کی بستی پہ نیلے موسم کی طرح چھا جاتی ہے اور دل کی گلابی تتلیاں دربدر ہو جاتی ہیں، تو کبھی خود ہی محبت ان گلابی تتلیوں کو پھولوں کا وصال دیتی ہے۔ محبت سب کچھ سکھاتی ہے۔ اس ٹھاٹھیں مارتے، شور مچاتے سمندر کو دیکھو تو یوں لگتا ہے کہ جیسے یہ لہریں بھی ہماری ہی طرح کسی کی محبت میں تڑپ رہی ہیں۔ وصال کی خاطر کوشاں ہیں۔ لیکن محبوب بار بار انہیں ٹھکرا دیتا ہے۔ اور محبوب کا یہی ٹھکرانا ان کے جذبات کو اور بھڑکاتا ہے۔ اور یہ اس طرح شور مچا کے سمندر کے سینے کو زخمی کرتی ہیں۔ پتھروں سے اپنا سر ٹکراتی ہیں۔''

شائل کے لہجے میں جنون۔ شدت اور جذباتیت بیک وقت موجود تھی۔ عتیقہ اسے دیکھتی ہی رہ گئی۔

کچھ دیر وہ دونوں خاموش رہ کر لہروں کے شور کو اپنے اندر جذب کرتے رہے، خلاء میں ایک دوسرے کا کھو جانے والا ''کچھ'' ڈھونڈتے رہے۔ ساحلوں کی مغرور ہوا پہ نام لکھتے رہے۔

کناروں پہ جو بہتا ہے اسے دریا نہ سمجھو تم......!
کہ دریا کی روانی تو اسی شور تلاطم
اور بھنور سے جانی جاتی ہے
جہاں لہریں سفینوں کو اٹھاتی ہیں اور پٹختی ہیں
سو جانِ جاں! محبت بھی
کسی دریا کی صورت ہی سفر آغاز کرتی ہے
کنارے سے پتہ چلتا نہیں اس کے تلاطم کا
ہوا جب چھو کے چلتی ہے تو سب کچھ ٹھیک لگتا ہے
ہم اِک دُوجے کی چاہت میں کوئی دعویٰ جو کرتے ہیں
وہ رُوحوں میں اُترتے کیف کی تصدیق لگتا ہے

مگر یہ خوشنما باتیں، حسین و دلربا گھاتیں
کناروں سے نکلتے ہی تلاطم خیز موجوں کی روانی
اور بہاؤ میں کئی چہرے بدلتی ہیں
کہ دریائے محبت بھی
زمیں پہ بہنے والے دوسرے دریاؤں جیسا ہے!

''تم نے آج تک بتایا ہی نہیں کہ تم نے کس کی محبت کی چوٹ کھائی ہے؟........ میری تو ہر ہر چوٹ پہ مرہم رکھتی ہو، میرے ہر درد کی درماں بنتی ہو۔'' شائل نے مسکرا کے اس کی جانب دیکھا۔

''تم اس درد کو سہہ نہیں پاؤ گے۔ یہ چوٹ ہے ہی ایسی ظالم کہ جس کا علاج یا مرہم تمہارے پاس نہیں۔'' عتیقہ نے ذومعنی انداز میں کہا۔

''پھر بھی اس کا نام تو جان سکتا ہوں، اسے سمجھا تو سکتا ہوں کہ تم بہت اچھی لڑکی ہو اور ایک بہترین ساتھی کا کردار ادا کر سکتی ہو۔''

''سمجھا سکو گے اس کو؟'' وہ جتنا مسکرا رہا تھا، عتیقہ اتنی ہی سنجیدگی سے پوچھ رہی تھی۔

''کوشش تو کر سکتا ہوں۔'' وہ بولا۔

''نہیں مانے گا وہ...... اُسے کبھی احساس نہیں ہوگا میری محبت اور شدت کا۔''

''مجھے تو احساس ہے نا۔ میں تو اس تڑپ کو دیکھ سکتا ہوں تمہاری آنکھوں میں، جو میری آنکھوں میں ہے۔ میں تو جان سکتا ہوں کہ تمہاری روح میری طرح کس کرب سے گزر رہی ہے؟'' شائل نے اسے یقین دلایا۔ ''میں اس کو بتاؤں گا کہ وہ لڑکی تمہارے پیار میں دیوانی بن گئی ہے۔ اپنا حلیہ تبدیل کر بیٹھی ہے۔ بڑی بڑی باتیں کرنے لگی ہے، اس کی آنکھیں بجھ گئی ہیں، اس کی آرزوئیں مٹ گئی ہیں، اسے اپنا لو، اس کی محبت تمہیں آباد کر سکتی ہے۔ تمہیں مرنے کے بعد بھی زندہ رکھ سکتی ہے۔''

''تم کہو گے اسے یہ سب کچھ؟ ...... تم یقین دلا سکو گے اسے میری محبت کا؟'' عتیقہ نے سوال کیا۔

''ہاں...... بتاؤ مجھے اس کا نام، اس کا پتہ۔'' شائل نے اسے یقین دلایا۔

عتیقہ کچھ دیر اس کے چہرے کا طواف کرتی رہی، پھر خلاء میں دیکھتی رہی اور دوبارہ

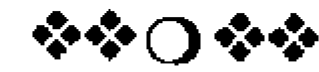
نگاہیں اس کے چہرے پہ مرکوز کر کے نہایت اطمینان سے بولی۔

"شائل علی...... یہ نام ہے اس کا۔"

اچانک کئے اُس کے اس انکشاف پہ شائل کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ حیرت سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

"بتانا اُسے کہ یہ پاگل لڑکی اسے پچھلے دو سالوں سے کتنا چاہتی ہے۔ اس سے کتنے خواب جوڑ کے رکھے ہیں اس نے۔ اس کی ایک جھلک کیسے منجمد لہو کو دوڑا دیتی ہے اس کی شریانوں میں۔ اس کے نہ ملنے کے تصور نے کیسے توڑ دیا تھا اُسے...... اُسے ضرور بتانا تم، ضرور سمجھانا اُسے۔" آنکھوں سے آنسو پھسل کے گرے تھے اور ملبوس میں جذب ہو گئے تھے۔

اُس نے اپنا ہینڈ بیگ اُٹھایا اور اپنے جوتے پہنے۔ آنکھوں سے آنسو صاف کرتی وہ آگے جانے لگی۔ شائل نے اُسے روکا نہیں، پکارا نہیں۔ خاموشی سے سمندر کی آتی جاتی لہروں کو دیکھ رہا تھا۔ ایک سمندر اور نیلا موسم اس کے دل پہ بھی چھایا تھا۔



"زیب آنٹی! آپ کے لئے فون ہے۔" زیب ٹیلی فون سے فارغ ہو کے کمرے میں آئی ہی تھیں کہ شہرین کارڈلیس لے کے دوبارہ اندر آئی۔

"تم بات کر لو شہرین! میں بہت تھک گئی ہوں۔" زیب مزید کسی صحافی کے سوالوں کا جواب دینا نہیں چاہتی تھیں۔

"وارث حسن خان کا فون ہے۔" شہرین نے مسکرا کے کہا۔

وارث کا نام سن کر زیب کی گویا تمام کی تمام تھکاوٹ دور ہو گئی۔ وہ کارڈلیس لے کے کچھ دیر خاموش کھڑی سوچتی رہیں کہ اتنے برسوں بعد وارث سے کس طرح گفتگو کا آغاز کریں۔

"ہیلو!" بہت ہمت جوڑ کر، طاقت جمع کر کے اس نے کہا۔

"مجھے یقین تھا کہ آپ زندہ ہیں۔ اتنے برسوں میں میرا یہ یقین ایک دن بھی لرزا نہیں۔" وارث کے پہلے جملے ہی جذباتی اور مکمل طور پہ محبت سے لبریز تھے۔

"خان!...... خان! تم کہاں ہو؟...... میں تمہیں کب سے ڈھونڈ رہی ہوں۔" زیب کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔

"میں لندن میں تھا۔ بڑی مشکل سے واپسی ہوئی ہے۔ حیدر آباد میں ہوں پچھلے دس دنوں سے۔ سردار صاحب سے خفیہ طور پہ دو ملاقاتیں ہوئی ہیں۔ میں ان کے دشمن کی نظروں میں نہیں آنا چاہتا۔ آپ کی پریس کانفرنس دیکھ کے میں بہت رویا ہوں زیب بی بی!...... آپ کہاں تھیں اتنے سال؟...... کہاں تھیں؟" وارث بھی بہت نم لہجے میں بولے۔

"بتا دوں گی۔ سب بتا دوں گی، مجھ پہ کیا بیتی، میں نے اپنے اوپر کیا کیا جھیلا، سب بتا دوں گی۔ تم ملنے آؤ گے؟"

"صبح سویرے ہی نکل پڑوں گا۔ اب ہمارے سردار صاحب پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ اب انہیں کچھ نہیں ہوگا۔" وارث پُر اعتماد تھے۔

"زین کا کچھ پتہ چلا وارث؟" ماں کے دل سے اک ٹیس اُبھری۔

"ہم اسے ڈھونڈنے کی بڑی کوشش کر رہے ہیں۔ اس بے چارے کو بھی نہیں بخشا اس کمینے چوہدری نے۔ اپنے کسی زرخرید کارندے کے ذریعے ہمارے ننھے سے زین بابا کو نشے کا عادی بنا دیا اس نے۔"

وارث کی اطلاع پہ زیب تڑپ اُٹھیں۔

"کیا؟...... وہ ٹھیک تو ہوگا نا خان؟" آنسو ان کی آنکھوں سے مسلسل بہہ رہے تھے۔

"آپ فکر مت کریں۔ میں زین کا پتہ لگا لوں گا۔ بس مہرو بی بی کو وہاں سے نکال لیں کسی طرح۔ یقیناً وہ بھی ان کے ظلم ہی سہہ رہی ہوں گی۔"

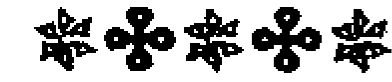
"میں سردار صاحب کے متعلق جاننا چاہتی ہوں خان!" زیب نے آنکھوں سے آنسو صاف کئے۔

"میں آپ کی ان سے ملاقات کروانا چاہتا ہوں۔ کل آپ کو لے چلوں گا میں سینٹرل جیل۔ آپ فکر مت کریں۔"

"وہ ملنا چاہیں گے مجھ سے؟...... معاف کر پائیں گے مجھے؟" دل میں کئی خدشے سر اُٹھا رہے تھے۔

"میں سردار صاحب کو اتنا قریب سے جانتا ہوں شاید کوئی نہیں جان سکتا۔ آپ کا منظر عام پہ آنا دنیا کو چونکا سکتا ہے، سردار صاحب کو نہیں۔ کیونکہ آپ ان گزرے برسوں میں ایک لحہ بھی ان کی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوئیں۔ وہ ہر چہرے میں آپ ہی کو تلاش کرتے تھے۔ میری طرح شاید یہ یقین انہیں بھی تھا کہ آپ یہیں کہیں ہیں، ہمارے آس پاس۔ وہ معجزوں پہ ایمان رکھتے ہیں۔"

پوائنٹس میں بولنے والے وارث خان اتنی تفصیل میں بتا رہے تھے۔ خوشی کے آنسو زیب کی آنکھوں میں چمکے۔ کچھ اور تفصیل اور باتوں کے بعد زیب نے فون رکھ دیا۔ وارث نے اگلے دن آنے کا وعدہ کیا تھا۔



غالباً صبح نماز کا وقت تھا کہ جب ان کے گیٹ پہ کسی گاڑی کا ہارن بجا اور سکیورٹی اہلکار نے شہرین کو بتایا کہ کوئی لڑکا زیب سردار سے ملنا چاہتا ہے۔ شہرین نے زیب کو جگایا اور دونوں گیٹ تک آئیں۔ ایک تیس بتیس سالہ باریش نوجوان ان کے سامنے کھڑا تھا۔

"السلام علیکم!....... میرا نام زاہد ہے۔ بدقسمتی سے میں چوہدری ساجد کا بڑا بیٹا ہوں۔ میں آپ کی بیٹی مہر النساء کو اپنے ساتھ لایا ہوں، آپ کے حوالے کرنے کے لئے۔" زاہد نے زیب کو بتایا۔

"ان کی حالت بہت خراب ہے۔ نجانے کس طرح کے کاغذات پہ دستخط کروانے کے لئے انہیں میرے بھائی اور ماں نے بہت مارا ہے، ان پہ بہت تشدد کیا ہے۔ مجھ سے ان کی حالت دیکھی نہیں گئی، اس لئے میں انہیں زخمی حالت میں ہی نکال لایا۔ وہ لوگ میرے پیچھے ہیں۔ آپ پلیز انہیں گاڑی سے نکالیں۔ تاکہ میں یہاں سے دور نکل سکوں۔" زاہد نے ملتجیانہ لہجے میں کہا۔

زیب، شہرین اور گارڈز کے ہمراہ فوراً گاڑی تک آئی۔ انہوں نے مل کے مہرو کو گاڑی سے زخمی حالت میں نکالا اور گھر کے اندر لے آئے۔

زیب نے زاہد کا بے حد شکریہ ادا کیا اور اندر آ گئیں۔ اتنے برسوں بعد زیب کی پہلی اولاد، ان کی صاحبزادی، ان کی مہر النساء ان کی آنکھوں کے سامنے تھی۔ وہ آنکھوں میں بند باندھتیں بھی تو کس طرح آخر؟

مہر النساء کے سر، چہرے اور گردن پہ چوٹوں کے نشان تھے۔ ناک سے مسلسل خون کی دھار بہہ رہی تھی اور وہ بے ہوشی کی حالت میں تھی۔ بکھرے ہوئے بال اور دریدہ لباس۔ زیب اسے دیکھ کر تڑپ ہی تو گئی تھیں۔ یہ اُن کی شہزادی تھی۔ اُن کی نازوں

سے پلی، وہ ننھی پری جو ان کی اور واجد کی محبت کی پہلی نشانی تھی، پہلا معجزہ تھی۔ وہ دونوں اس کی پیدائش کے بعد اسے ہاتھوں میں لئے کبھی ایک دوسرے کو تکتے تو کبھی بچی کو۔ اس کے ننھے منے ہاتھ پاؤں اور جسامت دونوں کے دل میں سرشاری کے کتنے احساس برپا کرتی تھی۔ ان کی وہ شہزادی آج کس حالت میں تھی۔ زیب کی آنکھوں سے زاروقطار آنسو بہہ رہے تھے۔

شہرین نے ڈاکٹر کو گھر بلوایا جس نے فرسٹ ایڈ کے طور پر علاج کیا، زخموں پہ پٹیاں باندھیں اور ڈرپ لگا دی۔ وہ بے ہوشی کی حالت میں مسلسل بڑبڑا رہی تھی۔

”بابا!......وارث......!“ وہ مسلسل ان دو ناموں کی گردان کر رہی تھی۔

زیب کا کلیجہ کٹ رہا تھا۔ ان سے اپنی نازک سی بچی کی یہ حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ نیم روشن کمرے کی کھڑکی سے لگی وہ بیڈ پہ لیٹی اپنی مظلوم بچی کو دیکھ رہی تھی کہ جب ثمین ہاتھوں میں چائے کا کپ اور ہلکا پھلکا ناشتہ لئے اندر آئی۔

”کچھ کھالیں زیب باجی! رات سے آپ نے کچھ نہیں کھایا۔“ ثمین نے متفکر ہو کے کہا۔

”کیا حال بنا دیا ہے ظالموں نے میری پھول سی بچی کا۔ اس کے نازک جسم پہ کیسا کیسا عذاب اُترا ہے، کیوں؟......کیوں دے دیا سردار صاحب نے اپنی بچی کو کسی ظالم کے ہاتھ؟......کیوں؟“ زیب بھیگے لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

”پروردگار کا لاکھ شکر ادا کریں کہ مہر النساء آپ تک پہنچ گئی اور کسی بڑے نقصان سے محفوظ رہ گئیں۔ ورنہ دشمن نے تو کوئی کسر نہیں چھوڑی۔“ ثمین نے انہیں تسلی دی۔

”کس طرح گزارے ہوں گے میری بچی نے یہ چھ ماہ اس عقوبت خانے میں۔ لمحہ لمحہ کس طرح گزرا ہوگا اس پر، خدا جانے۔ لیکن میں سردار صاحب سے اس بات کا جواب ضرور مانگوں گی کہ میں نے جو بچی انہیں سونپی تھی، اس کے ساتھ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟......کوئی باپ اپنی بچی کے ساتھ ایسا کس طرح کر سکتا ہے؟“ زیب کی آنکھیں نمی سے بوجھل تھیں۔

”حوصلہ رکھیں، اللہ نے یہاں تک سب بہتر کیا ہے تو آگے بھی ٹھیک ہی ہوگا۔“ ثمین نے اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھا۔ اسی وقت شہرین کمرے کے اندر آئی۔

”زیب آنٹی! وارث حسن خان آپ سے ملنے آئے ہیں۔ میں نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا ہے۔“

وارث کا نام سنتے ہی زیب کے چہرے پہ خوشی کی اک رمق دوڑ گئی تھی۔ انہوں نے جلدی سے چادر اپنے گرد لپیٹی اور ڈرائنگ روم کی طرف جانے لگیں۔

دروازہ کھولا تو وارث کو اپنے سامنے پایا۔ سیاہ رنگ کے کوٹ میں وہی وجاہت اور سنجیدگی، وہی پُروقار سراپا اور وہی انداز۔

”وارث......!“ اس کی آنکھیں نمی سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ وارث کی آنکھوں میں بھی مسرت کی لو جھلملانے لگی اور فرطِ جذبات سے ان کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔

”زیب بی بی......!“ وہ فقط یہی بول پائے۔

دونوں نے کتنے لمحے تو بے یقینی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ جب آنکھوں کو واقعی یقین آ گیا تو دونوں نے گفتگو کے سلسلے کی شروعات کی۔

”تم نے سردار صاحب سے میرے متعلق کوئی بات کی؟“

”آپ کو آج ان سے ملوانے لے جاؤں گا تو بات کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔“ وہ بولا۔

”کیا وہ مجھے معاف کر پائیں گے؟“ وہی پرانا خدشہ سینہ تانے کھڑا تھا۔

”آپ نے ایسا کون سا گناہ کیا ہے؟......مجھے شہرین بی بی نے سب کچھ بتا دیا ہے کہ کس طرح وہ پاگل خانے سے آپ کو یہاں لے آئیں۔“ وارث نے انہیں مکمل طور پر مطمئن کر دیا۔ ”اور میرا خیال ہے سردار صاحب کو ان تمام باتوں کی صفائی دینے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ وہ خود ہی آپ کا چہرہ پڑھ لیں گے۔“

”زین کا کچھ پتہ چلا؟“ زیب نے پوچھا۔

”میں نے اپنے تئیں ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی ہے۔ پولیس کو بھی انوالو کیا ہے۔ پہلے فیکٹری اور گھر ان لوگوں کے چنگل سے آزاد کرا لیں، پھر میں سکون سے زین کو تلاش کروں گا۔ آپ بے فکر رہیں، اسے کچھ نہیں ہوگا۔ اور مہرو بی بی......“ وارث کچھ کہتے کہتے رک گئے۔

”مہرو میرے پاس ہے......آج صبح چوہدری کا بڑا بیٹا زاہد مہرو کو یہاں چھوڑ

گیا۔۔۔۔۔۔وہ زخمی حالت میں تھی۔۔۔۔۔۔اس پہ بہت تشدد کیا گیا ہے۔'' زیب نے رک رک کرانہیں بتایا اور وہ تڑپ اٹھے۔

''میں اسے دیکھ سکتا ہوں زیب بی بی؟'' التجا میں اک اندرونی تڑپ تھی، پھر کچھ ہی لمحوں بعد وہ مہرو کے عین سامنے تھے۔

ان کے دل کی دھڑکن دگرگوں ہونا شروع ہو گئی۔ کیا یہ وہی لڑکی تھی، جسے بنا بتائے، جس سے بنا پوچھے آٹھ ماہ قبل وہ اسے تنہا چھوڑ گئے تھے؟ کیا یہ وہی چاند چہرہ تھا جو ان کے دل کی تاریکی میں محبت کی کرن بن کے چمکا تھا؟۔۔۔۔۔۔ یہ تو کوئی اور تھی۔ زرد چہرہ، کملائے ہونٹوں پہ جمی پپڑیاں، اندر دھنسی ہوئی آنکھیں، کمزور ہاتھوں کی اُبھری نسیں جن میں ڈرپ کی دوائی قطرہ قطرہ اس کے جسم میں منتقل ہو رہی تھی۔

''بابا!۔۔۔۔۔۔وارث!۔۔۔۔۔۔'' بے ہوشی میں اس کی زبان سے پھر وہی دو نام نکلے۔

وارث نے اپنے ہونٹ بھینچ لئے۔ ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ احساسِ جرم دل کو کچوکے مار رہا تھا۔

'مجھے آپ کو تنہا نہیں چھوڑنا چاہئے تھا مہرو!۔۔۔۔۔۔ میں نے آپ کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔' دور کہیں دل کی وادی سے آواز آئی۔

وہ کتنی دیر چپ چاپ کھڑے اپنی محبت کو اس حالت میں دیکھتے رہے۔



شائل آج مسلسل عنیقہ ہی کو سوچ رہا تھا۔ لاشعوری طور پر، نہ چاہتے ہوئے اس کا خیال بار بار کروٹ بدل رہا تھا۔ آنکھیں بند کرتا تو عنیقہ کی محبت سے جگمگاتی بند آنکھوں میں روشنی کی کرن کی طرح چھلک جاتیں۔ آنکھیں کھولتا تو اسی کی آواز کانوں میں بازگشت بن کے اُترتی۔ اُس نے کئی بار اس لڑکی کے خیال کو جھٹکنے کی سعی کی لیکن وہ خیال اس کے ذہن و دل سے گویا مقناطیس کی طرح چپٹ گیا تھا جس کی کشش سے روح بھی کھنچی جا رہی تھی۔ ماما کی یاد بھی گہری ہو چلی تھی۔ عنیقہ کی یاد، اس کا تخیل، اس کا چہرہ!۔۔۔۔۔۔شائل کی گھبراہٹ اب پریشانی کا روپ اختیار کرنے لگی۔

'یہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟' وہ خود سے پوچھنے لگا۔

اپنا دھیان بٹانے کے لئے اس نے کچھ لکھنے کی کوشش کی۔ کورے کاغذ پہ عنیقہ کا

چہرہ اُبھر آیا۔

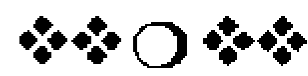
'واٹ اِز دِس؟۔۔۔۔۔ کیوں لکھ رہا ہوں میں اس کا نام؟' اس نے قلم کاغذ کے اوپر رکھ دیا اور کھڑکی کے پاس آ کے کھڑا ہو گیا۔ اپنا چشمہ اُتارا اور باہر چمکتے چاند کو دیکھنے لگا۔

'میں نے اپنی ناکامی کو بامرادی بنایا ہے۔ نارسائی سے رسائی بہتر ہوتی ہے۔ چاند ہر گھر میں روشنی کرنے خود تو نہیں آتا نا، اس کی سمت کھلنے والی کھڑکیاں کھولنی پڑتی ہیں، تب جا کے اس کی چاندنی کا کوئی ٹکڑا مل پاتا ہے۔' چاند کو دیکھتے ہی عنیقہ کی آواز کا اکو فضا میں پرواز کرنے لگا۔

'محبت سب کچھ سکھا دیتی ہے۔ کبھی دل کی بستی پر نیلے موسم کی طرح چھا جاتی ہے اور دل کی گلابی تتلیاں دربدر ہو جاتی ہیں، تو کبھی خود ہی محبت ان گلابی تتلیوں کو پھولوں کا وصال دیتی ہے۔ تم اس درد کو سہہ نہیں پاؤ گے۔ اس چوٹ کا علاج یا مرہم تمہارے پاس نہیں۔ شائل علی نام ہے اس کا۔' عنیقہ کی آواز گونج بن کے چاروں طرف پھیلتی رہی۔ الفاظ آپس میں گڈمڈ ہو رہے تھے، اُلجھ رہے تھے۔

'شائل علی نام ہے اُس کا، چاندنی کا کوئی ٹکڑا، گلابی تتلیاں، چوٹ، علاج، مرہم، پھولوں کا وصال، نیلا موسم، ناکامی کو بامرادی، کھڑکیاں کھولنی، شائل علی، نیلم موسم۔'' الفاظ کا الجھاؤ اسے تڑپا رہا تھا۔

اس نے تنگ آ کے کھڑکی زور سے بند کی۔ شیشے کے شفاف گلاس میں رکھا پانی پی گیا اور سونے کی سعی کرنے لگا۔



یہ داغ داغ اُجالا، یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کو مل جائے گی کہیں نہ کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل
کہیں تو ہو گا شب سست موج کا ساحل
کہیں تو جا کے رُکے گا سفینۂ غمِ دل

جیل کی بوسیدہ کوٹھڑی میں بیٹھے سردار صاحب کے چہرے پہ وارث کو سامنے دیکھ کر ایک رمق سی پھوٹی اور وہ فوراً اٹھ کر سلاخوں کے پاس آ گئے۔

”خان!........ میں دو دن سے تمہاری آمد کا کتنی شدت سے انتظار کر رہا ہوں۔ کہاں تھے تم؟“ ان کی آواز میں اِک تڑپ تھی۔

”کچھ کام تھا سردار صاحب! اس لئے رابطہ نہیں کر سکا۔ آپ ٹھیک تو ہیں نا؟“ وارث نے پوچھا لیکن سردار صاحب نے اس سوال کو یکسر نظر انداز کر دیا۔

”مجھے جیلر نے بتایا کہ میری بیوی زیب نے پریس کانفرنس کی ہے اور میرے اوپر لگے تمام الزامات کی تردید بھی۔ کیا وہ صحیح کہہ رہا ہے؟........ کیا واقعی زیب........ زندہ........؟“ الفاظ اٹک اٹک کے سردار صاحب کی زبان سے ادا ہو رہے تھے اور وارث کے ذہن میں بھی کوئی معقول جواب نہیں بن رہا تھا۔

”کیا آپ کو یقین ہے سردار صاحب! کہ زیب بی بی زندہ ہیں؟“ وہ بولے۔

سردار صاحب کی نفی میں ہلتی گردن اور نم آنکھیں کئی طرح کے احساسات میں گھری تھیں۔ وہ مسلسل نفی میں گردن ہلاتے رہے۔

”میں زیب بی بی کو اپنے ساتھ لایا ہوں سردار صاحب!“ وارث نے کہا اور سردار صاحب کی آنکھیں وارث کے چہرے پہ گویا منجمد ہو گئیں۔ وہ گنگ سے کھڑے ان کے چہرے کو دیکھتے رہے اور وارث کچھ دیر بعد وہاں سے چلے گئے۔ غیر مرئی نقطے پہ ٹکی آنکھوں کی پتلیوں میں فقط چند ہی لمحوں بعد زیب کا چہرہ تھا۔ زیب ان کے عین سامنے تھیں۔

بعد مدت اسے دیکھا لوگو
وہ ذرا بھی نہیں بدلا لوگو
خوش نہ تھا مجھ سے بچھڑ کر وہ بھی
اس کے چہرے پہ تھا لکھا لوگو

دونوں کی آنکھیں جامد سی، بہت خاموشی سے ایک دوسرے کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ دونوں ہی کے تاثرات کسی دوسرے تاثر سے ماورا تھے۔ وہ برسوں بعد ایک دوسرے کے سامنے تھے۔ دونوں اتنے سال ایک دوسرے کے ہو کر بھی نہیں

تھے۔ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے بھی تھے اور کٹے ہوئے بھی۔ دونوں زندہ تھے مگر دونوں ہی بہت دور تھے۔

”زیب!“ انہوں نے نیم تاریک کوٹھڑی کے اندھیروں سے آواز دی۔ زیب اپنے پاؤں گھسیٹتی اس قید خانے کی سلاخوں کے نزدیک آئی، جس کے اندر وہ شخص تھا جو اس کی متاعِ حیات تھا۔ جس کی خاطر اتنے برس وہ جی سکی اور نہ مر سکی۔ جس کو دیکھنے کی خاطر آنکھیں بند ہونا ہی بھول گئی تھیں، وہ سلاخوں کے نزدیک چپ چاپ کھڑی انہیں دیکھتی رہی۔

”زیب!........ یہ تم ہو؟“ وہ پھر اسی بے یقینی سے بولے۔ آنکھوں کے اوپر نمی کی اِک چادر سی تن گئی تھی۔ زیب بھی ضبط کرنے کے لئے ہونٹ بھینچے کھڑی تھیں۔ نمی آنکھوں میں سے پھسلنے کو تیار تھی۔ جسم میں اِک انجان سی کپکپی کا احساس تھا۔ ریڑھ کی ہڈی کے پاس اِک ٹیس سی اُٹھی تھی۔ سردار صاحب کی آنکھوں سے اب آنسو پھسل کے گرے تھے۔

”کچھ تو بولو زیب!........ یہ تم ہی ہو نا؟........ ہماری بے یقینی کو تمہاری آواز ہی دور کر سکتی ہے زیب!........ بولو، یہ تم ہی ہو نا؟“ وہ مسلسل رو رہے تھے۔

”جی سردار صاحب! یہ میں ہی ہوں۔“ فقط یہ بولتے ہی ان کے بھی آنسو پھسل کے گالوں پہ گر پڑے اور وہ اپنا سر سلاخوں پہ ٹیک کے زار و قطار رونے لگیں۔ سردار صاحب نے ان کے دونوں ہاتھوں پہ اپنے ہاتھ رکھ دیئے اور اپنا ماتھا بھی ان کے ماتھے ہی کے ساتھ سلاخوں سے ٹکا دیا اور دونوں دیر تک روتے رہے۔

اٹھارہ برس کی طویل جدائی کے بعد یہ پہلی ملاقات تھی۔

دونوں نے ہی سوچا تھا کہ شاید یہ ملاقات اب آسمانوں پہ ہی ہو، لیکن معجزہ تھا یا کرشمہ۔ دعاؤں کا پھل تھا یا ریاضتوں کا ثمر کہ وہ آج زمین پر ہی ایک دوسرے کے سامنے تھے۔

وقت و حالات کبھی ایک سے نہیں رہتے۔ اور اتنے برسوں بعد اس طرح کی صورتحال تھی کہ جسے سردار صاحب نے سمجھا تھا کہ وہ ان کا ساتھ چھوڑ گئی ہے، فنا کے ہاتھوں مجبور ہو گئی ہے، وہی زندہ حالت میں ان کے روبرو تھی۔

"کسی طرح سے ایک بار بتا دیتیں کہ تم زندہ ہو، کسی طرح سے مل لیتیں مجھ سے، کیا کر لیتا کوئی؟ .... کیا کر لیتا دنیا کا کوئی بھی فرد؟" بہت دیر بعد جب آنسو تھمے تو وہ بولے۔

"کون سا منہ دکھاتی آپ کو؟ دنیا نے کیا چھوڑا تھا ہمارے بیچ؟ میرے اپنوں نے تو میرا چھوٹا سا آشیانہ بھی جلا دیا۔" وہ غیر مرئی نقطے پہ اپنی آنکھیں ٹکائے بولیں۔

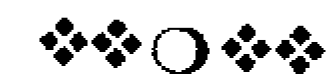
"دنیا نے کچھ نہیں بگاڑا۔ نہ ہمارے رشتے کا اور نہ ہمارے آشیانے کا۔ آج بھی میرے گھر کی سب سے اونچی منزل پہ سنہرے حروف میں لکھا ہے "قصرِ زیب" آج بھی وہ گھر، وہ بچے اور میں اتنے ہی تمہارے ہیں جتنے کہ پہلے تھے۔" سردار صاحب فرطِ جذبات سے بولے۔

"پاگل خانے کی دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر کئی بار مرنے کی کوشش کی۔ آخری دم تک اپنے آپ کو آپ کی نظر سے چھپا کے رکھنے کا تہیہ کر چکی تھی، لیکن میں اپنے بچوں کو اس طرح مرتے اور اپنے سہاگ کو اس طرح برباد ہوتے نہیں دیکھ سکی....... ہار گئی میں اپنے ہی ارادوں سے....... توڑ دیئے خود سے کئے سب سفاک وعدے۔" وہ بولیں۔

"لیکن کیوں؟....... ایسا کیوں کیا تم نے؟" سردار صاحب تیزی سے بولے۔

اور پھر زیب نے اس داستان کی شروعات کی۔ لفظ بہ لفظ ان کے گوش گزار کر دی وہ داستان۔ اس دن سے لے کر جس دن سے وہ ان سے بچھڑی تھی۔ جس دن سے اس سفاک جدائی کی ابتداء ہوئی تھی اور جیل کی یہ کوٹھڑی اِک لازوال محبت کی داستان اپنے کانوں سے سن رہی تھی۔

یہ اپنا عشق ہم آغوش جس میں ہجر و وصال
یہ اپنا درد کہ ہے کب سے ہمدم مہ و سال
اس عشق خاص کو ہر ایک سے چھپائے ہوئے
گزر گیا ہے زمانہ گلے لگائے ہوئے



"آپ کے لئے فون ہے زیب آنٹی! لاہور سے۔" شہرین نے سیاہ رنگ کا

کارڈلیس فون زیب کو تھما دیا۔ وہ جو وارث کے ہمراہ فیکٹری کے کاغذات دیکھ رہی تھیں، متوجہ ہو گئیں اور کارڈلیس تھام کے لمحہ بھر کو سوچا۔

"ہیلو زیب.......!" دوسری طرف جہاں آراء کی آواز تھی جسے وہ پہچان چکی تھیں۔

"میں ہوں، جہاں آراء، تمہاری بہن۔" وہ بولی۔

"پہچان گئی ہوں۔ کیسی ہو جہاں آراء؟" زیب کے حلق میں ایک کانٹا سا پھنسا۔ جہاں آراء وہ واحد ہستی تھی جس سے اتنے برس وہ ناتہ توڑ نہیں سکی تھیں۔ جہاں آراء کسی نہ کسی طرح ان کے حال سے باخبر ضرور رہتی تھیں۔

"میں ٹھیک ہوں لیکن....... تمہیں ایک خبر سنانی تھی۔" وہ بولی۔

"کیا؟"

"بانو بی....... انتقال کر گئیں۔" جہاں آراء نے ٹھہر ٹھہر کے کہا۔ زیب کی آنکھیں ایک نقطے پہ ٹھہر سی گئیں۔ کوئی لفظ ان کے منہ سے ادا نہیں ہوا۔

"کیا اسے تم نے میرے متعلق بتایا تھا؟" زیب نے کچھ بولنے کی سعی کی۔

"ہاں....... بتایا تھا۔ کچھ ہی دن قبل۔ اور پھر ان کی حالت مزید بگڑ گئی اور وہ کوما میں چلی گئیں۔ میں خوش ہوں کہ اتنے برسوں کی سزا کے بعد ان کی جان آزاد ہو گئی۔" جہاں آراء نے اپنی آنکھ میں آئی نمی کو روک دیا۔ زیب خاموش رہیں۔

"پچھلے اٹھارہ برس انہوں نے ہر ہر لمحہ تمہیں یاد کیا، تم سے معافی مانگی۔ احساسِ جرم اور گناہ کے سانپ انہیں ہر ہر لمحہ ڈستے رہے۔" جہاں آراء دھیمے لہجے میں کہتی رہی۔

"اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔" وہ فقط یہی کہہ پائیں۔

"تم نے انہیں معاف کر دیا ہے نا زیب؟" جہاں آراء نم لہجے میں بولی۔

"وہ میری ماں تھیں۔ اور میں بحیثیت اولاد کے ہمیشہ ان کی مغفرت کی دعا کروں گی۔" زیب کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔

"مہرو، زین اور سردار صاحب کیسے ہیں؟" جہاں آراء نے پوچھا۔

"سب بکھر چکے ہیں۔ سب کو سمیٹنے کی سعی کر رہی ہوں۔" زیب نے کہا۔

"پروردگار کرے تمہارا گھر دوبارہ سے بن جائے۔ تمہارے بچے، تمہارا آشیانہ تمہیں دوبارہ سے مل جائے۔" جہاں آراء کے دل سے دعا نکلی۔ پھر کہنے لگیں۔ "بانو

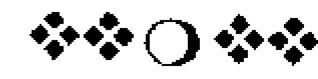
بی کی خواہش تھی کہ تم ان کی قبر پہ آ کے ان کے لئے دعا کرو۔ کیا تم ان کی آخری خواہش پوری کرو گی؟''

''کوشش کروں گی۔'' زیب نے یہ کہہ کر فون رکھ دیا اور کتنی دیر غیر مرئی نقطے پہ آنکھیں ٹکائے سوچتی رہیں۔

مکافاتِ عمل کا آغاز ہو چکا تھا۔ قدرت خود بدلہ لے رہی تھی۔ زیب کی آنکھوں میں دکھ کا موہوم سا تاثر بھی تھا اور اطمینان بھی۔ آنکھوں کے سامنے لگی بیت اللہ کی پورٹریٹ پہ آنکھیں ٹھہر گئیں۔ دور کہیں عصر کی اذان کی آواز بھی گونجی اور بیت اللہ کو دیکھتے دیکھتے زیب نے اپنی آنکھیں موند لیں۔

''اللہ اکبر........اللہ اکبر........''

اذان کی آواز ساعتوں میں گونجتی رب کی وحدانیت کی گواہی دیتی رہی۔



مہرو ابھی تک بے ہوش تھی۔ ڈاکٹر نے اسے نیند کا انجکشن دیا تھا۔ وارث وقتاً فوقتاً اس کی ڈرپ تبدیل کرتے اور اس کا ہر طرح سے خیال رکھتے۔ وارث کی اتنی شدید دلچسپی اور لگاؤ دیکھ کر زیب حیران تھیں۔

''ایک بات کہوں خان؟'' رات کے کھانے کے بعد ٹیبل پہ کسی سوچ میں گم وارث سے زیب بولیں۔

''جی کہیں زیب بی بی!''

''اگر قسمت ہمیں اپنی بیٹی کا ساتھی چننے کا موقع دیتی، تو ہماری نگاہِ انتخاب تم پر ٹھہرتی۔'' زیب کے کہے عام سے جملے پہ وارث کی آنکھیں ان کے چہرے پہ ٹھہر گئیں۔ وہ گنگ آنکھوں سے انہیں دیکھتے رہے۔

''آپ ایسا کیوں کہہ رہی ہیں زیب بی بی؟'' وہ فقط یہی بول پائے۔

''کیونکہ میرے نزدیک میری بچی کے لئے تم سے زیادہ بہتر اور کوئی ساتھی نہیں۔ تم اس کا خیال رکھتے آئے ہو۔ اس کے مزاج، اس کی عادتوں سے تم بخوبی واقف ہو۔ وہ تمہارے ساتھ بہت خوش رہ سکتی تھی۔'' وہی مطمئن کر دینے والا گہرا لہجہ، وہی اپنائیت۔

''نجانے کیوں سردار صاحب نے مہرو کے لئے غلط فیصلہ کیا۔ اور حیرت تو مجھے

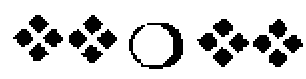
اس بات پہ ہے کہ تم نے بھی انہیں روکا نہیں۔'' زیب کے لہجے میں شکوہ تھا۔

''کیسے روکتا زیب بی بی! وہ والد تھے۔ بیٹی کے لئے کوئی بھی فیصلہ کرنے کا حق رکھتے تھے، میری حیثیت ہی کیا تھی؟''

''حیثیت تھی خان! حیثیت تھی۔ سردار صاحب کے بعد تم ہی مہرو کے سب سے زیادہ قریب تھے۔ تم نے مہرو کے ساتھ اتنے سال گزارے۔ تم نے اسے اور زین کو اتنے سال سنبھالا۔ تمہارا تو سب سے بڑھ کر حق تھا۔ اور پھر سردار صاحب نے فیصلہ کیا بھی تو کس کے حق میں، اپنے پرانے حریف اور دشمن کے حق میں۔ جس نے ہمیشہ ان کا برا چاہا، ان کے لئے برا کیا۔ دوستی کی آڑ میں ہمیشہ سردار صاحب کا نقصان کرتا آیا۔'' زیب کے لہجے میں غم و غصے کی کیفیت تھی۔

''انہیں تو ان کے انجام تک پہنچانا ہی ہے۔ بس مہرو بی بی ٹھیک ہو جائیں اور زین بابا مل جائیں، قصرِ زیب از سرِ نو آباد ہو جائے۔'' وارث نے دعا کی۔

''آمین! ثم آمین!'' زیب نے دھیمے سے کہا۔ اور پھر دعاؤں کی قبولیت کا وقت قریب ہی تو تھا۔



اور اگلے ہی دن وہ کورٹ کے اجازت نامے کے ساتھ قصرِ زیب کے دروازے پہ کھڑی تھیں۔ یہ وہ دہلیز تھی جسے چھوڑتے وقت انہوں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ وہ اس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بچھڑ جائے گی۔ یہ وہ در و دیوار تھے جو ان سے بچھڑنا نہیں چاہتے تھے لیکن وہ بے خبری میں ہی انہیں چھوڑ گئیں۔ لیکن وہ انہیں چھوڑ کر بھی ان سے اپنا ناتہ توڑ نہیں پائیں۔ وہ ہر ہر پل انہی در و دیوار میں بس یادوں کے سہارے زندہ رہیں۔ انہی کو یاد کرتی رہیں۔ اور آج قسمت نے انہیں ایک اور موقع دیا تھا۔ وہ ایک بار پھر انہی کواڑوں کے سامنے تھیں اور منتظر تھیں کہ وہ انہیں خوش آمدید کہیں۔

چوہدری سلمان کے پالتو کتے اور دوست قصرِ زیب میں موجود تھے۔ جن کے سامنے روبرو زیب اور وارث کھڑے تھے۔ پولیس کا ایک آئی ایس آئی بھی کورٹ کے آرڈرز کے ہمراہ ان کے ساتھ تھا جو وارث کا دوست بھی تھا۔

وہ تینوں تمام حق اور استحقاق سے چلتے ہوئے اندر آئے اور تمام نوکروں کو فوراً گھر چھوڑنے کا کہا۔ اندر آتے ہی ان کا واسطہ سلمان کے عیاش اور اوباش دوستوں سے پڑا جو لاؤنج میں رکھے صوفوں پہ آڑھے ترچھے بیٹھے تھے اور تاش کھیل رہے تھے۔ میز پر امپورٹڈ بیئر کی بوتلیں اور کھانے کا سامان رکھا تھا۔ وارث نے انہیں فوراً جگہ چھوڑنے کو کہا۔

"اُٹھو اور نکل جاؤ یہاں سے۔" وہ بولے۔

"کون ہو تم لوگ؟" ان میں سے ایک بولا۔

"اس گھر کے مالک ہیں ہم، جہاں تم لوگوں نے عیاشی کا یہ اڈہ کھولا ہوا ہے۔" وارث کے لہجے میں سختی آئی۔

"لیکن یہ گھر تو چوہدری سلمان کا ہے۔" دوسرا بولا۔

"اس کے باپ کا نہیں ہے۔ اس گھر پر قبضہ کیا ہے اس نے۔ چلو نکل جاؤ یہاں سے۔" وارث نے صوفے پہ رکھی لیدر کی جیکٹ اٹھا کے ایک لڑکے کی طرف اچھالی۔ ان میں سے ایک لڑکے نے موبائل فون نکال کے سلمان کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے سلمان نے فون اٹھالیا۔

"یار سنی! یہاں یہ پولیس کے ہمراہ کچھ لوگ آئے ہیں اور ہمیں نکل جانے کو کہہ رہے ہیں۔" وہ گھبراہٹ سے بولا۔

"کون لوگ ہیں؟" سلمان نے پوچھا۔

"کون ہو آپ لوگ؟" اس لڑکے نے وارث سے پوچھا۔ وارث نے آگے بڑھ کر موبائل فون اس سے چھین لیا۔

"تیرا دوسرا باپ ہوں میں۔ وارث حسن خان نام ہے میرا۔ اپنے ان کتوں سے بولو کہ ہمارے گھر سے نکل جائیں۔ سردار صاحب کی بیگم بمعہ کورٹ آرڈرز کے آ گئی ہیں۔" وارث نے اعتماد سے کہا۔

"دیکھ لوں گا میں تمہیں سردار کے چمچے! تمہیں بھی دیکھ لوں گا۔" سلمان نے اپنے دانت پیسے۔

"دیکھ لینا، غور سے، اگر مہلت ملے تو۔" وارث نے یہ کہہ کے فون واپس اس

لڑکے کو تھما دیا اور کچھ ہی دیر بعد وہ سبھی لوگ وہاں سے چلے گئے۔ قصرِ زیب ان کے ناپاک وجود سے خالی ہو گیا۔

زیب بے حد مسرور تھیں اپنے گھر میں آ کے، مکمل حق کے ساتھ، ایک مالکن کے روپ میں۔ انہوں نے پورے گھر کو سنوارنا اور سنبھالنا شروع کر دیا۔ وہ ہر ہر کمرے میں گئیں۔ ہر ہر کونے سے ملیں۔ ہر ہر دیوار سے بغل گیر ہوئیں اور کہتی رہیں کہ دیکھو! تمہاری زیب بی بی پھر لوٹ آئی ہے، کبھی نہ جانے کے لئے۔ وہ در و دیوار جو آج بھی ان کی خوشبوؤں میں رچے بسے تھے، ان کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ ان میں اک نئی جان آ گئی تھی۔ اِک نئی رمق بیدار ہو گئی تھی۔ وہ برسوں بعد مسکرا رہے تھے۔ وہ کسی بچے کی طرح ہر ہر کمرے میں دوڑی پھر رہی تھیں۔

قصرِ زیب کے باغیچے، دالان، کمرے سبھی ان کی آمد پر رقص کر رہے تھے۔ شہتوت، نیم اور انار کے پودوں پہ ننھے ننھے پھول کھلے تھے۔ گلاب کی کیاریوں میں کلیاں کھلی تھیں۔ آسمان نے سنہری دھوپ صحن میں پھیلا دی تھی۔

اچانک جاگ اٹھا ہے سارا گھر
دیوار، دروازے
دریچے، راہ داری
اور تمہاری میز پر رکھی ہوئی
یہ ساری تصویریں
بہت سی خوشبوؤں اور روشنیوں سے بھر گیا کمرہ
تم سفر سے لوٹ کر
کیا آ گئے ہو!

❖❖()❖❖

عالمِ بے ہوشی سے جب اس کی آنکھ کھلی تو آنکھوں کے سامنے وارث کا چہرہ تھا۔ عرصہ بند رہنے والی آنکھیں روشنی سے نامانوس تھیں۔ اس نے دوبارہ آنکھیں موند لیں اور پھر کھولیں۔ وارث اس کے سامنے تھے۔

اس نے اردگرد کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ ہاتھ میں قطرہ قطرہ ڈرپ کے ذریعے

منتقل ہوتی دوائی، نامانوس کمرہ اور وارث کا چہرہ، اس کی ناکام محبت کا چہرہ، شجرِ ممنوعہ کا چہرہ۔ اس نے سوچا شاید وہ عالمِ خواب میں ہے یا بے ہوشی میں یا پھر یہ آسمانوں کا منظر ہے۔ کیونکہ زمین پہ تو ان کا ملن ممکن ہی نہیں۔ وارث نے اس کی کھلتی، بند ہوتی حیران آنکھوں کو دیکھا اور مسکرائے۔

''نئی زندگی مبارک ہو مہرو بی بی!'' وہ بولے۔

مہرو اسی طرح خاموش انہیں دیکھتی رہی۔

''میری طرف ایسے کیا دیکھ رہی ہیں؟ میں وہی ہوں، وارث حسن خان۔ آٹھ مہینے میں، میں کوئی بدل نہیں گیا، ویسے کا ویسا ہی ہوں۔'' وارث نے مسکرا کے کہا۔

''میں کہاں ہوں؟'' ایک ہاتھ دماغ تک لے جا کے اس نے کچھ سوچنے کی کوشش کی۔ وہ بالکل بھی صورتحال کو سمجھنے سے قاصر تھی۔ وارث اس کے پاس رکھی کرسی پہ بیٹھ گئے اور اپنا ہاتھ اس کی پیشانی پہ رکھ کے اس کے اوپر جھکے۔

''آپ محفوظ جگہ پہ ہیں۔ یہ میرا گھر ہے اور آپ کا پسندیدہ شہر، حیدر آباد۔'' وارث نے بہت پیار سے کہا۔ ان کی خوشبو، ان کا لہجہ پل بھر میں مہرو کو گزرے تمام اذیت ناک دن یاد دلا گیا۔ اس نے اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اور پھر وہ کیسے بھول سکتی تھی کہ وارث نے کس طرح اسے چھوڑا تھا۔

''میں جانتا ہوں، آپ مجھ سے بہت ناراض ہیں۔ اور آپ کا ناراض ہونے کا حق بھی بنتا ہے۔ لیکن کم از کم اب آپ یہ اطمینان کر لیں کہ آپ اپنوں کے بیچ واپس آ گئی ہیں۔'' وارث نے کہا۔

''کون سے اپنے؟........ وہ، جنہوں نے مجھے دشمنوں کے حوالے کر دیا؟'' مہرو بے حد تلخی سے بولی۔

''ان دشمنوں نے آپ کے اپنوں کا کیا حال کیا ہے، جانتی ہیں؟ آپ کے والد کو کس طرح جھوٹے کیسوں میں پھنسایا، آپ کے ننھے سے بھائی کو کس طرح نشے کا عادی بنایا اور آپ کی ماں کو کس طرح جیتے جی مُردہ قرار دیا، جانتی ہیں آپ؟'' وارث کے لہجے میں دُکھ اور افسوس تھا۔ مہرو حیرت سے وارث کو دیکھتی رہیں۔

''کیا........ میری امی واقعی زندہ........؟'' مہرو اٹک اٹک کے بول رہی تھی۔

''زیب بی بی زندہ ہیں۔ کئی برس پاگل خانے میں گزارنے کے بعد ایک رحم دل لڑکی نے انہیں وہاں سے آزاد کروایا اور اب وہ اپنے بکھرے آشیانے کا تنکا تنکا جوڑنے کے لئے منظرِ عام پہ آئی ہیں۔ قصرِ زیب پہ سلمان چوہدری نے قبضہ کرایا تھا، کورٹ کے ذریعے شہرین بی بی نے نئے کاغذات بنوا دیئے۔ زین بابا گھر سے تین ماہ قبل فرار ہو گئے، ان کا کوئی پتہ نہیں۔ اور سردار صاحب جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہیں۔ چوہدری سلمان کا سوتیلا بھائی آپ کو زخمی حالت میں زیب بی بی کے حوالے کر گیا اور آپ کی حفاظت کے پیشِ نظر میں آپ کو یہاں حیدر آباد لے آیا۔'' وارث نے مختصر الفاظ میں مہرو کو تمام کہانی سنا دی۔ اور وہ خاموش نگاہوں سے اس تمام منظر نامے کے متعلق سوچتی رہی۔ اس کے خوبصورت سے گھر اور اس کے محبوب والدین کے ساتھ کیا کچھ ہو گیا تھا، اسے پتہ ہی نہ تھا۔ وہ گم صم سی آنکھوں سے وارث کا صبیح چہرہ دیکھے گئی۔

❖❖❖ ❖❖❖

وارث کی بھرپور توجہ اور دیکھ بھال سے مہرو فقط دو ہفتوں کے اندر بالکل ٹھیک ہو گئی تھی اور زندگی کی طرف لوٹ آئی تھی۔ وارث کا اسے کھانا کھلانا، دوائی پلانا، چھوٹی چھوٹی بے وجہ باتوں پہ اسے ہنسانا، چہل قدمی کی غرض سے اسے نزدیکی پارک لے جانا، اس کا بھرپور خیال رکھنا۔

مہرو نے جو چند ماہ عذاب جھیلا تھا، وہ اسے مکمل طور پہ فراموش کر رہی تھی۔ اس کے دل میں ایک نیا عزم اور ولولہ پیدا ہو گیا تھا۔ اپنے خاندان کے اور اپنے ساتھ ہونے والے تمام مظالم کا بدلہ لینے کا عزم۔

وہ ایک روشن اور خوبصورت صبح تھی۔ فروری کا شفاف چمکیلا مگر ٹھنڈا دن۔ مہر النساء سفید اور نیلے رنگ کے لباس میں ملبوس بے حد خوبصورت لگ رہی تھی۔ روشن اور خوبصورت چہرہ لئے وہ وارث کے سامنے تھی۔ وارث مبہوت سے اسے دیکھ رہے تھے۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟'' وہ مسکرائی۔

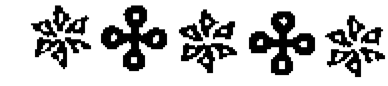
''آپ کو دیکھ کے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے بیتے دن لوٹ آئے ہیں۔ جب ہم سب لوگ اکٹھے تھے، قصرِ زیب کی پناہوں میں۔'' وارث بولے۔

''بیتے دن لوٹ آئیں گے وارث! آپ دیکھئے گا، ہم دوبارہ واپس لے آئیں گے ان دنوں کو۔ اپنے دشمنوں کو ان کے مقاصد میں کامیاب ہونے نہیں دینا۔ ان کو ہرانا ہے ہم نے۔ اپنا گھر سمیٹنا ہے ہم نے۔'' مہرو پُرعزم تھی۔

''تو پھر چلیں........شہرین بی بی ہماری منتظر ہوں گی۔''

''چلیئے، میں تیار ہوں۔'' مہرو نے مسکرا کے کہا اور وارث اور مہرو ہم قدم ہو کے پورچ میں کھڑی گاڑی کی طرف جانے لگے۔

اچھے دنوں کی نوید دیتی تتلی ان کے باغوں کی طرف سفر کرنا شروع ہو گئی تھی۔ نیلے موسم کے بادل چھٹ رہے تھے اور آسمان پہ شفاف دھوپ کی کرنیں بکھری تھیں۔



''صحت یابی مبارک ہو مہر النساء!'' شہرین نے مہرو کو دیکھ کے مسکرا کے اور اپنی دونوں باہیں پھیلا کر کہا۔ مہر النساء اس سے گلے ملنے لگی۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں اور بہت عرصے بعد خوش بھی۔'' خوشی مہرو کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔ شفاف چہرہ، چمکتی آنکھیں اور زندگی کا احساس اور زندگی کی یہ رمق صرف اور صرف وارث کی بدولت تھی۔

وارث جنہوں نے اسے دوبارہ زندگی دی تھی، اس کے مُردہ جسم میں روح پھونکی تھی، اسے خزاؤں کے شکنجوں سے نکال کے بہاروں کی پگڈنڈیوں پہ لے آئے تھے۔ اس کے ہر ہر زخم پہ اپنے مسیحا محبت کا مرہم رکھا تھا۔ اس کے ساتھ ہونے والے مظالم اور اسے چھوڑ جانے کے لئے اس سے معافی مانگی تھی اور اس سے کئے ہر ہر وعدے کو تجدید دی تھی۔ تجدید عہد وفا۔ اور مہرو ان کی محبت کی ان کلیوں میں لوٹ کر بہت خوش اور بہت مسرور تھی۔ دنیا نئی نئی سی لگنے لگی تھی اسے۔

''تم جانتی ہو نا کہ تمہیں کیا کرنا ہے؟'' شہرین نے پوچھا۔

''جی وکیل صاحبہ! آج مجھے آپ کے ایشو کئے ان کاغذات کی مدد سے اپنے بابا کی فیکٹریز کا چارج سنبھالنا ہے۔'' مہر النساء نے مسکرا کے کہا۔

''جی ہاں۔ اور ان کورٹ آرڈرز پہ تمہارے بابا کے دستخط بھی ہیں۔ اور انہوں نے اپنی غیر موجودگی میں فیکٹری کی ذمہ داری تمہیں سونپی ہے۔'' شہرین نے تہہ کیا ہوا کاغذ اسے تھمایا۔

''بہت شکریہ شہرین!'' وہ بولی۔

''شکریہ کی کوئی بات نہیں۔ تم میری چھوٹی بہن ہو۔'' وہ مسکرائی۔ ساتھ کھڑی ہوئی ثمین کے چہرے پہ بھی خوشی کی رمق تھی۔

''چلیں مہرو بی بی؟'' وارث نے پوچھا اور مہرو نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ دونوں ابھی جانے کے لئے دو قدم ہی آگے بڑھے تھے کہ شہرین نے مہرو کو بلایا۔ وہ رک گئی۔ شہرین اس کے پاس آئی اور اس کا ہاتھ تھام کے آہستہ سے بولی۔

''تمہاری خلع کے پیپرز میں نے جمع کروانے ہیں۔ ان پہ تمہارے سائن کی ضرورت ہے۔''

شہرین کی بات سن کر مہرو کے چہرے پہ لمحہ بھر کو اُداسی در آئی۔ شادی شدہ زندگی کی اذیت کا ایک ایک لمحہ اس کے ذہن میں آنے لگا۔ وارث نے اس کا ہاتھ تھاما اور وہ خود کو سنبھالنے میں کامیاب ہو گئی۔

''میں سائن کر دوں گی۔'' وہ بہت ہمت سے بولی۔

نئی زندگی تھی۔ نیا سفر تھا۔ اسے اب کوئی غم نہ تھا۔

''اپنا خیال رکھنا۔ اور زیب آنٹی کا بھی۔'' شہرین نے مسکرا کے کہا۔

''خیال رکھنے کا یہ جو ڈیپارٹمنٹ ہے، وہ میرا ہے۔ سبھی کا خیال مجھے رکھنا ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ ہدایت آپ مجھے دیں۔'' وارث نے شوخی سے کہا اور مہرو کا ہاتھ تھام کر آگے بڑھنے لگے۔

وہ دونوں ہم قدم ہو کر آگے ہی آگے بڑھنے لگے۔ شہرین اور ثمین دونوں کو جاتا ہوا دیکھتی رہیں۔

اور پھر اسی دن مہر النساء اپنے والد کی انڈسٹری پہنچیں۔ وارث اس کے ساتھ تھے۔ وہ پُر اعتماد تھی۔ بایقین، بامراد تھی۔

بہت شان سے چلتی وہ اس کیبن تک آئی جو اس کے والد کا تھا اور جس میں چوہدری ساجد بڑے حق سے بیٹھا تھا۔ گلاس ڈور کے پارٹیشن کے پار سے مہر النساء نے چوہدری کو دیکھا۔ نفرت اور حقارت کے احساسات دل میں زندہ ہوئے لیکن اب وہ ذرا بھی خوفزدہ اور گھبرائی ہوئی نہیں تھی۔ اسے اپنی ذات پہ، وارث پہ اور سب سے بڑھ کر اپنے خدا پہ پورا بھروسہ تھا۔ اسے یقین تھا کہ نیکی ہمیشہ بدی پہ غالب آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ظالموں کی رسّی دراز ضرور کرتا ہے لیکن بے حد خاموشی سے اس کو کھینچ بھی لیتا ہے۔

شیشے کا دروازہ کھول کے وہ اندر آ گئی تھی۔ کسی فائل پہ جھکے کچھ لکھتے ہوئے چوہدری نے اوپر دیکھا اور گویا اس کی آنکھیں حیرت سے منجمد ہو گئیں۔ اس کے سامنے مہر النساء اور وارث حسن خان کھڑے تھے۔ دونوں کے چہروں پر انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی۔

''اُٹھو اس کرسی سے۔'' مہر النساء نے بارعب آواز میں کہا۔

''تم کون ہوتی ہو مجھے اس کرسی سے اٹھانے والی؟'' چوہدری نے کہا۔

''ان تمام انڈسٹریز کی کیئر ٹیکر، ان انڈسٹریز کے مالک کی بیٹی۔'' مہرو نے پُر اعتماد جواب دیا۔

''ہونہہ........کون سا مالک؟ وہ جو سلاخوں کے پیچھے ہے؟'' چوہدری نے تضحیک کے انداز میں کہا۔

''نہیں جس نے بھی سلاخوں کے پیچھے پہنچایا ہے وہ عنقریب سامنے آ جائے گا۔ تم فی الحال اس کرسی سے اٹھو اور نکل جاؤ اس کیبن سے۔'' وہ تیز لہجے میں بولی۔

''تمیز سے بولو لڑکی! مت بھولو کہ میرا تم سے ایک اور رشتہ بھی ہے۔''

''رشتوں کی تم لوگوں نے دھجیاں بکھیر دیں۔ تم لوگوں کو رشتوں کے تقدس کا احساس کب سے ہو گیا؟........ اُٹھو اس کرسی سے۔ ورنہ میں پولیس کو بلاتی ہوں۔'' وہ دھاڑی۔

''کس بنیاد پہ بلاؤ گی پولیس کو؟'' چوہدری مسکرایا۔

''بنیاد میں اپنے ساتھ لائی ہوں........ یہ کورٹ کے آرڈرز ہیں، میرے والد کے دستخط کے ساتھ۔ اب دفع ہو جاؤ یہاں سے۔'' مہرو نے آرڈر والا عدالتی کاغذ اچھال کے چوہدری کے منہ پہ دے مارا۔ چوہدری نے جیسے ہی کاغذ اٹھا کے پڑھا، اس کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے۔ پیشانی پہ پسینے کے ننھے ننھے قطرے چمکنے لگے۔

''اُٹھتے ہو یا سکیورٹی گارڈ سے دھکے کھا کے نکلو گے؟'' مہر النساء اونچی آواز میں چیخی۔ چوہدری ہڑبڑا کے اٹھا اور کوٹ کے بٹن بند کرنے لگا۔

''گیٹ لاسٹ!'' مہر النساء چیخی اور انگلی سے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

چوہدری، وارث کی طرف غصے سے دیکھ کے باہر چلا گیا اور اس کے جاتے ہی مہرو کی

نظر خاموش کھڑے وارث پہ پڑی جو اتنی دیر سے چپ تھا۔

''آپ کیوں خاموش کھڑے ہیں وارث؟'' وہ بولی۔

''دیکھ رہا ہوں کہ زندگی جب دوبارہ ملتی ہے تو کتنی خوبصورت لگتی ہے۔ مظلوم جب زبان کھولتا ہے تو کتنا طاقتور ہو جاتا ہے۔ اور صحرا کی مٹی جب نم ہوتی ہے تو کتنی سیراب ہو جاتی ہے۔'' وارث اسی انداز میں دونوں ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔

''میں نے ٹھیک کیا نا وارث؟'' وہ بولی۔

''ارے آپ نے بہت زبردست کیا۔ اور ثابت کر دیا کہ آپ سردار صاحب کی بیٹی ہیں۔ حق کے لئے آواز اٹھانے والی۔ لیکن آپ ایک کام میں بہت دیر کر رہی ہیں۔''

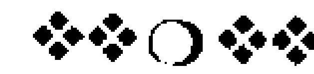
''کس کام میں؟'' وہ حیران ہوئی۔

وارث کرسی تک گئے۔ اسے اپنے ہاتھ سے جھاڑا اور پھر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

''آپ کی کرسی آپ کی منتظر ہے مس مہر النساء سردار!'' وہ مؤدبانہ بولے۔ مہرو مسکرائی اور اسی شان سے چلتی ہوئی کرسی کی آغوش میں بیٹھ گئی۔ وارث بہت خوش تھے آج۔ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے وہی سب دیکھ رہے تھے جو وہ دیکھنا چاہتے تھے۔

''آپ یہاں بیٹھ کے اکاؤنٹس کی فائلز دیکھیں، میں ورکرز کو بلاتا ہوں تاکہ آپ سے تعارف ہو جائے اور وہ دیکھ سکیں کہ ان کی نئی باس کتنی خوبصورت اور ذہین ہے۔''

وارث شرارت سے کہتے ہوئے گلاس ڈور عبور کر گئے اور مہرو مسکراتی رہ گئی۔



مجھے اچھا لگتا ہے
تمہی کو دیکھتے رہنا
تمہی کو چاہتے رہنا
تمہی کو سوچتے رہنا
بہت گہرے خیالوں میں
جوابوں میں، سوالوں میں
محبت کے حوالوں میں
تمہارا نام آ جانا

مجھے اچھا سا لگتا ہے
تمہارے سنگ سنگ چلنا
وفا کی آگ میں جلنا
تمہیں ناراض کر دینا
کبھی خود رُوٹھ بھی جانا
تمہاری بے رُخی میں بھی
تمہاری آرزو کرنا
خود اپنے دل کی دھڑکن سے
تمہاری گفتگو کرنا
بہت اچھا سا لگتا ہے......!

ڈرائیو کرتے ہوئے وارث نے بہت سرشار ہو کر ساتھ بیٹھی مہرو کی طرف دیکھا تھا۔ یہ لمحہ کتنے عرصے بعد آیا تھا کہ جب وہ گوہرِ یکتا اس کے سامنے، اس کے پاس بیٹھا تھا۔ اس کا چاند چہرہ آنکھوں کے سامنے تھا۔ اس کی روشن آنکھیں ہمیشہ کی طرح لو دے رہی تھیں۔ ان میں امیدوں کی جگمگاہٹ بھی تھی اور محبت کی چمک بھی۔ ان کی چمک دیکھ کے وارث کو یوں محسوس ہوا کہ جیسے سیف الملوک جھیل کی سطح پر سورج کی نازک سی کرنیں بکھر گئی ہوں اور جھیل کی سطح ننھی ننھی روشنی کی قندیلوں سے روشن ہو گئی ہو۔ مہرو کی آنکھیں بھی سیف الملوک کی شفاف سطح کی طرح جھلملا ہی تھیں۔ اس کے ہونٹوں پہ میٹھی سی مسکراہٹ تھی۔ شکوے گلے ڈھل جانے کے بعد والی شفاف اور پاک مسکراہٹ۔ وارث اسے دیکھتے ہی رہ گئے۔

''سامنے دیکھیں خان صاحب! گاڑی آگے چل رہی ہے۔'' مہرو نے ان کی توجہ ہٹانے کی غرض سے کہا۔

''ہمیں تو سوائے اس چاند چہرے کے کچھ نظر ہی نہیں آ رہا۔'' وارث نے سنجیدہ سے لہجے میں کہا۔ مہرو نے آنکھیں ونڈ اسکرین پہ جما لیں۔ اس کی شدت بھری آنکھوں میں دیکھنے کی ہمت نہ تھی۔

''کتنا اچھا ہے نا وارث! یہ سب کچھ...... یہ شہر، یہ جانی پہچانی سڑکیں، آپ کا

ساتھ اور اپنے گھر کا احساس۔ کچھ عرصہ قبل تو یہ احساس گویا ختم ہی ہو گیا تھا۔ زندگی کتنی خالی خالی ہو گئی تھی۔'' مہرو نے ٹھنڈی سانس بھر کے کہا۔

''بھول جائیں ان سفاک دنوں کو۔ یہ سمجھیں وہ عرصہ زندگی میں کبھی آیا ہی نہیں تھا۔ اب بس اچھا سوچیں، اچھا دیکھیں اور اچھے سے اچھا منصوبہ بنائیں۔ زندگی بہت خوبصورت ہے اور آپ زندگی سے زیادہ خوبصورت ہیں۔'' وارث نے سیٹ پہ رکھے مہرو کے سرد ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھا اور مسکرا کے کہا۔ وہ بھی جواباً مسکرا دی اور سیٹ کی پشت سے اپنا سر ٹکا کے آنکھیں موند لیں۔ وہ اس ماحول اور ان خوبصورت لمحوں کی خوشبو کو اپنی سانسوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بسا لینا چاہتی تھی۔ واپسی اور تقدیر کی مہربانی کے اس احساس کو دیرپا بنانا چاہتی تھی۔ وارث کے ساتھ کی یہ جانی پہچانی مہک سانسوں میں محبت کی حدت جگا رہی تھی۔ زندگی کا احساس دلا رہی تھی۔ اور وہ اس احساس سے سرشار تھی۔

''ہماری شہزادی کا محل آ چکا ہے۔'' وارث نے گاڑی کو بریک لگائے اور مہرو نے موندی ہوئی آنکھیں کھول دیں۔ آنکھوں کے سامنے اس کا قصرِ زیب کھڑا تھا۔ ہمیشہ کی طرح شاندار اور خوبصورت۔ سفید رنگ کی بلند عمارت کی سب سے اونچی جگہ پہ سنہری حروف میں ''قصرِ زیب'' کی تحریر جگمگا رہی تھی۔

لکڑی کے بنے قدیم طرز کے صدر دروازے کے اوپر سفید پھولوں اور سبز پتوں والی بیلیں لدی پھندی کھڑی تھیں۔ بہار کی آمد آمد تھی اور مہر النساء اپنے گھر لوٹ آئی تھی۔ وارث اپنی طرف والے دروازے سے اُترے اور دوسری طرف آ کر مہرو کا دروازہ کھول دیا۔ مہرو نے اُتر کر ایک بھرپور سانس لی اور اپنے گھر کی خوشبو کو اپنے اندر بسایا۔ نم آنکھوں اور خوشی سے مسکراتے ہونٹوں کے ساتھ وہ وارث کے ہم قدم ہو کے چلنے لگی۔ دروازہ عبور کر کے وہ اندر آئی اور اس نے دیکھا چھوٹے سے تالاب میں اس کی دونوں بطخیں تیر رہی تھیں۔ سبز تراشی ہوئی گھاس کے اوپر سنہری دھوپ کی کرنیں بکھری تھیں۔ وہ گھر کے اندر جانے والے دروازے کی طرف بڑھی ہی تھی کہ عصر کی اذان کی آواز فضا میں گونجی۔

''اللہ اکبر........اللہ اکبر........''

وہ سر پہ دوپٹہ اوڑھے اس عظیم رب کی شکر گزاری میں دل ہی دل میں اذان کے الفاظ دہراتی اندر بڑھی۔ وارث نے اس کے لئے دروازہ کھول دیا اور اندر آتے ہی مہرو کو اپنی ماں کی خوشبو محسوس ہوئی۔

آج کتنی من پسند خوشبوئیں اس کے اردگرد رقص کناں تھیں۔ وہ کتنی سرشار تھی۔

ہر طرف وہی خوشبو تھی جو اسے پہلے لاہور والے گھر کے در و بام، اپنی والدہ کے استعمال شدہ پیرہن، ان کے لکھے اوراق سے آتی تھی۔ ان کی ستار سے آتی تھی۔ قصر کے کونے کونے سے آتی تھی۔ آج اسی خوشبو کے احساس میں گھری وہ آگے چلتی جا رہی تھی۔ وہ خوشبو کا تعاقب کرتے کرتے مدہوشی کے سے عالم میں زینہ چڑھنے لگی۔ وارث نیچے ہی رک گئے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ مہرو اپنی ماں کو تلاش کر لے گی۔ اور مہرو اسی سرشاری اور نیم خوابی کے سے عالم میں چلتی چلتی اپنے کمرے تک آئی اور دروازہ کھولا۔ اس کا کمرہ اسی طرح تھا جیسے وہ چھوڑ کے گئی تھی۔ شیلف میں رکھی اس کی کتابیں، اس کے بچپن کے کھلونے بھی اسی طرح تھے۔ بستر پہ بچھی چادر کے اوپر رکھی اس کی بہت پرانی گڑیا بھی ویسی ہی رکھی تھی۔ دیواروں پہ لگی اس کی اور زین کی بچپن کی تصاویر بھی ویسی ہی تھیں۔

کمرے میں اندھیرا تھا۔ فقط کھڑکی کے فروسٹڈ گلاس میں سے ہلکی روشنی اندر آ رہی تھی۔ مہر النساء نے غور سے دیکھا، اسے کارپٹ پہ بچھا سفید رنگ کا جائے نماز نظر آیا اور اس کے اوپر کسی گہرے رنگ کی چادر میں لپٹا وجود۔ وہ یقیناً زیب ہی تھیں۔ مہرو نے دروازے کے داہنے طرف لگے سوئچ بورڈ کا بٹن آن کر دیا اور کمرہ مکمل طور پہ روشن ہو گیا۔ ایک ہی بٹن سے کمرے میں لگے تمام بلب اور فانوس روشن ہو گیا۔ زیب نے دعا کے لئے جو ہاتھ اٹھائے تھے، وہ چہرے پہ پھیر لئے اور مڑ کے دیکھا۔

مہرو کے چہرے پہ نظر پڑتے ہی وہ ممتا بھری مسکراہٹ لئے اُٹھ گئیں اور مہر النساء کی آنکھوں میں حیرت اور بے یقینی تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کی ماں اس کی آنکھوں کے سامنے تھی۔ وہ ماں جسے وہ کسی انجانی قبر کے اندر تلاشتی رہی۔ وہ ماں جسے وہ ہر ہر لمحہ اذیت میں پکارتی رہی۔ وہ ماں جس کے بناء زندگی کا ہر ہر لمحہ دُشوار گزار اور کٹھن گزرا۔

وہ آنکھوں میں نمی اور حیرت سمیٹے آگے بڑھی۔ زیب نے اپنی بانہیں اپنی لختِ جگر کے لئے پھیلا دی تھیں، جس کے بے ہوش وجود کو وہ کچھ دن قبل گود میں لئے رات بھر پیار کرتی رہی تھی اور جسے دامن میں سمیٹ کے اسے بے پناہ پیار دیا تھا، برسوں کی تشنگی مٹائی تھی، وہ بانہیں پھیلائے اپنی بیٹی کی منتظر تھی۔

''مہر النساء!'' زیب نے کپکپاتے ہونٹوں سے اس کا نام پکارا۔

''ماں!'' وہ تڑپ کے آگے بڑھی اور اپنی بچھڑی ماں کے سینے سے لگ گئی اور اس سینے سے لگ کے ممتا کی بے پناہ حدت روم روم میں منتقل ہونے لگی۔ زیب کے ہر ہر لمس سے ممتا کی تپش بیدار ہو رہی تھی۔ وہ ان بانہوں میں آ کے بے پناہ شدت سے آنسو بہانے لگی۔ زیب اس کے آنسو پونچھتی اور خود بھی روتی رہیں۔

''مداخلت کی معافی چاہتا ہوں لیکن خوشی کے موقع پہ آنسو نہیں بہاتے۔'' وارث مسکراتے ہوئے اندر آ گئے تھے۔ مہرو اور زیب ایک دوسرے سے الگ ہو گئیں اور دونوں اپنے اپنے آنسو پونچھنے لگیں۔

''تم ٹھیک ہو نا مہر النساء؟'' زیب نے مہرو کے گال پہ ہاتھ رکھ کے پوچھا۔ محبت کے یہ اظہار دیکھ کے جو اسے پہلے کبھی نہیں ملے تھے، مہرو کی آنکھوں سے آنسو تھم نہیں رہے تھے۔

''جی ماں! میں ٹھیک ہوں۔ آپ کیسی ہیں؟'' وہ اپنے آنسو روکتے ہوئے بولی۔

''اپنی بیٹی کو دیکھا ہے۔ میں بہت خوش ہوں آج۔'' زیب نے کہا۔

''آج آپ کی بیٹی نے آپ کے شوہر کی کرسی سنبھال لی اور تمام فیکٹریز اور ملز کا چارج اپنی تحویل میں لے لیا۔'' وارث نے خوشخبری سنائی۔ زیب نے بیٹی کا چہرہ تھام کے اس کی پیشانی پہ بوسہ ثبت کیا۔

''ہم جانتے تھے، ہماری بیٹی ضرور اپنے بابا اور ماں کے لئے کچھ کرے گی، اس مصیبت کے وقت میں ہماری بیٹی ضرور کچھ کرے گی۔'' زیب نے اس کا چہرہ تھامے کہا۔

''اب آپ ہمیں تنہا چھوڑ کے کہیں مت جائیں ماں! ہم لوگ آپ کے بنا نہیں رہ سکتے۔'' وہ ایک بار پھر ماں کے سینے سے لگ گئی۔

''نہیں میری جان! اب میں اپنے گھر اور تم لوگوں کو چھوڑ کے کہیں نہیں جاؤں گی، کہیں بھی نہیں۔'' زیب نے نم لہجے میں کہا۔

قصرِ زیب کے در و بام پہ پہلی مسکراہٹ آئی۔ وہ اپنے مالکوں کے ملنے پہ بے حد خوش تھے۔



سردار صاحب کا مقدمہ کورٹ میں زیرِ سماعت تھا۔ زیب اور مہر النساء نے چوہدری کے خلاف اور سردار صاحب کے حق میں کئی ثبوت اور گواہ اکٹھے کر لئے تھے۔ سردار صاحب کا وکیل بھی پُر اُمید ہو گیا تھا۔ اور مہر النساء کی گواہی نے تو گویا مقدمے کا پانسا ہی پلٹ دیا تھا۔ آج سماعت کا آخری دن تھا۔ فیصلے کا دن۔ زیب اور مہر النساء بھی کورٹ میں موجود تھیں۔ پریس اور میڈیا سے منسلک لوگ بھی وہاں تھے جو پے در پے مہرو اور زیب کے کمنٹس بھی لے رہے تھے اور ان کی تصاویر بھی لے رہے تھے۔ چوہدری کے وکیل کے لئے مشکل سچویشن یہ بن گئی تھی کہ سلمان چوہدری، فرزانہ اور چند لوگوں کی گواہی کی ایک بار پھر ضرورت تھی اور وہ مسلسل غیر حاضر رہے تھے۔ وارث نے چھان بین کے ذریعے پتہ لگایا تو اسے پتہ چلا کہ سلمان ملک چھوڑ کے بھاگ گیا ہے۔

سردار صاحب نہایت صاف ستھرے لباس میں کورٹ کے اندر داخل ہوئے۔ وہ پُر اعتماد اور مطمئن تھے۔ کورٹ کی سماعت کا آغاز ہوا۔ مہر النساء، زیب اور وارث کے بیانات لئے گئے اور یہ کارروائی ابھی جاری ہی تھی کہ چوہدری کا بڑا بیٹا زاہد اندر داخل ہوا اور اس نے اپنے والد کے تمام کالے کرتوتوں اور بھائی کے کارناموں کے متعلق عدالت کو بتایا۔ وہ اپنے ساتھ ظفر نامی اسی شخص کو بھی پکڑ لایا تھا جس نے مری میں زین کو منشیات کا عادی بنایا تھا اور چوہدری سے لاکھوں روپے کا انعام پایا تھا۔ زاہد کی گواہی اس کیس کی مضبوط اور اہم کڑی ثابت ہوئی اور پھر اس کے بعد فیصلہ سردار صاحب کے حق میں ہوا۔ ان کو باعزت رہا کیا گیا اور اپنی منسٹری کے عہدے پہ دوبارہ فائز کیا گیا۔ چوہدری کی گرفتاری کا حکم جاری ہوا اور اس کے کیس کی مزید کارروائی کے لئے نئے سرے سے اندراج کا حکم ملا۔

سردار صاحب بے حد خوش اور مسرور تھے کہ انہیں ان ناکردہ گناہوں کے الزام سے چھٹکارا مل گیا اور وہ عوام سمیت اپنے خاندان کے لوگوں کے سامنے سرخرو ہوئے۔ میڈیا اور پریس کے لوگ ان کی رہائی پر ان کو مبارکباد پیش کر رہے تھے اور وہ خوشی خوشی میڈیا کے سوالوں کا جواب دے رہے تھے۔

وہ مہر النساء اور زیب کے ہمراہ کورٹ سے باہر آ رہے تھے۔ سیڑھیوں کے اختتام پر شہرین اور اس کی والدہ ہمایوں کے ہمراہ ہاتھوں میں پھولوں کا گلدستہ تھامے کھڑی تھیں۔ شہرین وہ گلدستہ لے کے سردار صاحب کے پاس آئی۔

''ہمیں یقین تھا کہ نیکی ہمیشہ بدی پہ غالب آتی ہے۔ ہمیں یقین تھا کہ آپ ضرور جیت جائیں گے اپنے دشمنوں سے۔'' وہ سردار صاحب کو پھول دیتے ہوئے بولی۔

''ہاں۔ لیکن ہماری اس جیت میں سب سے بڑا ہاتھ ہماری بیٹی اور ہماری شریکِ حیات کا ہے۔ اور ان کے علاوہ آپ کا بھی شہرین! آج اگر زیب ہمیں واپس ملی ہیں تو وہ صرف آپ ہی کی کوشش کی وجہ سے ہے۔'' سردار صاحب نے شہرین سے کہا۔

''میں تو صرف وسیلہ بنی ہوں انکل! آپ تک پہنچنے کا ہر راستہ زیب آنٹی نے خود ہی چنا۔ میں نے اس میں کچھ نہیں کیا۔'' شہرین نے مسکرا کے کہا۔

سردار صاحب کو کچھ فاصلے پر چوہدری زاہد نظر آیا۔ وہ شہرین اور باقی لوگوں کو چھوڑ کر زیب کے ہمراہ زاہد کے پاس آئے۔

''بہت شکریہ بیٹا! اگر آج تم نہ ہوتے تو بہت مشکل ہوتا ہمارے لئے اپنی سچائی منوانا۔''

''میرے والد نے آج تک جو کیا، مجھے اس سے ہمیشہ اختلاف رہا۔ میں نے اپنی طرف سے نیکی کرنے کی کوشش کی ہے، اللہ اس کو قبول فرمائے۔ اور پھر مکافاتِ عمل بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے نا۔'' زاہد نے نرمی سے کہا۔

''کاش تمہارا والد بھی تمہاری طرح سوچتا۔'' زیب نے کہا۔

''اللہ ان کو ہدایت عطا فرمائے۔ چلتا ہوں۔'' زاہد یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

❖❖ ❖❖

شمائل کے ہاتھ میں عتیقہ کا تحریر کردہ خط تھا اور اس کی تحریر نے شمائل کی آنکھیں نم

کر دی تھیں۔ خط کی تحریر لرزنے لگی تھی۔

''پیارے شمائل!

ہمارے فائنل ایگزامز ہو گئے۔ ہم نے اکٹھے چار سال کا عرصہ گزار دیا۔ آج میں یہ شہر چھوڑ کے جا رہی ہوں، اپنے پاپا کے پاس اسلام آباد۔ جہاں وہ میری سوتیلی ماں اور اپنے بچوں کے ہمراہ رہتے ہیں۔

جانے سے قبل میں کچھ باتیں تمہیں بتانا چاہتی تھی۔ تمہارے سامنے آنے کی ہمت مجھ میں نہیں تھی، اس لئے یہ خط لکھ رہی ہوں۔ میں نے کبھی کسی کو خط نہیں لکھا۔ یہ میری زندگی کا پہلا اور شاید آخری خط ہے۔

میں نے تم سے محبت کی ہے شمائل! محبت جو دل کے صحرا میں خوابوں کی بارش کرتی ہے۔ خوابوں کے شجر پہ اُمیدوں کے پھول کھلاتی ہے۔ محبت جو زندہ بھی رکھتی ہے، فنا کے بعد دوبارہ زندگی بھی عطا کرتی ہے۔ میری محبت ادھوری رہ گئی۔ میرے خواب بکھر گئے اور ان خوابوں کی روحیں میرے احساس کے ویران کھنڈر میں تا عمر بھٹکتی رہیں گی۔ جب وہ خواب ٹوٹے تھے تو ان کی کرچیاں میری آنکھوں کی پتلیوں میں بے حد زور سے چبھی تھیں۔ جن سے میری روح تک چھلنی ہو گئی۔

دو تین سال کا یہ سفر بڑا اذیت ناک گزرا۔ میں نے تمہاری توجہ اور تمہاری محبت پانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ماہا میں تمہاری دلچسپی کا مجھے علم تھا اس لئے میں نے اپنے آپ کو ماہا کے روپ میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ اپنے بال کٹوا لئے، ساڑھیاں باندھنی شروع کیں، بول چال میں ماہا کو لے آنے کی کوشش کی۔ ہر ممکن کوشش کی لیکن تمہیں پا نہ سکی۔ میں تمہاری بہن کی شادی کا کارڈ پا کے بہت خوش تھی لیکن جب مجھے پتہ چلا کہ تم ماہا کے ساتھ چار روز پہلے ہی جا چکے ہو تو میں نے آنے کا ارادہ بدل لیا اور یہاں اتنی دور لمحہ لمحہ احساس کے اذیت ناک سفر سے گزرتی رہی، سوچتی رہی کہ مہندی کا فنکشن ہو گا۔ ماہا کسی گہرے رنگ کی ساڑھی باندھے ڈھولکی بجانے والی لڑکیوں کے پاس بیٹھی ہوں گی اور تم ان کے لئے پھولوں کے زیور لائے ہو گے اور اپنے ہاتھوں

سے گھر کے کسی گمنام کونے میں انہیں وہ زیور پہنائے ہوں گے۔ بارات کی چہل پہل میں ان کی ڈھیر ساری تصویریں اتاری ہوں گی۔ رات کے وقت چائے کا مگ اٹھائے تم دونوں سرد راہداری میں دیر تک باتیں کرتے ہو گے۔

کئی دن میں اس خود اذیتی کا مزہ چکھتی رہی۔ کبھی خیال آتا کہ میں خودکشی کر لوں۔ کبھی خیال آتا کہ ماما کو مار دوں۔ لیکن کچھ بھی ممکن نہ تھا۔ میں ان راتوں کو کبھی بھلا نہیں سکتی جو میں نے ہاسٹل کے کمرے میں کھڑکی میں بیٹھے تمہیں سوچتے ہوئے گزار دیں۔ میں ان صبحوں کو کبھی بھلا نہیں سکتی جو میں نے یونیورسٹی کے احاطے میں فقط تمہارا چہرہ دیکھنے کے انتظار میں کاٹیں۔ میں ان کاغذوں کو بھلا نہیں سکتی جن پہ نوٹس لکھنے کی بجائے میں نے تمہارا اور فقط تمہارا نام لکھا۔ میں دعا میں اٹھے ان ہاتھوں کو نہیں بھلا سکتی جن میں فقط تمہاری خواہش تھی۔

میں اب جان چکی ہوں کہ تمہاری محبت میرے لئے نہیں ہے۔ اب میں نے یہ یکطرفہ سفر چھوڑ دیا۔ تمہیں زندگی مبارک ہو۔ خدا تمہیں ہر قدم پر سرخرو رکھے۔ اپنا ہر آن خیال رکھنا۔ ہمیشہ کے لئے الوداع۔

فقط، عقیقہ عثمان۔''



خط کی لرزتی تحریر پڑھتے ہی شمائل کے ہاتھوں میں کپکپی سی آ گئی تھی۔ آنکھوں سے آنسو ایک روانی کے ساتھ بہنے لگے تھے۔ اور اس کے دل میں ایک سوئی کی نوک بہت شدت سے چبھی تھی۔

'مجھے عقیقہ سے محبت ہے۔'

دل کے اندر سے اِک آواز آئی۔ شمائل نے اس آواز کو بہت واضح طور پر سنا۔

'ہاں...... مجھے تم سے محبت ہے عقیقہ! تمہاری محبت سے کم۔ لیکن پھر بھی بہت زیادہ۔ میں تمہیں جانے نہیں دوں گا۔ روک لوں گا تمہیں...... ہاں، میں تمہیں جانے نہیں دوں گا۔ اگر تم چلی گئیں تو میرا کون ہو گا؟...... مجھے تمہاری طرح کون چاہے گا؟'

شمائل نے خط کو اپنی جیب میں ڈالا اور فوراً اپنی جگہ سے اٹھا اور بہت تیزی سے

تیار ہونے لگا۔ اپنا موبائل فون اٹھایا اور باہر آ گیا۔ آسمان گہرے رنگ کے بادلوں سے ڈھکا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے آج زوردار بارش ہونے والی ہو۔ باہر سڑک پہ آتے ہی شمائل نے رکشہ پکڑا اور بیٹھتے ہی عقیقہ کا نمبر ملایا۔

پلیٹ فارم پہ بیٹھی عقیقہ کی آنکھوں میں بے شمار آنسو تھے۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ اپنا سارا کچھ یہیں چھوڑ کے جا رہی ہے۔ تہی داماں جا رہی ہے۔ اس کے موبائل پہ مسلسل بیل ہو رہی تھی مگر وہ کسی سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اُس نے فون اُٹھا کے دیکھا، اسکرین پہ شمائل کا نام جگمگا رہا تھا...... دل سے مجبور ہو کے اس نے اپنے آنسو پونچھے اور فون اٹھا لیا۔

''کہاں ہو تم؟'' شمائل نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''ریلوے اسٹیشن۔ جا رہی ہوں میں پنڈی۔'' بولتے بولتے پھر اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے تھے۔

''مت جاؤ عقیقہ!...... مت جاؤ۔'' وہ فقط یہی بول پایا۔ عقیقہ نے فون بند کر دیا اور اس کے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ آسمان سے بھی اس کی آنکھوں ہی کی طرح بے شمار آنسو بہنے لگے تھے۔ دور کہیں بلندیوں پہ بادل زور سے آپس میں ٹکرا کے شور مچا رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ڈھیر سارے کانچ ٹوٹ کے چکنا چور ہو رہے ہوں۔

کچھ ہی دیر میں پلیٹ فارم پہ ساکت کھڑی ریل گاڑی کی سیٹی بجی اور مسافر تیز رفتاری سے اس میں سوار ہونے لگے۔ عقیقہ نے نم آنکھوں سے عقبی راستے کی طرف دیکھا اور اپنا مختصر سا زادِ راہ تھام کے ریل گاڑی کی طرف بڑھنے لگی۔ بارش رفتہ رفتہ تیز ہونے لگی تھی اور بادلوں کا شور بھی بڑھنے لگا۔

دوسری طرف شمائل مسلسل رکشے والے کو تیز جانے کو کہہ رہا تھا۔ ٹریفک بہت زیادہ تھا اور بارش کی بڑھتی رفتار کے باعث جگہ جگہ ٹریفک بلاک ہونا شروع ہو گئی تھی۔ ایک جگہ ان کا رکشہ بھی مکمل طور پر ٹریفک جام میں پھنس گیا۔ کچھ دیر تو شمائل نے انتظار کیا لیکن آگے زیرِ تعمیر پُل تھا اور گاڑیوں کا بے حد رش تھا۔ اس برستی بارش میں بہت دیر لگتی وہاں سے نکلنے میں، لہٰذا شمائل نے رکشہ والے کو پیسے دیئے اور خود اُتر گیا۔ برستی بارش میں بھیگتا وہ گاڑیوں کی بھیڑ کو پھلانگتا آگے بڑھتا رہا۔ بارش کی رفتار ہر لمحے

بڑھ رہی تھی مگر وہ بہت تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ ٹرین کے چلنے سے قبل ہی وہ اسٹیشن پہنچنا چاہتا تھا۔ وہ سڑک پہ کسی پاگل دیوانے کی طرح دوڑ رہا تھا۔ اسے کسی کی پرواہ نہ تھی، کون اس دیکھ رہا ہے، کون کیا کہہ رہا ہے۔ اسے پتہ تھا تو صرف اتنا کہ اسے پہنچنا ہے۔ عتیقہ کو روکنے کے لئے، اس کی سچی محبت کو حاصل کرنے کے لئے، اسے اپنا بنانے کے لئے۔

گاڑیوں، بسوں، رکشوں میں بیٹھے لوگ اسے عجیب حیران کن آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ یہ کون دیوانہ ہے؟ اسے کہاں جانا ہے، جسے برستی بارش کی بھی پرواہ نہیں؟ اُسے کس بادل کا تعاقب کرنا ہے؟

وہ اسٹیشن کے اندر پہنچا تو ٹرین نے ہلکی رفتار پکڑی ہوئی تھی اور پٹڑی پہ چلنا شروع کر دیا تھا۔ وہ دوڑتے دوڑتے ہر کھڑکی، ہر دروازے اور ہر چہرے میں عتیقہ کو ڈھونڈنے لگا۔ انجان چہرے، نا آشنا لوگ عجیب آنکھوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ اسے کسی سے کوئی غرض نہ تھی۔ اسے فقط ایک چہرے کی تلاش تھی۔ وہ چہرہ جس پہ اس کے لئے ہمیشہ پیار، پیار اور فقط پیار رہتا تھا۔ وہ چہرہ جو اپنی محبت کے دم پر جیت گیا تھا اور اس کے دل کے صحرا کی مٹی کو سیراب کیا تھا۔ وہ اس چہرے سے کبھی بھی بچھڑنا نہیں چاہتا تھا۔

ٹرین کی رفتار تیز ہو رہی تھی۔ وہ مسلسل دوڑتی ٹرین کے ساتھ دوڑ رہا تھا۔ بادلوں میں ابھی بھی ٹکراؤ جاری تھا۔ بارش بھی اسی تواتر سے برس رہی تھی۔ شمائل نے دوڑتی ٹرین میں اپنی محبت ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی مگر وہ نہیں ملی۔ ٹرین آگے بڑھ گئی اور وہ پلیٹ فارم پہ تھک کے نیچے بیٹھ گیا۔

وہ بہت لازوال محبت گنوا چکا تھا.......اس کی آنکھوں سے اب آنسو بہنے لگے۔

کسی ہارے ہوئے کھلاڑی کی طرح وہ اپنا وجود ہار بیٹھا تھا۔ خود کو گھسیٹتا گھسیٹتا ساتھ لگے لکڑی کے بنچ تک آیا اور بیٹھ گیا۔ آنکھیں موند کے وہ اپنے اوپر ضبط کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

''میں نہیں جا سکی شمائل!....... میں تمہیں چھوڑ کے نہیں جا سکی۔''

اسے، اپنے پاس ہی کہیں سے آواز آئی۔ اس نے آنکھیں کھول کے دیکھا۔ اس کی

طرح بھیگی ہوئی عتیقہ سرخ آنکھیں لئے اسے کہہ رہی تھی۔ مسرت اور حیرت کی انتہا پہ تھا وہ۔

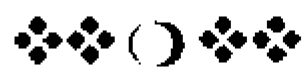
''عتیقہ!'' وہ حیرت سے بولا۔

''ہاں شمائل!....... میں تمہیں چھوڑ کے نہیں جا سکی۔'' اس کی آنکھ سے آنسو ٹپکا اور اس کے بھیگے گال پہ ٹھہر گیا۔ شمائل نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور وہ اس کے کندھے سے لگ گئی۔

''میں تمہیں کبھی جانے نہیں دوں گا....... بہت محبت کرتا ہوں میں تم سے....... مجھے کبھی چھوڑ کے مت جانا۔'' شمائل نے بہت پیار سے کہا۔

عتیقہ نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

برستی بارش ان کی نویلی محبت کی اِک نئی داستان رقم کرنے لگی۔ وہ دونوں پلیٹ فارم پہ لگی اس بنچ میں محبت کے کتنے نئے افسانے رقم کرتے رہے۔ ہاتھوں میں ہاتھ تھا۔ من پسند ساتھی اور محبت منزل تھی۔



''زین کی طبیعت اب کیسی ہے زیب بی بی؟'' ہاسپٹل کے کاریڈور میں کھڑی زیب سے وارث نے پوچھا تھا۔

''بہت بہتر ہے اس کی طبیعت۔ ہوش میں آ گیا ہے۔ بہت شرمندہ بھی ہے۔ ڈاکٹر نے تو پوری امید دلائی ہے کہ اب وہ ہمیشہ کے لئے ٹھیک ہو جائے گا اور کبھی نشہ آور چیز کو ہاتھ نہیں لگائے گا۔'' زیب نے مسرت سے سرشار لہجے میں کہا۔

''اللہ نے احسان کیا ہے زیب بی بی! آپ یہاں رکیں گی یا گھر چلیں گی؟''

''میں سردار صاحب کا انتظار کروں گی۔ وہ فیکٹری سے سیدھا یہیں آئیں گے۔ کل صبح ڈسچارج کر دیں گے ہسپتال والے۔ تم مہرو کے پاس گھر جاؤ، وہ اکیلی ہو گی۔'' زیب نے اطمینان سے کہا اور وارث ان سے رخصت ہو کے قصر زیب کی طرف جانے لگے۔

زین کو وارث ہی نے ڈھونڈا تھا۔ ایک گمنام قسم کے مزار پہ دیگر لوگوں کے ہمراہ انہیں زین بھی نظر آیا تھا اور وہ اسے اپنے ساتھ گھر لے آئے تھے۔ چند دن کے علاج

نے ہی زین میں نئی زندگی پیدا کر دی تھی۔ سبھی لوگ اکٹھے ہو گئے تھے۔ خوشیوں کی پیامبر تتلی ان کے گھر لوٹ آئی تھی۔

زین کے بیڈ کے پاس رکھے صوفہ پہ زیب بیٹھی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں چھوٹا سا قرآن پاک تھا اور وہ تلاوت میں مصروف تھیں، سردار صاحب بہت چپکے سے آ کے ان کے پاس بیٹھ گئے تھے۔ وہ متوجہ ہوئیں۔ سردار صاحب کے چہرے پہ ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ زیب نے اپنی تلاوت مکمل کی اور قرآن پاک بند کر کے سائیڈ ٹیبل پہ رکھ دیا۔

''کتنا بڑا احسان ہے اس مالک کا کہ مجھے میرے دونوں بچے واپس دے دیئے، اس نے میرا گھر مجھے لوٹا دیا۔'' زیب نے کہا۔

''ہاں زیب! ہم اس کے جتنے شکر گزار ہوں، کم ہے۔ اتنی بڑی مصیبتیں ہمارے سروں سے ٹل گئیں اور ہمیں تمہارا ساتھ بھی دوبارہ مل گیا، جس کا ہم نے شاید سوچا بھی نہ تھا۔'' سردار صاحب اطمینان سے گویا ہوئے۔

''آپ میری زندگی ہیں زیب! آپ کے بغیر میں اور میرے بچے نامکمل ہیں۔'' سردار صاحب بولے۔

''اور آپ بھی تو میری تکمیل ہیں۔ خدا ہمارے گھر کو تا ابد آباد رکھے اور ہمارا یہ گھر خوشیوں سے، مسرتوں سے مہکتا رہے۔'' زیب نے دعا کے لئے ہاتھ بلند کیا اور ان کے ہاتھوں کے ساتھ سردار صاحب کا ہاتھ بھی دعا کے لئے اٹھا۔

بیڈ پہ لیٹے زین کی آنکھیں کھلیں اور اس نے پہلی مرتبہ اپنے والد اور والدہ کو ایک ساتھ دیکھا تھا۔ اطمینان اور مسرت کے احساس سے سرشار اس نے آنکھیں دوبارہ موند لیں۔



آج ماہا اپنے دونوں بچوں کے ہمراہ دبئی کے لئے روانہ ہو رہی تھی۔ اس کو کسی غیر ملکی کمپنی میں بہت اچھی جاب مل گئی تھی۔ عتیقہ اور شائل اسے رخصت کرنے کے لئے اکٹھے آئے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ پہ نازاں اور بہت خوش تھے۔ آج شائل پہلی مرتبہ ماہا کو دیکھ کے اس سے شرمندہ نہ تھا اور اس کے دل میں کوئی احساس

نہ جاگا تھا۔ ماہا انہیں دیکھ کے مسکرائی۔

''تم دونوں کو اکٹھے دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔'' ماہا نے کہا اور وہ دونوں مسکرائے۔

''آپ کا بہت شکریہ میم!..... آپ نہ ہوتیں تو آج ہم اکٹھے بھی نہ ہوتے۔'' عتیقہ نے کہا۔

''شادی پہ بلاؤ گے نہیں؟'' ماہا شرارت سے مسکرائی۔

''ضرور میم!'' شائل مسکرا دیا۔

''یاد رکھنا شائل! سچی محبت بہت قیمتی ہوتی ہے۔ زندگی میں یہ ضروری نہیں ہوتا کہ ہمیں کس سے محبت ہے بلکہ یہ ضروری ہوتا ہے کہ کسے ہم سے محبت ہے۔ کون ہمارے لئے کیا کر سکتا ہے۔ اکثر خود غرضی میں لوگ سچی محبتیں گنوا دیتے ہیں۔'' ماہا نے پیار سے کہا۔

''اپنا اور بچوں کا خیال رکھئے گا میم! اور ہم دونوں کے لئے دعا کیجئے گا۔ میں اسے ماں سے ملوانے جلد ہی لے جاؤں گا۔'' شائل نے ماہا کا ہاتھ تھاما ہوا تھا۔ اس کے لہجے میں محبت کی ماورائی اور اعتماد تھا۔ بامراد محبت کے حصول کی روشنی آنکھوں میں واضح طور پر چمکتی دکھائی دیتی تھی۔

''اس پاگل لڑکے کا خیال رکھنا عتیقہ! خدا تم دونوں کے ساتھ کو ہمیشہ سلامت رکھے۔ مجھ سے رابطہ کبھی ختم مت کرنا۔'' مسکراتی ہوئی ماہا کے لبوں پہ دعا تھی۔

اور پھر فلائٹ کی اناؤنسمنٹ ہوئی۔ ماہا اپنے دونوں بچوں کے ہمراہ ایئرپورٹ کے داخلی دروازے کی طرف بڑھ گئی اور پھر شیشے کے پارٹیشن کے پار اس نے شائل اور عتیقہ پہ آخری نظر ڈالی تھی...... ان دونوں کا ہاتھ ایک دوسرے کے ہاتھ میں تھا اور دونوں کے چہروں پہ نئے آنے والے دنوں کی چھلکتی اُمیدیں اور خواب تھے۔

خواب جو مستقبل کا دروازہ ہوتے ہیں...... اور جو خوابوں کے حُسن پہ ایمان رکھتے ہیں وہی منزلوں کی خوشی پاتے ہیں...... دونوں ایک دوسرے کے ساتھ پہ نازاں تھے۔ دونوں کی مسکراہٹ میں محبت کی چمک تھی۔ ماہا کے ذہن سے آج بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا تھا اور وہ بہت اطمینان سے اپنے بچوں کے ہمراہ نئی منزل کی طرف.

گامزن ہوگئی۔

❖❖ () ❖❖

''پرسوں شہرین باجی اور ہمایوں کی مہندی ہے۔ کراچی جانا ہے۔'' مہر النساء نے یاد دلایا۔

''المنظر کا یہ کنارہ کتنا خوبصورت ہے نا۔ یہیں پہ میں نے اپنی محبت کا اعتراف کیا تھا۔'' وارث نے مہرو کی بات کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

''ماں نے کہا ہے کہ شہرین کی شادی کے تمام فنکشنز اٹینڈ کرنے ہیں۔ وہ بھی ہماری شادی کے ہر فنکشن پہ آئی تھی۔'' مہرو نے یاد دلایا۔

''دل کرتا ہے المنظر کے اس پُل پہ تمہارا ہاتھ تھامے تا عمر چلتا رہوں اور راستہ کبھی ختم ہی نہ ہو۔'' وارث نے پھر اپنی دھن میں کہا۔

''وارث! آپ میری بات سن ہی نہیں رہے۔'' وہ بسوری۔

''یار! جب ہم المنظر پہ آئیں تو پلیز! ہماری محبت کو ڈسٹرب مت کیا کرو۔ یہاں پہ فقط میں ہوتا ہوں، میری پری ہوتی ہے اور ہماری لازوال محبت۔'' وارث نے اس کا ہاتھ اور مضبوطی سے تھام لیا اور پھر گنگنانے لگے۔

''کبھی کبھی میرے دل میں......''

پانی کی چھوٹی چھوٹی لہروں کے اوپر بارش کی ہلکی ہلکی بوندیں پڑنا شروع ہوگئیں۔

''بارش آنے والی ہے۔'' مہرو نے ان کے کندھے سے لگے ہوئے کہا۔

''یہ ساون رُت کی پیامبر پہلی بارش ہے۔ ہماری محبت کے اوپر سے نیلا موسم چھٹ چکا ہے۔ اب ہمیں کوئی جدا نہیں کرسکتا۔'' وارث نے پیار سے کہا۔

''کاش دنیا میں بسنے والی ہر محبت کے اوپر سے نیلا موسم چھٹ جائے اور محبت کا ہر سفر کامیاب ٹھہرے۔'' دونوں کے دل سے دعا نکلی اور دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے المنظر کے پُل پہ چلتے رہے۔ آسمان، بادل اور المنظر ان کی محبت کی نئی داستان لکھتے رہے......!

نیلے موسم ٹھہر جاؤ کہ یہ محبت کا شہر ہے
یہاں پہ بسنے والے سارے لوگ وفا کے علمبردار

چاہت کے پیامبر ہیں
یہ بستی ہے وفاؤں کی، یہ دیوانوں کی نگری ہے
کفن باندھے ہیں یہ سر پر، جوانی داؤ پہ ان کی
محبت ان کا مذہب ہے، دنیا ہے وفا ان کی
انہیں تم آزمانا مت
انہیں آنسو تھمانا مت
ان کی آنکھ سے بہنے والا ہر ایک آنسو
آسمان کے سارے کونے ہلاتا ہے
آسماں ان کے سنگ آنسو بہاتا ہے
نیلے موسم ٹھہر جاؤ کہ یہ محبت کا شہر ہے!

(تمت بالخیر)

آسیہ مرزا کے سدابہار خوبصورت ناول

- دل دریا سمندروں ڈونگھے 00
- کجھ مینوں مرن دا شوق وی سی 00
- دل اک شہرِ جنوں 00
- ہری ہے شاخِ تمنا ابھی 00

عشنا کوثر سردار کے دلچسپ ناول

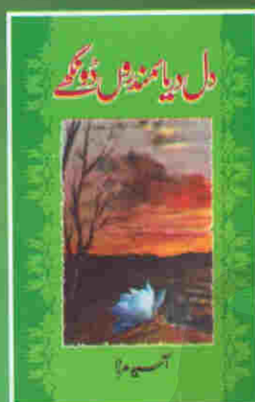
- اے شمع کوئے جاناں (دو جلدیں) 00
- افسونِ جاں (دو جلدیں) 00

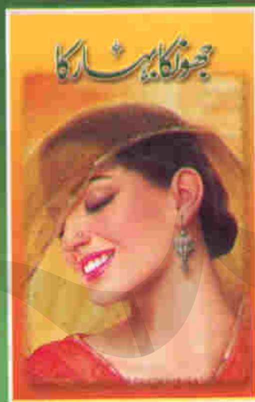
عفت سحر طاہر کے خوبصورت ناول

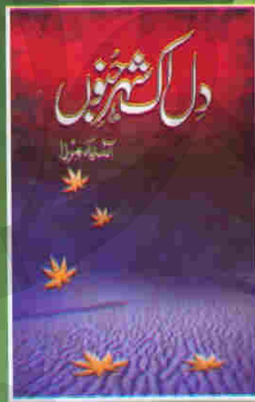
- سبز رُتوں کی جھلمل میں 00
- محبت دل پہ دستک (دو جلدیں) 00

اقراء صغیر احمد کے دلکش ناول

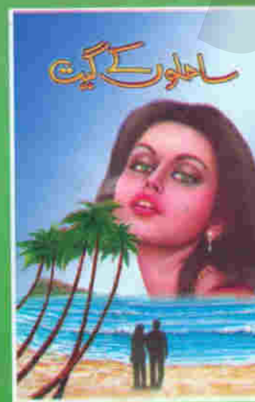
- تیری اُلفت میں صنم 00
- چاند گگن اور چاندنی 00
- بہاروں کے سنگ سنگ 00
- تم میری زیست کا حاصل ہو 00

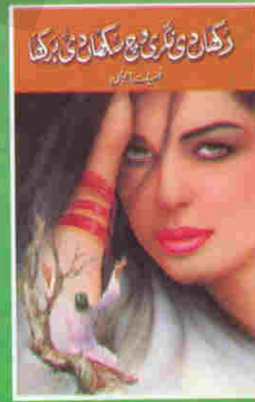


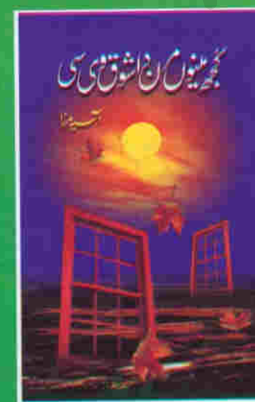


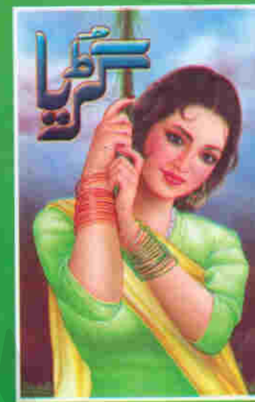


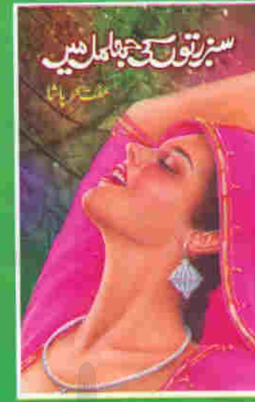












e.mail:info@alquraish.com / www.alquraish.com